سائنس اور اسلام
افاداتِ مبارکہ
شیخ الاسلام حضرت علامہ شمس الحق افغانی رحمۃ اللہ علیہ
سابق شیخ التفسیر دار العلوم دیوبند و سابق رکن اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان
مرتبہ
مولانا احمد عبد الرحمن الصدیقی ایم اے فاضل دار الحقانیہ
مدیر نظارۃ المعارف مسجد سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نوشہرہ صدر ضلع پشاور
www.besturdubooks.wordpress.com
شائع کردہ
مکتبۃ الحسن
۲۹/۹ لال چوک، عبد الکریم روڈ، لاہور
مکتبہ حکمت اسلامیہ
۱۱۶۹/م نزد عیدگاہ، نوشہرہ صدر ضلع پشاور

التماس ناشر

یہ کتاب سائنس اور اسلام کے موضوع پر حضرت علامہ شمس الحق افغانیؒ کے منتشر مضامین کا مجموعہ ہے جس کو ایک مخلص صاحب نسبت مولانا احمد عبدالرحمن صدیقی صاحب نے بڑی محنت کے ساتھ ایک مربوط تصنیف کی شکل میں جمع و مرتب کیا ہے، اور نفس مضامین کی نوعیت اور اہمیت کے لحاظ سے اسے آٹھ ابواب میں ترتیب دیا ہے ان مقالات کے مطالعہ سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ معلومات سائنس جدید دراصل اسلامی عرب سائنس دانوں ہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے گویا کہ حضرت مولفؒ کے مطالعہ وسیع اور فکر عمیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ عرب سائنس دان استاد ہیں اور جدید مدعیان علوم سائنس شاگرد ہیں۔

چنانچہ یہ کتاب زمانہ جدید کے ہر سائنس دان کو بغور پڑھنی چاہئے اور بالخصوص اس ذخیرہ علم کو اَلْحِکْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ گردانتے ہوئے مسلمان سائنس دانوں کو اپنے گم داتا کو اپنانے کے لئے جدید تحقیقات سائنس کی طرف بلاتاخیر توجہ دینی چاہئے۔

زیر ہدایت
مولانا **فضل الرحیم** صاحب مدظلہ
نائب مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور

طالب دعا: محمد رفیع
پرنسپل معہد ام القریٰ
جامعہ اشرفیہ فیروز پور روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نام کتاب ______ سائنس اور اسلام

مؤلف ______ شیخ الاسلام حضرت علامہ شمس الحق افغانیؒ

مرتب ______ مولانا احمد عبدالرحمن الصدیقی ایم اے فاضل وفاق حقانیہ

منتظم اعلیٰ ______ ڈاکٹر عبدالرشید مخدومی

باہتمام ______ حاجی حبیب الرحمن پشاوری

ناشر ______ مکتبۃ الحسن ۹/۲۹ لال چوک عبدالکریم روڈ قلعہ گوجر سنگھ لاہور

مطبع ______ صوف اکرام پرنٹرز ریٹی گن روڈ لاہور

ضخامت ______ ۲۶ × ۲۰ / ۸ صفحات ۳۹۰

تعداد ______ ایک ہزار

تاریخ ______ یکم ستمبر ۱۹۹۵ء

قیمت ______ ۵۰/- روپے

فہرست مندرجات	صفحہ نمبر

فہرست مضامین	صفحہ

فہرست مضامین	صفحہ

فہرست مندرجات

فہرست مندرجات

انتساب

بزرگوں اور مصنفین کے طریقے کے مطابق بندہ اپنی اس پہلی کدو کاوش کو

اوّلاً — تو اپنے مرشد و مربی اور عظیم محسن امام الاولیاء قطب العالم شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے نام نامی سے منسوب کرنے کی سعادت پا رہا ہے جن کی مبارک صحبت میں حضرت نبی رحمت جانِ دو عالم حضرت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اور قرآن کریم سے عشق و محبت کی چنگاری سُلگی نیز دین اسلام کے اصلی و حقیقی رُخ کو سمجھنے اور اس کی اشاعت کے ابتدائی شعور نے جنم لیا پھر ان کی دُعاؤں کی برکت سے ہمیشہ اَلحمدُ للہ نے نظرِ کرم سے نوازا۔

و ثانیاً — اپنے والد گرامی قدر صاحب اخلاقِ حسنہ حضرت الحاج الشیخ عبدالحکیم بن الشیخ عبدالمجید رحمۃ اللہ علیہ کے اسم گرامی سے جنہوں نے ایک تاجر ہونے کے باوصف بندہ کو صرف دینِ حق کی خدمت کے لیے وقف فرمایا بلکہ حضرت الشیخ العارف المفسر لاہوری قدس سرہ العزیز جیسی عظیم شخصیت تک پہنچنے میں رہبری فرمائی اور اپنی بہترین تربیت کے ساتھ ساتھ نوعمری میں ہی اپنی معیت میں حرمین شریفین و مقاماتِ مقدسہ کے زیارات کے شرف سے نوازا۔ (فللہِ الحمدُ اَوّلاً وّ آخراً)

جزاھما اللہ تعالیٰ احسن الجزاء و اللّٰھم ارحمھما کما ربّیٰنی صغیرا

وصلّی اللہ تعالیٰ علیٰ رحمۃ للعلمین محمد رسول اللہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وبارک وسلم اجمعین

الاحقر: احمد عبدالرحمٰن الصدیقی عفی عنہ ایم۔اے

مکان ۱۱۷۹/۴ نزد عیدگاہ نوشہرہ صدر ضلع پشاور

کلماتِ تحسین و دعا

عارف کامل حضرت مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحی صاحب دامت برکاتہم کراچی
خلیفہ اجل حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ العزیز

بسم اللہ۔ کتاب "سائنس و اسلام" میرے زیرِ نظر ہے مشاغل و کم فرصتی کے عذر سے بالاستیعاب تو دیکھنے کا نہ موقع ہے نہ اہلیت البتہ سرسری نظر عنوانات پر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقاضائے وقت کے لحاظ سے یہ کتاب ضرور نافع اور مفید ہے۔ آج کل تو تعلیم یافتہ طبقہ اسلام کے متعلق اس دورِ حاضر کے سائنس کی کرشمہ سازیوں سے بہت اوہام و شکوک میں مبتلا ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ اگر کوئی طالبِ صادق نظرِ ذوق و طلب سے مطالعہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ سے قوی امید ہے کہ اس کا ذہنی مطلع ضرور صاف روشن ہو جائے گا۔ جس میں اس کو اسلام کے محاسن کی صحیح تصویر نظر آئے گی۔

کتاب کے مؤلف علامہ حضرت افغانی مدظلہم نے جس قدر کاوش و فکر سے کام لیا ہے اس کا اجر اور نفعِ عام تو اللہ تعالیٰ ہی عطا فرمائیں گے۔ البتہ یہ بات بھی واضح ہے کہ جب تک کسی حسین چیز میں تناسب نہ ہو وہ چیز صحیح معنی میں حسین نہیں ہوتی۔ اس لیے میں یہ بھی محسوس کر رہا ہوں کہ مرتب عزیز مولانا احمد عبدالرحمٰن صدیقی سلمہٗ نے جس ذوق و کیفِ باطنی کے ساتھ اس کتاب کی ترتیب دی ہے وہ بذاتِ خود جاذبِ دل و نظر ہے۔

اللہ تعالیٰ مؤلف مدظلہم العالی و مرتب سلمہ اللہ تعالیٰ کو اس کارنامہ دین کی جزائے موفور عطا فرمادیں اور مطالعہ کرنے والوں کو سعادتِ حسنِ قبول نصیب فرمادیں آمین۔

عاجز و ناکارہ

محمد عبدالحی عفی عنہ

۱۲ صفر ۱۴۰۲ھ، ۲۰ دسمبر ۱۹۸۱ء کراچی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سائنس اور اسلام

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم۔ اما بعد! سائنس درحقیقت اسلامی فلاسفہ کی جد وجہد و کوشش کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ سائنس کے مختلف شعبوں تک اگر مساعی بارآور نہ ہوتیں تو مغربی سائنس کا وجود نہ ہوتا۔ سائنس پر احقر نے جو کچھ لکھا ہے اور متفرق رسائل میں طبع ہو چکا ہے یہ حقیقت ان سے واضح ہو جاتی ہے، سائنس کے اصول و فروع جو کچھ ہے وہ اسلامی اور عرب سائنس دانوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے جمادات، نباتات، معدنیات، فلکیات کائنات الجو اور ان سب کے خواص اور ایجادات، سائنس دانان عرب کی کوششوں کا نتیجہ ہے، عرب سائنس دان استاد ہیں اور مغرب کے سائنس دان شاگرد ہیں۔ اگر عرب سائنس دان نہ ہوتے تو سائنس کی نئی دنیا وجود میں نہ آتی۔ تفصیل کے لیے احقر کے موجودہ مطبوعہ مضامین کا مجموعہ ملاحظہ ہوں جو مشتے از خروارے ہیں اور خود فلاسفہ و سائنس دانان یورپ سے منقول ہیں۔

میرے ان مطبوعہ منتشر مضامین کو عزیز القدر مولانا احمد عبد الرحمن صدیقی سلمہٗ فاضل حقانیہ دام اے نے بہترین ترتیب و محنت کے ساتھ کتابی صورت میں مرتب کیا اور عزیز فرزندم محمد داؤد جان سلمہٗ نے اس کی تکمیل میں کافی دلچسپی لی۔ میں دعا کرتا ہوں کہ یہ کتاب عوام و خواص دونوں کے حق میں نافع اور مفید ہو۔ آمین

والسلام فقط

شمس الحق افغانی

ترنگ زئی چارسدہ ضلع پشاور

یوم عاشوراء ۱۴۰۱ھ

ضروری گذارش

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی. اما بعد

زیر نظر کتاب سائنس اور اسلام دور حاضر کے قلوب و اذہان کے لیے روحانی آب حیات اور عرفانی تریاق ہے۔ جیسے حضرت العلامہ سیدی و سید العلماء شمس العرفا حضرت مولانا شمس الحق افغانیؒ جیسی جامع الکمالات ہستی نے اپنی خداداد فہم و بصیرت سے تالیف فرمایا جن کی علم و تحقیق کے سب علماء حق معترف ہیں جو نہ صرف اکابرین سلف رحمہم اللہ تعالیٰ کے نمونہ امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے علوم کے امین اور قرآن و حدیث کے عظیم داعی و منادی ہیں بلکہ روحانیت و معرفت کے مقام کمال پر بھی فائز ہیں۔ شاید بہت کم حضرات کو علم ہوگا کہ حضرت موصوف جہاں سلاسل قادریہ و نقشبندیہ میں حضرت الشیخ علاؤ الدین عراقیؒ شیخ عثمانی کے خلیفہ اجل ہیں وہیں پر اپنے دور میں پاک و ہند کے سب سے بڑے صاحب بصیرت و قائد آزادی اور روحانیت و معرفت کے امام حضرت مولانا خلیفہ غلام محمد دین پوری قدس سرہ العزیز کے خلیفہ راشد بھی ہیں۔ (جن کے بارے میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ نے فرمایا تھا کہ "حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے پایہ کے بزرگ ہیں" اور جن کی تربیت و تعلیم سے امام انقلاب حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ جیسے نابغۂ عصر شخصیت منظر عام پر آئی۔ اور جن کے خلیفہ اعظم قطب العالم شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ جیسی عظیم شخصیت تھی مزید برآں شیخ الاسلام مجاہد کبیر حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ ، خود ان کے صاحبزادہ حضرت مولانا میاں عبدالہادیؒ اور مؤلف کتاب ہذا حضرت افغانی رحمۃ اللہ علیہم انکے خلفائے کرام میں ہیں جیسا کہ خود مؤلف موصوف اپنے ایک مکتوب میں تصریح فرمادی ہے۔ ان کے علاوہ حضرت علامہ موصوف حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ اعظم حضرت مولانا مفتی محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ بانی جامعہ اشرفیہ اور خود اپنے والد باکمال حضرت

مولانا غلام حیدرؒ خلیفہ حضرت سوات باباؒ سے بھی صاحب نسبت و اجازت ہیں۔ ان ظاہری و باطنی علوم و معارف کے ساتھ بحمدہ تعالیٰ حضرت موصوف جدید علم الکلام و فلسفہ کے بھی مانے ہوئے ماہر ہیں۔ اس طرح ان کی شخصیت افکار جدید و قدیم کے سنگم کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ہر تحریر بلا کی قوت و جاذبیت رکھتی ہے جو اپنی قارئین کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتی اور اسلام کی حقانیت و صداقت اور یقین و ایمان کی دولت سے خوشہ چینیوں کو مالا مال کر دیتے ہیں۔ یہی اس کتاب کی اشاعت کا مقصد عزیز بھی ہے کہ جن لوگوں پر اسلام کے اصول اور ضروری عقائد حقہ موجودہ سائنس کی چمک دمک میں ظاہراً کمزور پڑ گئے ہیں، وہ ایک مرتبہ پھر اپنے صاف و شفاف ہیئت میں سامنے لائے جا سکیں۔ اور رب کریم اللہ جل شانہٗ کا آخری و مکمل دین حق ان تمام تفصیلات کے ساتھ جو نبیٔ رحمت امام الخیر و الھدیٰ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے اس دنیا کو عطا کی ہیں وہ بالکل صحیح کیفیات اور تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ دیدہ و دل کو نواز سکیں۔ اور حق اپنی قوت و شوکت سے دُنیا کے سامنے آ جائے۔ آمین۔

موجودہ کتاب منتشر مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ جواہرات وانمول خزانہ مختلف جرائد و رسائل میں مختلف اوقات میں شائع ہوتا رہا۔ جسے سیہ کار نے چُن چُن کر بڑی تگ و دو سے ایک مربوط تصنیف کی شکل میں جمع و مرتب کیا ہے۔ مختلف آیات و عربی عبارات کا ترجمہ کر کے نئے عنوانات قائم کئے اور مضامین کی اہمیت کے لحاظ سے اسے آٹھ ابواب میں ترتیب دیا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اسے قبول فرما کر ہم سب کی نجات و فلاح دارین کا ذریعہ بنا دے۔ آمین۔

اس ترتیب و تدوین کو حضرت علامہؒ نے بہت پسند فرمایا اور مجھے برکۃ العصر حضرت عارف کامل ڈاکٹر محمد عبدالحی مدظلہم العالی خلیفہ اجل حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ نے اپنے "کلمات تحسین و دُعا" سے نواز کر اسکی افادیت و اہمیت پر مہر تصدیق ثبت فرما دی۔ فجزاھم اللہ خیرا۔ یہ کتاب قریباً پانچ سال سے مکمل تھی رب کریم بھلا کرے حضرت محترم جناب حاجی حبیب الرحمٰن صاحب زید مجدہٗ مالک مکتبہ الحسن لاہور کا انہوں

یہ کتاب شائع کرنے کا عزم فرمایا ہے۔ خدا کرے کہ یہ کتاب شایانِ شان طریق سے شائع ہو کر ان کی اور ہم سب کی نجات کا وسیلہ اور ہدایت و برکت و رحمت کا ذریعہ بنے آمین میں تمام معاونین اور خصوصاً عزیزان محمد دل نواز اور [illegible] سلمہا کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے بڑی محنت سے پروف ریڈنگ کی اسی طرح محترم ڈاکٹر عبدالرشید مخدومی صاحب کا بھی ممنون ہوں کہ کتابت و طباعت میں نظر ثانی فرمائی۔ جزاھم اللہ تعالیٰ أحسن الجزاء

تمام قارئین کرام اور بزرگان محترم سے آخر میں مودبانہ التماس ہے کہ بندہ کے لیے دنیوی و اخروی فلاح و سعادت اور ظاہری و باطنی عافیت و برکت کی دعا فرما کر احسان عظیم فرمادیں

وَجَزَاکُمُ اللّٰہُ تعالیٰ اَحْسَنَ الْجَزَاء والسّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

وَصَلَّی اللّٰہُ تعالیٰ علیٰ خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلانَا مُحَمَّدٍ وَّآلِہٖ واصحابِہٖ وَبَارَکَ وسلَّم

طالب دعا سیہ کار

احمد عبد الرحمٰن الصدیقی عفا اللہ عنہ

ناظم اعلیٰ انجمن خدام الدین رجسٹرڈ، مدیر مکتبۃ الحکمۃ الاسلامیہ

۱۱۷۹ نوشہرہ صدر ضلع پشاور۔ پاکستان

۴

محررہ یوم العرفۃ المبارکہ ۱۴۰۴ھ

باب اوّل

سائنس اور اسلام

سائنس فلسفہ اور مذہب کا دائرہ کار

سائنس فلسفہ اور مذہب

قدرت کی مادی کائنات میں جو قواعد و ضوابط کارفرما ہیں، جدید دور میں ان کی دریافت کا نام سائنس ہے سائنس لاطینی لفظ ہے جسکا معنی ہے جاننا یعنی علم اور جو قوانین مادہ سے ماورا الوراء سے متعلق ہیں ان کا نام فلسفہ ہے قدیم یونانی فلاسفہ اوّل کو حکمت طبعی یا طبیعات سے تعبیر کرتے ہیں اور دوم کو حکمت الٰہیات یا حکمت اعلیٰ کے نام سے نامزد کرتے تھے اور ان دونوں اور ان کے علاوہ ریاضی کے تمام اقسام اور اخلاقی منزلی اور سیاسی مدنی قوانین سب کو فلسفہ کے نام سے موسوم کرتے تھے

دورِ جدید میں سائنس کے ذرائع علم

عصرِ حاضر میں محسوسات میں فیصلہ کن قوت تجربہ اور استقراء ہے تجربہ او استقراء اگر تام اور وسیع ہو تو اس کا فیصلہ صحیح ہوتا ہے اور اگر ناقص ہو تو فیصلہ میں غلطی کا امکان ہے مثلاً قدیم تجربات فلاسفۂ یونان اور حکمائے یورپ کے یہ تھے کہ زمین ساکن ہے اور جدید تجربات نے یہ ثابت کر دیا کہ زمین گردش کرتی ہے جس سے پہلے تجربات غلط ثابت ہوئے اس سے معلوم ہوا کہ سابق تجربات ناقص تھے اس کے علاوہ کبھی موجودہ تجربہ کے خلاف مستقبل میں نیا تجربہ ظہور میں آجاتا ہے جس سے پہلے تجربہ کا حکم باطل ہو جاتا ہے

مثلاً ء۲ کسی وقت یہ تجربہ تھا کہ تصاویر سینما غیر متحرک ہیں لیکن اس کے بعد سینما میں تصاویر کے متحرک ہونے کا نیا تجربہ مشاہدے میں آیا جس سے پہلے تجربہ کا حکم غلط ثابت ہوا۔ اسی طرح پہلے وقت میں سینما کی تصاویر متحرک تھیں مگر ناطق نہ تھیں یعنی بولتی نہیں تھیں اس وقت تجربہ۔ تھا کہ تصاویر سینما اگرچہ متحرک ہیں لیکن ناطق اور بولنے والی نہیں لیکن اس کے بعد کے تجربے نے ان تصاویر کا ناطق ہونا بھی ثابت کیا جس سے پہلا حکم باقی نہیں رہ پھر مادی سائنس کے فیصلے جس احساس پر مبنی معلوم ہوتے ہیں اور ان کو قطعی اور غیر مشکوک سمجھا جاتا ہے، وہ سو فیصدی حسی نہیں۔ محسوسات اگرچہ خارج میں موجود ہیں لیکن ہمارے اندر وہ موجود نہیں بلکہ ہمارے اندر صرف شعوری کیفیات موجود ہیں اور شعور نہ جسم ہے نہ محسوس اور نہ محسوس کو اس سے اتصال ہے کیونکہ اتصال دو جسموں میں پایا جاتا ہے۔ غیر جسم اور جسم میں نہیں پایا جاتا۔ مزید برآں محسوس پر حکم لگانا صرف حس کا فیصلہ نہیں بلکہ عقل و فکر کو بھی اس میں دخل ہے مثلاً ہم نے آنکھ سے آم کے دانہ کو دیکھا جس کی وجہ سے شعاع بصری اور ہوا کے ٹکراؤ نے دماغی اعصاب کے ذریعہ ہم میں آم کی ایک شعوری کیفیت پیدا کر دی اس سے قبل ہماری عقل میں دانہ آم کا ایک کلی نقشہ موجود تھا۔ ہماری عقل نے اس کلی نقشہ کو محسوس آم کی کیفیت شعوری پر منطبق کیا اور اس انطباق کے تحت یہ حکم لگایا، کہ یہ آم ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوا کہ محسوسات کے متعلق جس قدر فیصلے صادر ہوتے ہیں ان میں بھی عقل کو دخل ہے عقل اگر صاف ہو تو ایک حد تک یہ فیصلے صحیح ہوتے ہیں لیکن اگر عقل میں تعصب اور وہم کی آمیزش ہو تو حقیقت مبہم ہو جاتی ہے اور فیصلے غلط ہو جاتے ہیں جس کی عمدہ مثال مغربی مستشرقین کی تصنیفات ہیں جن میں وہ اسلام قرآن اور صاحب قرآن کو عقل اور بصیرت کی اس عینک سے دیکھتے ہیں جس پر صلیبی جنگوں کا متعصبانہ غلاف چڑھا ہوا ہے اس عینک کے تحت ان کو اسلام قرآن اور صاحب قرآن سے متعلق

تمام روشن حقائق سیاہ نظر آتے ہیں ایسی صورت میں عقل صحیح فیصلہ نہیں کر سکتی۔

فلسفہ غیر مادی کائنات جو حواس کے تجربہ سے خارج ہے مثلاً خالق کائنات صفاتِ باری اور مابعد الموت کے انسانی احوال ان کے متعلق صرف عقل و دماغ سے کوئی ضابطہ یا قانون بنانا۔ اسی طرح لطیف اشیاء عقائد اعمال و اخلاق کے حسن و قبح کے متعلق عقل و فکر کے ذریعہ کوئی فیصلہ کرنا یہ سب فلسفہ کہلاتا ہے مذکورہ امور میں عقلِ محض کے فیصلے حرفِ آخر نہیں یہی وجہ ہے کہ ان میں اکثر تصادم بلکہ تناقض پیدا ہوتا ہے۔ فلسفہ مشائی فلسفہ اشراقی اور فلسفہ یورپ کے فیصلوں اور قوانین میں باہم تناقض ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ عقلی معلومات کا مآخذ درحقیقت حسی معلومات ہیں اور مذکورہ امور ماوراء الحس سے متعلق ہیں اس لیے عقل جب ان کے متعلق کوئی قانون بنائے گی تو محسوساتی رنگ میں بنائے گی اور نامحسوس کو محسوس پر قیاس کرے گی اس لیے ایسے فیصلے میں ضرور غلطی واقع ہوگی۔ مثلاً یہ فیصلہ کہ مادہ کائنات ازلی ہے کیونکہ اگر وہ ازلی نہ ہو تو وہ عدم محض اور خالص نیستی سے وجود میں آیا ہوگا اور عدم سے کوئی چیز وجود میں نہیں آسکتی کیونکہ پوری کائنات جوہری ذرات (مادہ) سے پیدا ہوئی ہے اور جہانِ محسوسات میں کوئی ایسی مثال نہیں کہ کوئی چیز نیست سے ہست ہوئی ہو۔ برتن مٹی سے، میز لکڑی سے، تلوار لوہے سے، عمارت چونے سیمنٹ گارڈر لکڑی وغیرہ سے تیار ہوتی ہیں مگر مادہ اگر پیدا شدہ ہو تو اس سے قبل جب کوئی مادہ تھا ہی نہیں تو وہ خالص عدم سے کس طرح وجود میں آیا۔ آپ نے دیکھ لیا کہ فلسفہ کا یہ فیصلہ جو عقلی کہلاتا ہے درحقیقت محسوسات سے ماخوذ ہے یعنی خدائے غیر محسوس کے فعل و عمل کو انسان محسوس کے فعل و عمل پر قیاس کیا گیا کہ انسان چونکہ نیست سے ہست نہیں کر سکتا لہٰذا خدا بھی ایسا نہیں کر سکتا کہ نیست سے کوئی چیز پیدا کر دے گویا خالق کو مخلوق پر قیاس کیا گیا حالانکہ خالق کائنات تو بڑی ذات ہے، ایک مخلوق کو دوسری مخلوق پر قیاس کرنا غلط ہے۔ ہاتھی جو مخلوق ہے بیس من

بوجھ اٹھا سکتا ہے لیکن ایک چیونٹی نہیں اٹھا سکتی اب اگر چیونٹیوں کی کانفرنس یا پارلیمنٹ یہ فیصلہ کر دے کہ چونکہ ہم بیس من بوجھ نہیں اٹھا سکتے تو ہاتھی بھی نہیں اٹھا سکتا تو یہ فیصلہ قطعًا غلط ہوگا۔

اسی طرح اگر انسان جو خالق کی نسبت اس سے بھی بہت کم ہے جس قدر چیونٹی ہاتھی سے کم ہے یہ فیصلہ کر دے کہ چونکہ ہم انسان نیست سے کوئی چیز ہست نہیں کر سکتے تو خدا بھی نہیں کر سکتا تو یہ فیصلہ غلط ہی ہوگا چیونٹی تو پھر بھی ہاتھی کے ساتھ بہت امور میں شریک ہے دونوں جسم ہیں دونوں حیوان ہیں لیکن انسان کو تو خدا سے کوئی مناسبت نہیں۔ لہٰذا یہ قیاس غلط ہے اور اس قیاس کے علاوہ ہمارے پاس کوئی ذریعۂ علم نہیں اور نہ ہی ایسی لیبارٹری ہے کہ جس میں ہم خدا کی قوت کا تجزیہ و تحلیل کر سکیں۔ اس کے علاوہ ہر حقیقتِ واقعیہ کے لیے مثال موجود کا مطالبہ ہی سرے سے درست نہیں جارج پنجم کی تاجپوشی کا جشن دہلی میں ہوا لیکن شاہانِ انگلستان میں سے اور کسی بادشاہ کا جشنِ تاجپوشی دہلی میں منعقد نہیں ہوا اب اگر کوئی یہ کہہ دے کہ میں جارج پنجم کے جشنِ تاجپوشی کا دہلی میں ہونا تسلیم نہیں کرتا جب تک مجھے کوئی اور مثال ایسی نہیں پیش کی جاتی کہ انگلستان کے کسی اور بادشاہ کی تاجپوشی بھی دہلی میں ہوئی ہے تو کیا اس مطالبہ مثال سے اصل واقعہ مشکوک ہو سکتا ہے قطعًا نہیں۔ یہی حال مادے کا ہے پہلے مادہ آغازِ آفرینش میں عدم سے وجود میں آیا ازاں بعد پوری کائنات مسلسل مادہ کی ترتیب سے پیدا ہوتی چلی گئی لہٰذا نیست سے ہست کا وجود صرف ایک واقعہ ہے اور وہ بھی اجسام عالم کی تخلیق سے قبل جس وقت نہ انسان تھا نہ دیگر کائنات مادہ بن چکنے کے بعد جس قدر تخلیقی واقعات ہیں وہ سب ہست سے ہست ہونے کے واقعات ہیں اس لیے جس زمانے میں انسان ہے وہ ہست سے ہست ہونے کے واقعات کو دیکھتا ہے ان سے وہ یہ نتیجہ کیونکر نکال سکتا ہے کہ عالم اجسام کی تخلیق سے

قبل آغازِ تخلیق مادہ کے وقت بھی نیست سے ہست ہونے کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا اب اگر پھر بھی مادئیین میں سے کوئی اصرار کرے تو نیست سے ہست ہونے کے واقعہ کا ضرور ہمیں مشاہدہ کرا دیا جائے تو جواب یہ ہے کہ تم ہم کو اس زمانہ میں لے چلو جس زمانہ میں تخلیق اجسام عالم سے قبل جوہر مادہ کی تخلیق ہو رہی تھی تو ہم مشاہدہ کرانے کے لیے بھی تیار ہیں یہ مطالبہ مشاہدہ ایسا ہے کہ کوئی شخص یہ مطالبہ کرے کہ ہمیں دارا اور سکندر کی جنگ کا مشاہدہ بیسویں صدی میں کرا دو ورنہ ہم نہیں مانتے تو اس کے جواب میں یہ کہنا پڑے گا کہ ہمیں اس زمان و مکان میں پہنچا دو جہاں اور جس وقت یہ جنگ ہوئی تھی تو مشاہدہ کرا دیا جائے گا تاہم اسکندر فردوس یونانی نے نیست سے ہست ہونے کی صحت پہ ایک مستقل کتاب لکھی ہے علامہ ابن مسکریہ نے اپنی کتاب الفوز الاکبر میں اس کی رائے واضح الفاظ میں نقل کی ہے کہ موم کی شکل اگر گول ہو اور پھر ہم اس میں تصرف کر کے مربع شکل میں تبدیل کریں تو پہلی صورت و شکل کروی معدوم ہو کر دوسری صورت مربع وجود میں آئی۔ اب ظاہر ہے کہ یہ مربع صورت عدم سے وجود میں آئی پہلی صورت میں نہیں بنی بلکہ وہ گم ہو گئی تو جب صورت عدم سے وجود میں آسکتی ہے تو مادہ بھی عدم سے وجود میں آسکتا ہے کیونکہ جوہری مادہ بسیط اجزا ہیں جو ہر حالت میں کوئی نہ کوئی صورت رکھتے ہیں کوئی مادہ صورت سے جدا نہیں ہو سکتا اور نہ کوئی صورت مادہ کے بغیر موجود ہو سکتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مادہ اور صورت دونوں آغازِ تخلیق میں عدم سے وجود میں آئے میرے نزدیک مادئیین کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے مخلوق بالذات اور مخلوق بالواسطہ میں فرق نہیں کیا۔ تمام مادی اجسام مخلوق بالواسطہ ہیں کہ وہ مادہ کے واسطے سے خالق کائنات سے خلق ہوئے ہیں لیکن خود مادہ کسی دوسرے مادے سے مخلوق نہیں ہوا۔ بلکہ خالق کائنات نے براہِ راست اس کو خلق کیا کیونکہ اگر ہر مادے کے لیے مادہ ضروری ہو تو تسلسل محال لازم آئے گا جو فلسفہ کے لحاظ سے درست نہیں۔

اس کی مثال یہ ہے کہ انسان مثلاً زید بالواسطہ کلام کرتا ہے یعنی زبان کے ذریعے تکلم اور نطق کرتا ہے لیکن خود زبان بالذات ناطق اور متکلم ہے زبان کے بولنے میں وہ کسی دوسری زبان کی محتاج نہیں، بلکہ بالذات ناطق ہے اسی طرح اجسام مادیہ مخلوق ہونے میں مادہ کے محتاج ہیں لیکن مادہ مخلوق ہونے میں کسی دوسرے مادہ کا محتاج نہیں۔

مذہب مذہب ان امور سے متعلق ہے جو سائنس اور فلسفے کے دائرے سے خارج ہیں سائنس کا دائرہ مادیات ہیں اور فلسفے کی بنیاد ظنیات اور تخمینات ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ یونانی اور یورپی فلسفہ چونکہ غیر یقینی تھا۔ اس لیے وہ مذہب کا استیصال نہ کر سکا۔ لیکن سائنس چونکہ مشاہدہ اور تجربہ پر مبنی ہے اس لیے مذہب اس کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتا یہ خیال بالکل غلط ہے مذہب اور سائنس میں مقابلہ اس وقت ہوتا جب دونوں کا دائرہ عمل ایک ہوتا لیکن مادیات اور ماوراء المادیات دو مختلف دائرے ہیں جن میں مقابلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا سائنس جن چیزوں کا اثبات یا ابطال کرتی ہے۔ مذہب کو ان سے بالکل سروکار نہیں، عناصر کس قدر ہیں، پانی کن چیزوں سے مرکب ہے، ہوا کا کیا وزن ہے روشنی کی رفتار کیا ہے زمین کے کس قدر طبقات ہیں۔ مذہب کو ان سے کچھ تعلق نہیں مذہب جن چیزوں سے بحث کرتا ہے مثلاً یہ کہ خدا ہے، اور مرنے کے بعد اور ہر قسم کی زندگی ہے اور نیکی اور بدی ہے اور ان کے نتائج ثواب و عقاب ہیں ان میں کونسی چیز ہے جسے سائنس ہاتھ لگا سکتی ہے سائنس دان اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم کو ان کا علم نہیں یا یہ کہ یہ چیزیں تجربہ اور مشاہدہ سے باہر ہیں اور ہمیں صرف اُن چیزوں کا علم ہو سکتا ہے جو تجربہ میں آسکتی ہیں۔ لیکن حقیقت ناشناسوں نے عدم علم سے علم عدم سمجھ لیا حالانکہ ان دونوں میں زمین و آسمان

کا فرق ہے اس میں شک نہیں کہ مذہب کے دائرے میں تمام وہ امور داخل ہیں جو تہذیب النفس اور تزکیۂ قلب اور اصلاح فرد اور اصلاح معاشرہ سے متعلق ہوں یا اجتماعی اور سیاسی زندگی کی اصلاح سے وابستہ ہوں۔ اس بنا پر مذہب کے لیے ضروری ہوا کہ وہ مادیات کے متعلق بھی احکام خیر و شر صادر کرے کہ فلاں فلاں حیوانات کا کھانا جائز ہے اور فلاں فلاں کا ناجائز ہے دودھ کا پیا جانا جائز ہے اور شراب کا ناجائز ہے تجارت کی فلاں صورتیں جائز ہیں اور فلاں صورتیں ناجائز ہیں شرکتی کاروبار جائز ہے اور سود ناجائز معاشی نظام کے تحت فلاں صورتیں جائز ہیں اور فلاں صورتیں ناجائز ہیں جنگ ازالہ ظلم اور اقامت عدل کے لیے جائز اور جہاد ہے اور اس کے خلاف ناجائز فرد اور جماعت کی فلاں قسم کی آزادی جائز اور فلاں ناجائز ہے ایسے تمام احکام اور حدود جو مذہب حقیقی نے مقرر کیے ہیں ان سے مقصود اصلاح معاشرہ، تہذیب نفس اور عادلانہ نظام کا قیام ہے یہ معاملہ کہ انسان کے کن افعال سے روح انسانی کو پاکیزگی حاصل ہوتی ہے اور کن سے روح میں فساد کے جراثیم پیدا ہوتے ہیں اور کن افعال میں روح کے لیے زہریلے اثرات موجود ہیں اور کن میں تریاقی اثرات۔ یہ سب امور سائنس کی دسترس سے باہر ہیں الکلام شبلی میں یورپ کے سائنسدانوں کے اقراری حوالہ جات درج ہیں کہ روح اور ملتۂ حیات انسانی کی حقیقت کی دریافت سے چوٹی کے سائنس دان عاجز ہیں لہٰذا قدرتی طور پر روح اور روح سے سرزد افعال کی خاصیات کی دریافت خالق روح اور خالق انسان کے دائرہ علم میں داخل چیزیں ہیں جس کا حقیقی فیصلہ مذہب یا الہام ہی کر سکتا ہے نہ مادی علوم جن کی بڑی دلیل یہ ہے کہ مادی علوم کے علمبرداروں نے جب بھی اپنی حدود سے تجاوز کر کے غیبی اور الہامی علوم میں مخالفانہ مداخلت کی۔ تو انسانی معاشرہ ان کی اس مداخلت بے جا سے درہم برہم ہوا۔ اور بالآخر حقیقی مذہب کے قوانین

کی طرف ان کو مجبوراً جھکنا پڑا کیا یہ حقیقت نہیں کہ یورپ نے مادی علوم کی مدہوشی میں مادی علوم کے دائرے سے باہر قدم رکھ کر اسلام پر جو اعتراضات کیے اور جن مسائل کو نشانۂ طعن بنایا۔ آج تمدنی ضروریات کی وجہ سے خود انہوں نے اپنی یہ غلطی عملاً محسوس نہیں کی کہ ان کی تمام علمی کاوشیں نبی امی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پیش کردہ خدائی قوانین کے آگے بے وقعت ثابت ہوئیں۔ یورپ نے عدلِ انفرادی اور اجتماعی کی غرض سے اسلام کے مقدس قانونِ جہاد پر اعتراض کیا لیکن گزشتہ دو جنگوں میں اپنی بات کے پیچ کے لیے خون کی ندیاں بہانے اور کروڑوں مکانات کو خاکستر بنا دینے کو عملاً صحیح قرار دیا یعنی یہ ثابت کر دیا کہ ظلم کرنے کے لیے جنگ جائز اور دفعِ ظلم کیلئے جہاد ناجائز ہے بوقت شدید ضرورت اسلامی قانونِ طلاق کا یورپ نے تمسخر اڑایا لیکن فطرت کی گہری ضرورتوں نے ان کو اس قانون کے تسلیم کرانے پر اس قدر آمادہ کیا کہ ضرورت اور بے ضرورت سب صورتوں میں طلاق کا سلسلہ یورپ اور امریکہ میں اس قدر بڑھ گیا ہے کہ یورپ میں فی آٹھ نکاح ایک طلاق اور امریکہ میں فی چار نکاح ایک طلاق تک نوبت پہنچی اسلام کے قانونِ تحریم شراب اور تحریم سود کو یورپ نے مانع ترقی سمجھا لیکن شراب کی ڈاکٹری تحقیقات کے بعد جب شراب کے مہلک اثرات ظاہر ہوئے تو امریکہ نے کروڑوں ڈالر خرچ کر کے ۱۹۳۷ء میں بندش شراب کا اعلان کر دیا لیکن جرم و گناہ پھیلانا آسان کام ہے روکنا مشکل ہے۔ اس لیے امریکہ کے تمام انتظامات بندشِ شراب بے اثر ثابت ہوئے اور شراب نوشی کی چلائی ہوئی گاڑی رک نہ سکی اور امریکہ اس میں ناکام ہوا۔ سود نے جب سرمایہ دارانہ نظام کو جنم دیا اور عوام کی اخلاقی اور معاشی حالت تباہ ہوئی تو محققین یورپ نے اس کی قباحت کا احساس کیا لیکن جو قبیح چیز ایک بار معاشرے کا جزو بن جائے اس کو ہٹانا حکومت کے بس کی بات نہیں پیغمبر اور نبی کی تعلیم سے ایسا ممکن ہے لیکن

حکومت کے قانون سے یہ ممکن نہیں کہ جو برائی معاشرے کی جڑ میں داخل ہو جائے اس کو اکھیڑ کر دور پھینکا جائے اسلامی قانون میں عورتوں پر اصلاحِ معاشرہ کے لیے بعض فطری پابندیاں لگائی گئیں ہیں یورپ نے اس کو دورِ وحشت اور بربریت کی یادگار سمجھا لیکن جب یورپ کی بے لگام آزادی اور صنفی آوارگی نے وہ شکلیں پیدا کیں کہ جن کے اثر سے عائلی زندگی تباہ ہوئی اور بہت سے شوہروں نے عورتوں کی بے لگامی سے تنگ آ کر خودکشی اختیار کی تو لاڈسی کو اپنی کتاب "وومین" میں یہ لکھنا پڑا کہ عورتوں کی آزادی سے پیدا شدہ مشکلات کا واحد حل یہ ہے کہ عورت کو دانایانِ مشرق (مسلم قوانین) کی نگرانی میں کنٹرول کیا جائے

سائنس اور مذہب کی دشمنی کا آغاز کب ہوا

یورپ نے عرب اور اندلس کے مسلم سائنس دانوں سے علم حاصل کیا ورنہ اگر مسلمانوں کے ذریعہ یورپ کو سائنس کی روشنی نہ پہنچتی تو اب تک یورپ کی حالت وہی ہوتی جو افریقہ کی وحشی اقوام کی ہے۔

صنعت

کاغذ یورپ پر عربوں کا بڑا احسان کاغذ کا رواج ہے کاغذ کے اصل موجد چینی تھے لیکن باقاعدہ کاغذ سازی کا پہلا کارخانہ مسلمانوں نے ہارون الرشید کے زمانہ میں ۷۹۴ء میں بغداد میں قائم کیا اس کے بعد مسلمانوں نے دیگر بڑے بڑے شہروں میں بھی کاغذ سازی کے کارخانے قائم کیے۔ مثلاً دمشق۔ مصر۔ نیشاپور۔ شیراز خراسان، مراکش، غرناطہ، قرطبہ، سسلی وغیرہ۔ لیبان تمدنِ عرب صفحہ ۴۳۸ میں لکھتے ہیں کہ کاغذ پر پہلی لکھی ہوئی تحریر جو ۱۰۰۹ء میں لکھی گئی تھی اور جو دیل کے کتب خانے میں محفوظ ہے یہ کاغذ عربوں سے خرید اگیا تھا

قطب نما

قطب نما بھی عربوں کی ایجاد ہے یہ آلہ قرون اولی کے تمام تجارتی اور جنگی جہازوں میں لگا ہوا تھا اسی کا کرشمہ تھا کہ ہمارے جہاز جدہ سے چین تک جاتے تھے جب یہ چیزیں ہم نے یورپ کو دیں تو اس کو لے کر کولمبس بحر اطلس کی لہروں کو چیرتا ہوا امریکہ جا پہنچا اور واسکوڈے گاما نے ہندوستان دریافت کیا۔

بارود

مسلمان صدیوں سے بارود استعمال کرتے تھے سسلی اور سپین کے کارخانوں میں دیگر اسلحۂ جنگ کے علاوہ ایک مسالہ بوتلوں میں بھرا جاتا تھا جنہیں مشینوں کے ذریعے دشمنوں پر پھینکا جاتا تھا۔

توپ

توپ کو پہلے افریقہ کے سردار یعقوب نے سنہ ۱۲۰۵ء میں استعمال کیا۔ یورپ کے مورخ بارود کے موجد راجر بیکن کو قرار دیتے ہیں جو کہ غلط ہے بیکن نے بارود سازی ایک عربی کتاب النیران المحرقہ جلانے والی گیس سے سیکھی تھی ملاحظہ ہو تمدنِ عرب ص۴۳۸ مصنفہ لیبان۔

کلاک اور گھڑیاں

ہارون الرشید نے شارلیمان کو سنہ ۴۶۸ء میں جو تحائف دیئے اس میں ایک گھڑی بھی تھی سلطان کامل نے فریڈرک کو جو تحائف سنہ ۱۱۹۹ء میں دیئے اس میں ایک گھڑی تھی جس میں شمس و قمر حرکت کرتے تھے اور طلوع اور غروب کا منظر دکھائی دیتا تھا اور ہر گھنٹہ پر ٹن ٹن کی آواز آتی تھی

ہوائی جہاز

ول ڈیوران ایج آف فیتھ ص۲۹۵ میں لکھتا ہے کہ سپین کے مسلم سائنسدان نے تین چیزیں ایجاد کر کے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا اول عینک کا شیشہ۔ دوم وقت ناپنے والی گھڑی جو کھیلوں اور دوڑنے میں استعمال ہوتی تھی سوم ایک مشین جو ہوا میں اڑ سکتی تھی۔

چیچک کا ٹیکہ

یہ بھی مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ ۱۷۲۱ء میں لیڈی ورٹل مارٹنگ نے قسطنطنیہ جاکر چیچک کا ٹیکہ سیکھا ملاحظہ ہو میراثِ عرب صفحہ ۲۴۰ مصنفہ ڈریپر۔ بعض کاریگر ایسی قیمتی چیزیں بناتے تھے جو امرا بھی خرید نہیں سکتے تھے ہارون الرشید کا وزیراعظم یحییٰ بن خالد برمکی بازار سے گزرا اس کی نظر ایک مرصع صندوقچے پر پڑی۔ اس نے پسند کیا اور خرید نے کا ارادہ کیا لیکن قیمت پر اتفاق نہ ہو سکا۔ یحییٰ ستر لاکھ درہم دیتا تھا اور دکاندار زیادہ مانگتا تھا۔ ایچ آف فلیتھ ص ۳۰۲

مہ نخشب

نخشب ترکستان میں ایک گاؤں کا نام تھا جہاں حکم بن ہاشم نے دعوئے نبوت کیا اس نے ایک چاند بنایا تھا جو غروب آفتاب کے بعد فوراً ایک کنوئیں سے نکلتا تھا اور تقریباً سو مربع میل علاقہ کو رات بھر منور کرتا تھا اور طلوعِ آفتاب سے پہلے ڈوب جایا کرتا تھا اس ایجاد کا کمال یہ تھا کہ کوئی موسم بھی ہو جونہی سورج کا آخری حصہ نہاں ہوتا وہ چاند نکل آتا۔ آدھی رات کو عین سر پر آجاتا۔ اور رفتہ رفتہ اس رفتار سے واپس جاتا کہ اس کا آخری کنارہ کنوئیں میں غائب ہو کر سورج نکل آتا سورج سے کبھی اس کا سامنا نہیں ہوا۔ غالب نے کیا خوب کہا ہے ؎

چھوڑا مہ نخشب کی طرح دستِ قضا نے   خورشید ابھی اس کے برابر نہ ہوا تھا

مطلب یہ ہے کہ دست قضا یعنی خدا نے سورج کو حکم دیا کہ مہ نخشب کی طرح نکلو اور ڈوبو، اور صورت یہ تھی کہ ابھی وہ حسن وجمال میں میرے محبوب کے برابر نہ ہوا تھا مہ نخشب کا موجد مدعی نبوت بغداد میں ملازم تھا اس نے بغداد میں سائنس پڑھی تھی مسلمانوں کی سائنس کی مہارت کا یہ کمال اس وقت تھا جبکہ یورپ والے کھالیں پہنتے تھے اور جنگلی وحشیوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے مسلمانوں نے سائنس

میں اتنی ترقی کی تھی کہ انہوں نے ابن الہیثم پیدا کیے جو دو سو کتابوں کے مصنف ہیں اور جس نے بطلیموس اور اقلیدس کے اس نظریۂ رویت کی تردید کی کہ رویت اس شعاع سے ہوتی ہے جو آنکھ سے نکل کر مرئی تک جاتی ہے اس نے کہا کہ مرئی کا عکس آنکھ تک آتا ہے دل ڈیوران اینج آف فیتھ کے صـ ۲۸۹ پر لکھتے ہیں راجر بیکن موجد دوربین جو طبیعیات میں بلند مقام رکھتا ہے لیکن اگر ابن الہیثم نہ ہوتا تو راجر بیکن کا نام و نشان تک نہ ہوتا. ابن الہیثم حسن بن حسن بن الہیثم بصرہ کا رہنے والا ہے.

علم الکیمیا جابر بن حیان علم کیمیا کا بابا آدم سمجھا جاتا ہے علم کیمیا پر اس نے سو کتابیں لکھی ہیں اس کی کتاب الکیمیا کا لاطینی اور فرانسیسی میں ترجمے ہو چکے ہیں مسٹر اہودس نے جابر کی نو کتابوں کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔

میڈیکل سائنس اس فن کے موجد محمد بن ذکریا رازی ہیں جو دو سو کتابوں کے مصنف ہیں ایک کتاب چیچک اور خسرے پر لکھی ہے جو لاطینی اور دیگر یورپی زبانوں میں ترجمہ ہوئی ایک کتاب زمین کی ساخت پر لکھی اور ایک کتاب اس پر لکھی کہ زمین فضا میں کیوں معلق ہے اس کی کتاب الحادی بیس جلدوں میں ہے جس کا انگریزی ترجمہ ۱۸۶۶ء تک چالیس مرتبہ چھپا۔ یعقوب کندی ۸۵۰ء نے سائنس کے مختلف شعبوں پر ۲۲۵ کتابیں لکھی ہیں اسی طرح ابو نصر محمد بن فارابی ۹۵۱ء نے فلسفہ اور سائنس کے مختلف شعبوں پر کتابیں لکھی ہیں ان میں سے کشف الظنون میں ایک سو چودہ تصانیف کے نام درج ہیں ابن سینا ۹۸۰ء سے ۱۰۳۷ء ایک سو پندرہ کتابوں کے مصنف ہیں طب میں قانون چودہ جلدوں میں لکھی پندرھویں صدی کے اخیر میں تیس مرتبہ شائع ہوئی۔ یہ کتاب صدیوں تک یورپ کے نصاب میں داخل رہی. ڈاکٹر ولیم آسلر القانون کو طب کی بائبل کہا کرتا تھا۔ ابن طفیل ابو بکر بن عبدالملک بن محمد بن طفیل ۱۱۸۵ء غرناطہ کے طبیب اور فلسفی جو بعد میں وزارت کو پہنچے۔ ان کی

تمام تصانیف پادریوں نے جلادی تھیں صرف اس کا ایک فلسفیانہ ناول حي بن یقظان باقی رہ گیا اس کتاب کو ایڈورڈ پوکاک نے لاطینی میں منتقل کیا اس کا ڈچ ترجمہ ۱۶۷۲ء میں روسی ترجمہ ۱۹۲۰ء میں اور ہسپانی ترجمہ ۱۹۳۴ء میں ہوا۔

الغرض اگر مسلمان سائنس دانوں کی تاریخ لکھی جائے تو صرف ان کے ناموں کے لیے کئی جلدیں درکار ہیں مسلمان سائنس دان صرف یونانی سائنس دانوں کو زندہ کرنے والے نہیں تھے بلکہ جدید سائنسی تحقیقات کے موجد تھے رابرٹ بریفالٹ تشکیل انسانیت میں لکھتا ہے سائنس سے مراد تحقیق کی نئی روح، تفتیش کے نئے طریقے اور پیدائش اور مشاہدے کے نئے اسلوب ہیں جن سے یونانی بے خبر تھے اس روح اور ان اسالیب کا یورپ میں رائج کرنے کا سہرا عربوں کے سر ہے ملخص و تشکیل انسانیت ص ۲۴۷ اور ص ۲۴۶ میں لکھتے ہیں کہ اگر عرب نہ ہوتے تو عصر رواں کی مغربی تہذیب جنم نہ لیتی۔ یورپی نشو و نما کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس میں اسلامی تہذیب کا یقینی سراغ نہ مل سکے یہ صحیح ہے کہ عربوں نے کوئی کاپرنیکی یا نیوٹن پیدا نہیں کیا۔ لیکن عربوں کے بغیر کاپرنیکی یا نیوٹن کا پیدا ہونا بھی ناممکن تھا تشکیل انسانیت ص ۲۴۶

ڈاکٹر ڈریپر لکھتے ہیں قرون وسطی میں سائنس کی ترقی مسلمانوں کی بدولت تھی اس وقت عیسائی دنیا پر جہل وادہام کی تاریکی محیط تھی اور انہیں علمی مشاغل کی ہوا تک نہیں لگی تھی ملاحظہ ہو کتاب معرکہ مذہب و سائنس ص ۲۴۱ بریفالٹ کہتے ہیں بازنطینیوں نے ہزار سال گزار دیے اور تہذیب اور ارتقا میں کوئی حصہ نہیں لیا جس روشنی سے چراغ تہذیب پھر روشن ہوا وہ رومی و یونانی ثقافت کے ان شراروں سے نہیں نکلی تھی جو یورپ کے کھنڈروں میں سلگ رہے تھے بلکہ اسے عرب اپنے ساتھ لائے تھے۔ ص ۲۵۱

آرنلڈ لکھتے ہیں عربی کتابوں کے سینکڑوں تراجم یورپ کی بر باد زمین پر بارش بن کر برسے اور مختلف شعبہ ہائے علم نے انگڑائی لی۔ میراث اسلام ص ۲۵۱۔ لیبان کا قول ہے

یورپ نے عربوں سے تہذیب حاصل کی۔ یورپ میں عربوں کے علوم سپین سسلی اور اٹلی کی راہ سے پہنچے اگر عربوں کا نام یورپ کی تاریخ سے نکال دیا جائے تو یورپ کی حیاۃ ثانیہ کئی سو سال پیچھے جا پڑتی ہے تمدن عرب ص۵۱۳

فریڈرک دوم نے مسلمانوں کے علوم سارے یورپ میں پھیلائے نتیجہ یہ ہوا کہ جو ملک ان کے زیر نگین نہ تھے اس میں بھی علمی تحریک پیدا ہو گئی اور وہ یورپ جس پر اندھیرا چھایا ہوا تھا ابن رشد کے فلسفہ ابن ابیکار کے علم نباتات الوالقاسم کے علم جراحی ابن العوام کے علم زراعت ابن الخطیب کے علم تاریخ سے آشنا ہو گیا یہ حقیقت ہے کہ عصر رواں کی تمام ایجادات دیکاۃ عربوں کے طفیل ہیں ملخص ایس پی سکاٹ از اخبار الاندلس ترجمہ ہسٹری آف دی مورش امپائر جلد ۲ ص۵۸ ، ص۱۰۵ یہ حقیقت ہے کہ علم الفلک و ریاضیات کے بانی یحیی بن ابی منصور رصد کا محمد بن ابراہیم فزاری محمد بن جابر تبانی جن کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اگر بطلیموس زندہ ہوتا۔ تو ان کی تحقیقات کی داد دیتا۔ علی بن یحییٰ اسی طرح لابی محمد بن موسیٰ خوارزمی جو یورپ کے ماہرین ریاضیات کے بالواسطہ استاد ہیں علم جغرافیہ کے بانی ابن فرداذبہ صاحب کتاب المسالک والممالک ہیں جو پنجاب یونیورسٹی میں محفوظ ہے اور ایک نسخہ مکتبۂ ظاہریہ دمشق میں ہے دوم جغرافیہ دان ابن واضح یعقوبی جس کی کتاب البلدان سے بڑھ کر کوئی جغرافی کتاب نہیں یہ کتاب لندن میں چھپی ہے اور ایک نسخہ قلمی مکتبۂ ظاہریہ دمشق میں موجود ہے اسی طرح اصطخری مقدسی مسعودی ابن حوقل ابن جبیر یاقوت حموی کی کتابیں جو عہد عباسی میں لکھی گئیں یورپ کے لیے مشعل راہ ہیں تہذیب و تمدن اسلامی حصہ دوم اختر ندوی ص۲۹۵ بحوالہ نکلسن لٹریری ہسٹری ص۴۱۹ وڈوزی جلد دوم ص۱۵۴ میں لکھا ہے کہ آج تک کوئی ملک ایسا نہیں جس کے باشندے سو فیصد لکھنا پڑھنا جانتے ہوں لیکن آج سے ہزار سال قبل اسلامی اندلس کے کل باشندے لکھنا پڑھنا جانتے تھے اس وقت یورپ میں ایک فیصدی

آبادی بھی لکھی پڑھی نہیں تھی یہاں تک کہ پادری دستخط کرنا نہیں جانتے تھے وہ دستخط کے بجائے عشاء ربانی کی شراب میں انگلی ڈال کر کاغذ پہ دھبے ڈالتے تھے یہ اسکاٹ کا بیان ہے کہ عام کتابیں کیا انجیل تک نایاب تھی بادشاہ فرانس نے اپنا اسلحہ اور سامان گروی رکھ کر ایک گرجا سے انجیل تک رسائی حاصل کی۔

ملکہ ازابیلہ کے قابل فخر کتب خانہ میں ۲۰۱ کتابیں تھیں لیکن اس ملک سے ساڑھے چار سو سال پہلے الحکم کے کتب خانہ میں چار لاکھ کتابیں تھیں جن میں سے اکثر وہ پڑھ چکا تھا عبدالرحمن الداخلی نے دوسری صدی میں قرطبہ کا سنگ بنیاد رکھا اور ہشام اور حکم نے اس کو عروج بخشا۔ ان میں وہ علوم پڑھائے جاتے تھے کہ تیرہ سو سال میں اُن پر اضافہ نہ ہو سکا دینی علوم کے علاوہ طب جراحت، سائنس ادویہ سازی۔ نجوم۔ ہیئت۔ جغرافیہ۔ حساب ہندسہ کا درس اس یونیورسٹی میں ہوتا تھا قرطبہ میں تعلیم پانے والوں کی تعداد گیارہ ہزار تھی اور آٹھ مدارس ان سے ملحق تھے ابتدائی تعلیم کا انتظام ہر گاؤں کی مسجد سے متصل مدرسہ میں ہوتا تھا۔ قرطبہ کے ابوالقاسم بھر لیطی تمام یورپ کے بالواسطہ استاد تھے ایسی یونیورسٹیاں طلیط۔ غرناطہ اشبیلہ میں بھی تھیں اسلامی ممالک میں جس وقت سائنس کے چراغ روشن تھے۔ شاندار عمارتیں اور صاف پختہ سڑکیں موجود تھیں یورپ کا یہ حال تھا کہ ڈریپر معرکہ مذہب و سائنس صہ۳۶۱ میں لکھتا ہے کہ ۱۸۸۲ء میں یورپ کا بیشتر حصہ لق و دق بیابان کا بے راہ جنگل تھے جا بجا دلدل اور غلیظ جوہر تھے لندن اور پیرس جیسے شہروں میں لکڑی کے ایسے مکانات تھے جن کی چھتیں گھاس کی تھیں۔ امراء بھینس کے سینگ میں شراب ڈال کر پیتے تھے گلیوں میں فضلے کے ڈھیر لگے رہتے تھے، سڑکوں پر بے اندازہ کیچڑ پڑا رہتا تھا سالہا سال تک کپڑے نہ دھوتے تھے نہانا اتنا بڑا گناہ تھا کہ پاپائے روم نے سسلی اور جرمنی کے بادشاہ فریڈرک ثانی پہ کفر کا فتویٰ لگایا تو فہرست الزامات میں یہ بھی درج تھا کہ وہ ہر روز مسلمانوں کی طرح غسل کرتا ہے ڈاکٹر ڈریپر معرکہ سائنس

ص۴۴۹ میں لکھتا ہے کہ ۱۸۷۷ء میں جب وہ روم گیا تو وہاں جا بجا غلاظت کے ڈھیر اور گندے پانی کے جوہڑ تھے سترھویں صدی میں برلن کی یہ حالت تھی کہ بازاروں میں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پڑے رہتے تھے مگر یورپ کی اس حالت سے آٹھ سو سال پہلے مسلمانوں کے ایسے مکانات اسپین مصر، بغداد شام میں موجود تھے جن کی نظیر آج بھی دنیا میں نہیں مل سکتی اور تعلیم اور صفائی کا اتنا چرچا تھا جو بے مثل تھا اب معاملہ بالکل بالعکس ہوا۔

؎ نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو ترس گئے ہیں وہ ایک جلوۂ سحر کیلئے

تاریخ کا قطعی فیصلہ ہے کہ اگر مسلمان سپین اور سسلی نہ جاتے تو یورپ بربریت، ہلاکت جہالت غنڈہ گردی اور بداخلاقی سے کبھی نہ نکل سکتا۔ مسلمانوں نے یورپ کو ایک تابدار تمدن عظیم الشان تہذیب بے شمار درس گاہیں اور ہر قسم کے علوم دیئے، انہیں کپڑے پہننا نہانا کھانا انسانوں کی طرح رہنا سہنا سکھایا لیکن جب اسپین کی اسلامی حکومت کا ۱۴۹۲ء میں خاتمہ ہوا تو عیسائی بادشاہ نے مسلمانوں کے ان احسانات کا جو بدلہ دیا وہ یہ ہے کہ ان کے سرکردہ افراد کو مذہبی عدالت سے ۲۸۵۴۰ کو موت کی سزا دی گئی۔ ۱۲۰۰۰ ہزار کو زندہ جلا دیا گیا ان کی سینکڑوں لائبریریاں جن میں لاکھوں کتابیں تھیں، سپردِ آگ کردی گئیں ۱۵۵۶ء میں فلپ دوم نے سارے حمام بند کردیے ۱۶۱۰ء میں تمام مسلمانوں کو ترکِ ملک کا حکم مل گیا انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ہے کہ سپین کے ڈیڑھ لاکھ عربوں کا ایک قافلہ بندرگاہ کی طرف جارہا تھا کہ بلیڈا نامی ایک پادری نے غنڈوں کو ساتھ ملا کر اس قافلہ پر حملہ کیا اور ایک لاکھ آدمی مار ڈالے پھر گھروں، بازاروں، گلیوں میں مسلمانوں پر قاتلانہ حملہ ہوئے یہاں تک کہ ۱۶۳۰ء میں ایک بھی مسلمان سپین میں باقی نہ رہا۔

عیسائیت کی علم دشمنی

۱۔ چوتھی صلیبی جنگ میں صلیبی لشکر قسطنطنیہ پہنچا تو اس نے وہاں کی تمام عیسائی آبادی کو لوٹا اور تمام کتابیں جلا دیں ملاحظہ ہو تمدن عرب مصنف لیبان ص۲۰۳

۲۔ طرابلس میں اس دور کی عظیم ترین لائبریری تھی جس میں کتابوں کی تعداد تیس لاکھ تھی جب صلیبی لشکر طرابلس پہنچا تو اس نے کتب خانہ کو آگ لگا دی اور کل کتابیں جلا دیں اور مسلمانوں کی چھ سو سال کی محنت کو تباہ کر دیا ملاحظہ ہو معرکہ مذہب و سائنس صـ۱۵۰

۲۔ جاہل اور وحشی عیسائی بادشاہوں نے اس زمانہ میں جبکہ اہل علم کا شدید قحط تھا مسلمانوں کی ساٹھ لاکھ سے زیادہ کتابیں جلادی گییں معرکہ مذہب و سائنس صـ۳۹۹ یورپ کے مختلف حصوں میں جو کچھ ہوا باقی کسر تاتاریوں نے پوری کی تیرھویں صدی میں انہوں نے بغداد، کوفہ، بصرہ، حلب، دمشق، نیشاپور، خراسان، خوارزم، شیراز کی سینکڑوں لائبریریاں تباہ کر ڈالیں جن کی کتابوں کی مجموعی تعداد تین کروڑ سے زیادہ تھی یورپ پر اسلام کا احسان صـ۹۸

۴۔ ۴۷۶ء زوالِ روما کے بعد پاپائیت برسر اقتدار آئی اور لوتھر کے خروج ۱۵۲۰ء تک وہ سیاہ و سفید کی مالک رہی پوپ مذہبی ادب کے بغیر تمام انواع علوم کا دشمن تھا۔

۵۔ یونان کی ایک لڑکی ہیپشیا جو اسکندریہ ۴۱۴ء میں تعلیم پاکر فلسفی اور سائنسدان بن گئی اسکندریہ کے بشپ سائرل کے کارندوں نے سائرل کی تکفیر کی وجہ سے اس لڑکی کو ننگا کر کے اس کی کھال کھرچی اور اس کی لاش کے ٹکڑے کیئے۔ معرکہ مذہب و سائنس صـ۷۶ و تمدن عرب صـ۶۴۳

۶۔ فلارنس اٹلی کا مشہور ہیئت دان تھا جو دوربین کے موجد ہیں گلیلیو کے متعلق پوپ نے جب سنا کہ اس نے کاپرنیکی ۱۵۴۳ء کے نظام شمس کی تائید کی ہے تو اس کی مذہبی عدالت کے آگے پیش کیا وہاں اس نے ڈر سے توبہ کرلی لیکن ۱۶۳۲ء میں جب اس نے اپنی کتاب نظام عالم تصنیف کی تو پوپ نے اس کو جیل میں پھینک دیا وہ دس سال انتہائی تکلیف اٹھانے کے بعد

سنہ ۱۶۴۲ء میں فوت ہوا۔ ملاحظہ ہو معرکہ مذہب وسائنس صـ۲۳۷

۷۔ اٹلی کا مشہور فلسفی برونو کو جو فلسفہ ابن رشد کا پیرو تھا، عیسائی مذہبی عدالت نے اس کو سنہ ۱۶۰۰ء میں زندہ جلا دیا معرکہ مذہب وسائنس صـ۲۳۷

۸۔ ڈریپر نے دو اور علماء دیتی اور ہیردٹس کا ذکر کیا ہے کہ کلیسا نے ان کو زندہ جلا دیا۔

۹۔ دان دی ڈانیس سائنسدان کو کلیسا نے جیل میں ڈال دیا وہیں فوت ہوا بعد از مرگ اس کی لاش کو اسکی تصانیف کے انبار پر رکھ کر جلا دیا۔ معرکہ مذہب وسائنس صـ۲۴۲

یورپ کا تعصّب اور علمی خیانت

اس میں شک نہیں کہ یورپ نے ہزار سال ہم سے درس لیا اور اتنے سال ان کے ہاں ابن رشد ابن سینا، محمد بن زکریا رازی کی کتابیں داخل نصاب رہیں لیکن فطری تعصب کی وجہ سے وہ ہمیشہ مسلمانوں کے اس احسان کو چھپاتے رہے بلکہ علمی خیانت کا ارتکاب کرتے رہے ہماری ایجادات کو اُن یورپی سائنسدانوں کی طرف منسوب کیا جنہوں نے سب سے پہلے ہماری ایجادات کا تذکرہ کیا۔ تشکیلِ انسانیت مصنفہ برِلافٹ صـ۸۲

خیانت کا یہ حال ہے کہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں لفظ جیبر (جابر) کے تحت ایک ایسے مترجم کا نام دیا ہوا ہے جس نے مسلمان بانی علم الکیمیا جابر بن حیان کی کتاب الکیمیا کا لاطینی میں ترجمہ کیا اور اس کو اپنی تصنیف بنا لیا یہی حرکت قسطنطین افریقی مسیحی نے سنہ ۱۰۶۰ء میں کی کہ ابن الجزار کی کتاب زاد المسافرین کا لاطینی ترجمہ کر کے اس کو اپنی تصنیف ظاہر کیا (میراثِ اسلام آرنلڈ طب و سائنس)

موسیو لیبان نے اس حقیقت کا اعتراف کیا۔ کہتا ہے ہمیں اسلام اور پیروان اسلام سے تعصب وراثت میں ملا ہے ہمارے ذہنوں میں یہ بات راسخ کر دی گئی ہے کہ ہمارے تمام علوم وفنون کا ماخذ یونان ہے اور یورپ کی تہذیب میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں ہم میں سے بعض کو یہ بات کہتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے کہ ہماری ترقی اور تہذیب کا باعث ایک کافر قوم تھی تمدنِ عرب صـ۵۲۳

رابرٹ بریفالٹ لکھتا ہے یورپی مورخ مسلمان کو کافر کتا سمجھتا ہے اور اس کا احسان ماننے کو تیار نہیں یورپ کی احیائے نو کی تاریخیں برابر لکھی جارہی ہیں لیکن ان میں اُن عربوں کا ذکر موجود نہیں اس کی مثال ایسی ہے کہ ڈنمارک کی تاریخ میں ہیلمٹ کا ذکر نہ آئے ڈاکٹر روزبرن نے تو کمال ہی کر دیا کہ قرون وسطیٰ کی ذہنی ارتقاء پر دو جلدیں لکھیں اور اسلامی تہذیب کی طرف اشارہ تک نہیں کیا۔ تشکیلِ انسانیت صـ ۲۷۵ ۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ یورپ کی تہذیب کو صرف اسلامی تہذیب ہی شکست دے سکتی ہے جو عدوی اخلاق علمی اور جوشِ عشق انفرادی واجتماعی کی توانائیوں کے اسلحہ سے آراستہ ہے اس کے خلاف ہندو و بدھ مت تہذیب اوہام وخرافات کا مجموعہ ہے۔ اس لیے یورپ نے سب تہذیبوں کے برخلاف صرف اسلامی تہذیب کو نشانۂ تعصب بنایا۔ مسیحی اور یہودی دنیا اربوں روپیہ سالانہ خرچ کر کے مسلمانوں کی مرکزیت اور وحدت کو پارہ پارہ کرنے میں صرف کر رہی ہے تاکہ یورپ کی یہ حریف قوت ہمیشہ زبوں حالی خانہ جنگی، افتراق وتشتت میں مبتلا رہے اور مدت مدید سے اسی آزمودہ نسخہ کو یورپ ہماری تباہی کے لیے استعمال کر رہا ہے اور ہمیں ہوش نہیں ترک اور عرب کا افتراق اور پھر عربوں کا باہمی افتراق پاکستان مشرقی اور مغربی کا افتراق اور پاکستان میں پٹھان پنجابی سندھی اور بلوچی کا افتراق ۔ یہ سب یورپ کی استعماری سازش کے کارنامے ہیں ہم سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ یورپی تہذیب دم توڑ رہی ہے وہ ایک بے جان لاش ہو کر رہ گئی ہے اس کو زندگی کے چند لمحاتِ حیات نصیب ہوئے ہیں وہ صرف دولت اور اسلحے کے سہارے ملے ہیں اسلحہ اور دولت کا یہ انجکشن اس مریض نیم جان کی حقیقی صحت لوٹانے کے لیے کافی نہیں بلکہ اس انجکشن کی مثال ڈاکٹر کے اس انجکشن کی طرح ہے کہ جو مریض میں اتنی قوت پیدا کر دے کہ ہسپتال سے گھر تک سلامت پہنچ سکے یورپ کو یہ یقین ہے کہ مسلمانوں کی قوت کے دو سرچشمے

ہیں، ایک دینِ فطرت دوم وحدت و مرکزیت ۔ دونوں کے خلاف وہ برسرِ پیکار ہے۔
دینِ فطرت یعنی اسلام استعمار زراندوزی، مکر وفریب، لوٹ گھسوٹ، شہوانی اور غضبانی زندگیوں کی سیاہ کاریوں اور انسان کشی کو برداشت نہیں کرتا وہ انسانی جذبات وعواطف کو خالق کائنات کی ذات اور آخرت سے جوڑتا ہے اور تمام فکری اور عملی انتشار کو اسلامی فکر وعمل کی وحدت کے ذریعے ختم کرتا ہے اس لیے یورپ جس طرح مسلمانوں کی وحدت تباہ کرنے پر بیشمار دولت صرف کرتا ہے اسی طرح فتنۂ استشراق اور فتنۂ استغراب کے ذریعے اسلامی تعلیمات میں خود مسلمانوں کے ہاتھوں تحریف کی کوشش کرتا ہے تاکہ تحریف شدہ اسلام مسیحی دنیا کی طرح بے جان لاش بن کر رہ جائے۔

مذہب اور حکومت

مسیحی مذہب کی شروع سے یہ آواز مسیحی دنیا کے کان میں گونج رہی تھی جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو اور جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو۔

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی ساتی کہاں اس فقیری میں امیری

دوم یہ کہ اسلام میں پہلی صدی میں تمام علوم اور بالخصوص سائنسی تحقیقات کا آغاز ہوا اور تاریخِ اسلام میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں مل سکتا کہ ان تحقیقات پر مسلمانوں نے کبھی اعتراض کیا ہو یا کسی سائنسی نظریہ یا ایجاد پر کسی کو سزا ملی ہو یا کوئی سائنسی کتاب جلادی گئی ہو لیکن اسلام کے برخلاف مسیحیت نے علمی وسائنسی تحقیق کو موجب قتل جرم قرار دیا اور لاکھوں سائنسی کتابیں جلادی گئیں اور ہزاروں سائنسدانوں کو سائنسی تحقیق کے جرم میں قتل کیا گیا اور زندہ جلادیا گیا اب جدید علوم یورپ کے سامنے مسیحی دین تھا جو سائنس اور علوم کا دشمن تھا لہٰذا اس کے لیے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ دین کو حکومت سے خارج کر دے اور اس کی قوت کو کمزور کر دے صرف اس کا

نام باقی رہے جو استعماری مقاصد کے لیے مشنریوں کے ذریعے اس سے کام لیا جا سکے لیکن اسلام جو دینِ فطرت اور سائنس سے ہم آہنگ ہے اور اسلام ہی دنیا میں سائنسی علوم کا سب سے بڑا داعی ہے اور دنیا میں سائنس پھیلانے کا بڑا محرک ہے اور دینِ فطرت اور دین کامل ہونے کی وجہ سے زندگی کے ہر شعبے معاشرتی اخلاقی سیاسی اجتماعی معاشی کے لیے مشعل راہ ہے اور انسانی فلاحِ عمومی کا واحد ذریعہ ہے لہٰذا یہ حماقت ہے کہ مسیحیت کا قانون اسلام پر حاوی کیا جائے اور اسلام کو بھی اپنی بلندی سے اتار کر مسیحی سطح پر لاکر انسانیت کو اس کی روشنی سے محروم کیا جائے ایسا کرنا اسلام پر نہیں بلکہ انسانیت پر ظلم عظیم ہوگا جس کی تصدیق گزشتہ تاریخی واقعات کے علاوہ ہم قرآن کی اندرونی شہادت سے بھی پیش کرتے ہیں۔

یورپی اسلام دشمنی ایک یورپی نومسلم کے قلم سے

یورپ کی فطرت میں اسلام دشمنی

پیوست ہو چکی ہے اور مستقبل قریب میں اس کی کمی کے امکانات نہیں حال ہی میں لکھر کے ایک بھیدی کی انگریزی تحریر کا ترجمہ محمد معین خان بی اے اعتماشیہ نے شائع کیا جس کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں یہ یورپی نومسلم علامہ محمد اسد ہے جو مراکش میں مقیم ہے آپ لکھتے ہیں یورپ کو اسلام کے ساتھ مخالفانہ رویہ بھی ایک حد تک اپنے اسلاف سے ترکے میں ملا ہے مغرب اگرچہ تمام مذہبوں اور ثقافتوں کو یوں ہی ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتا ہے لیکن اسلام کے معاملہ میں اس کی اس ناپسندیدگی کے دامن مجنونانہ نفرت کی حدوں سے جا ملتے ہیں اسلام کے خلاف مغرب کی نفرت اور عداوت کی جڑیں نہ صرف اس کی عقل و ادراک ہی میں پیوست ہیں بلکہ جذبات و احساسات کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں اگرچہ یورپ کے لیے بدھ اور ہندو فلسفہ بھی قابلِ قبول نہیں تاہم ان فلسفوں کے بارے میں اس کا

ذہنی رویہ ہمیشہ متوازن رہا ہے لیکن جہاں اسلام پر اس کی نظر پڑی اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا اور ایک جذباتی تعصب قلب و دماغ پر چھا گیا یورپ کے عظیم المرتبت مستشرقین بجز چند مستثنیات کے تمام کے تمام ان تحریروں میں جو انہوں نے اسلام پر قلمبند کی ہیں انتہائی شدید تعصب میں ملوث نظر آتے ہیں ان کی تحقیقات سے بیشتر ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے ساتھ ایک علمی تحقیقاتی موضوع کا معاملہ نہیں کرتے بلکہ اس کو ایک ایسا ملزم سمجھتے ہیں جو حاکم عدالت کے سامنے کھڑا ہو، یہ مستشرقین کبھی بھی کھلے دل سے حقائق و واقعات کا کھوج نہیں لگاتے بلکہ ہر واقعہ مثلاً شہادت اور متعلقہ واقعات پر وقوف حاصل کرنے سے پہلے ہی اپنے تعصب کے زیر اثر ایک نتیجہ قائم کر لیتے ہیں اور پھر اسی نتیجہ سے اپنی کاروائی کا آغاز کرتے ہیں جس پر پہنچنے کا وہ پہلے ہی عزم کر لیتے ہیں اسلام اور اسلام سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کی جو مسخ شدہ تصویر ہمیں یورپ مشرقیاتی ادب میں دکھائی دیتی ہے وہ دراصل مستشرقین کے اسی مخاصمانہ طریق بکار کا نتیجہ ہے۔ واقعات کے توڑ موڑ کا یہ معاملہ کسی ایک ملک تک محدود نہیں بلکہ انگلستان، جرمنی، فرانس، ہالینڈ، غرض یورپ کے جس ملک میں یہ مستشرقین اسلام پر نظر کرم فرماتے ہوئے دکھائی دیں گے وہ سب کے سب اس حمام میں ننگے ہی ننگے نظر آئیں گے یہ تحریر بڑی لمبی ہے ہم خلاصہ پیش کرتے ہیں محمد اسد نومسلم انگریز سے ہماری ملاقات اور گفتگو بھی ہوئی ہے یہ تحریر الحق اکوڑہ مئی ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی ہے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ مغربی موثرات ہر جگہ اسلامی معاشرہ کی بنیادوں کو کھوکھلا اور اسے تباہ و برباد کرتے چلے جا رہے ہیں مستشرقین کے متعلق یہ حقیقت مجھے پہلے سے معلوم تھی اور ان کی تحریرات کو دیکھ کر یہ رائے ہم نے بہت پہلے سے قائم کی تھی۔ جس کی تائید اسد صاحب کے قلم سے بھی ہوئی یہ تحریر ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقے کی عبرت

حاصل کرنے کے لیے کافی ہے جو مستشرقین کی تحریرات سے اسلام سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اسلام اور سائنس

عیسائیت میں دین و دنیا کی تفریق ایک بنیادی عقیدہ ہے جو ہر عیسائی دل و دماغ میں اس وجہ سے راسخ ہوا کہ حضرت مسیحؑ نے فرمایا کہ جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو نیز مسیحی دین میں زیادہ تر بنی اسرائیل کی اصلاح پر نظر تھی جو دنیا کے لیے دین بگاڑ چکے تھے اس لیے یہ کہنا پڑا کہ دنیا دار خدا کی بادشاہت یعنی جنت میں داخل نہیں ہو سکتا جس کی وجہ سے دین و دنیا متضاد سمجھے گئے اس قدرتی بات لئے کہ حضرت مسیح نے نہ شادی کی نہ حکومت کی بلکہ ان دونوں چیزوں سے علیحدہ رہے پھر یہ کہ مسیحیت کے نام پر علمی اور سائنسی تحقیق کے جرم میں ہزاروں افراد کو موت کے گھاٹ اتارا گیا جس سے دین و دنیا کی تفریق کے عقیدہ کی جڑیں زیادہ مضبوط ہوئیں اور مسیحی دنیا اس تفریق کی بدولت جو کچھ مسیحی ہدایات تھیں ان سے محروم ہو کر مادی علوم اور الحادی نظریات پر اپنی زندگی استوار کرنے لگے جس کی وجہ سے وہ مادی ترقی کے باوجود اصلی انسانیت سے محروم ہو کر صرف غلام شہوت و غضب بن کر رہ گئے اور ان کی اس اخلاقی انحطاط نے پوری دنیا کو جہنم کدہ بنا دیا لیکن اسلام چونکہ دینِ فطرت ہے اور زندگی کی انفرادی اور اجتماعی تمام شعبوں کے متعلق ایک کامل اور مکمل دستور ہے اخلاقی عباداتی اعتقاداتی سیاسی معاشرتی خانہ داری جہاں بانی کے تمام ضوابط پر حاوی ہے اس کے متعلق تفریق دین و دنیا کا تصور ممکن نہیں البتہ وہ شخص ایسا تصور کر سکتا ہے کہ جو اسلام اور قرآن کے ابجد سے ناواقف ہو بجائے بندہ خدا ہونے کے بندہ یورپ بن گیا ہو اسلام دینِ فطرت کا نام ہے ﴿فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا﴾ اسلام کے قوانین انسانی فطرت کے مطابق ہیں جس پر اللہ نے انسان کو پیدا کیا اور

سائنس قوانینِ فطرت کی دریافت کا نام ہے جو کائنات غیر متبدل شکل میں محفوظ ہیں۔ لہٰذا ہر سائنس حقیقت اور صداقت دینِ فطرت کا عین تقاضا ہے اس کی ضد اور مخالف نہیں یہی وجہ ہے کہ چودہ سو سال میں مسلمانوں نے اسلام کے اس عطا کردہ تصور کے تحت نہ کسی سائنسی دریافت کی مخالفت کی اور نہ کسی سائنسی حقیقت کی دریافت پر کسی ایک فرد کو سزا دی گئی مسلم سائنس دانوں نے سائنس کے حقائق معلوم کیئے اور ایجادات بھی کیں اور یورپ نے ان سے سائنس سیکھی جیسے کہ ہم ثابت کر چکے ہیں لیکن نہ ان کی مخالفت کی گئی اور نہ سائنس دانی کی وجہ سے مسلم سائنس دانوں کے اسلامی عقائد میں فرق آیا یہ امر واضح دلیل ہے کہ سائنس اور اسلام میں توافق ہے۔ تخالف نہیں البتہ مسلم سائنس دانوں اور ان کے شاگرد یورپی سائنسدانوں کے بنیادی اصول میں فرق تھا جس کی وجہ سے اسلامی سائنس ان خرابیوں سے محفوظ رہی جو موجودہ یورپی سائنس کو لاحق ہوئیں۔ جس کی وجہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔

اب ہم کو صرف یہ دکھانا ہے کہ قرآن نے سائنس اور علوم کونیہ کی طرف انسان کو کس قدر ترغیب دی اور اُن قوانینِ قدرت جو مظاہر قدرت ہیں اور کائنات عالم میں موجود ہیں کی طرف کس قدر پُرزور طریقے سے توجہ دلائی اور اسی توجہ نے مسلمانوں میں بے شمار سائنسدان پیدا کیے اور ان کی وجہ سے یورپ بھی سائنس سے آشنا ہوا۔ قدیم اور جدید دونوں کے سائنسی قوانین میں فرق نہیں تھا اور اسلامی سائنس اور یورپی سائنس اس لحاظ سے ایک ہی ہیں کیونکہ دونوں کا تعلق قوانین قدرت کی دریافت سے ہے لیکن ہر سائنس کے لیے ایک بنیادی عقیدے کی ضرورت ہے جس کے پس منظر میں سائنس کی حقیقی نشوونما ہو سکتی ہے اور سائنس کے حسن کو اسی عقیدہ سے فروغ حاصل ہو سکتا ہے اسی بنیادی عقیدہ کے لحاظ سے سائنس کی دو قسمیں بن جاتی ہیں ایمانی سائنس اور الحادی سائنس۔

ایمانی سائنس

ایمانی سائنس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ خدا کے عقیدہ توحید پر مبنی ہو کہ کائنات کے اندر جس قدر قوانین حکیمانہ کارفرما ہیں وہ خدائے کائنات نے کائنات میں رکھے ہیں اور انسان کے دماغ میں اسی خدا نے وہ قوتِ دماغی و فکری بھی رکھی ہے کہ وہ تجربہ اور استقراء سے ان قوانین کو دریافت کر کے انسان ان کو مفید مقاصد میں استعمال کرے کائنات یا مادہ کائنات ان قوانین کا موجد نہیں بلکہ وہ ان قوانین کا مظہر اور ظرف ہے۔ ظرف اور چیز ہے اور علت و سبب اور چیز۔ رحم مادر بچے کے لیے ظرف و مظہر ہے۔ موجد نہیں۔ رحم مادر میں وہ علم و شعور کہاں جو بچے کے اعضاء اور ان کی قوتوں کو پیدا کر سکے اسی بنیادی عقیدہ خدا کے تحت جس قدر قوانین سائنس کو سائنسدان دریافت کرے گا اسی قدر سے اس کا ربط اور تعلق بڑھتا جائے گا اور ان قوانین کی حکمتوں سے خدا کی عظمت اس کے دل پر نقش ہوتی جائے گی اور سائنسدان کا دل بھی خدا کی عظمت و محبت سے منور ہو گا اور مزید دریافت کے لیے اس میں مزید جوشِ عمل پیدا ہو گا اور جب وہ یہ محسوس کرے گا کہ ان قوانین میں باوجود تنوع و تکثر کے ایک وحدت پائی جاتی ہے مثلاً فلکیات ارضیات، نباتات، حیوانات، عناصر حیاتیات اور نفسیات کے تمام قوانین باہم دگر اس قدر مربوط اور ایک ہی مقصد کی طرف متوجہ معلوم ہوتے ہیں کہ کسی وقت میں بھی ان قوانین میں تصادم و ٹکراؤ نہیں ہو سکتا تو اس وحدت سے وہ اللہ کی وحدت کا نتیجہ اخذ کرے گا کہ کائناتِ عالم میں ایک ہی ذات کارفرما ہے اور یہی توحید جو سائنس کے راستے سے حاصل ہو سکتی ہے مسلم سائنسدانوں کی سائنس بھی ایمانی سائنس تھی جس کی وجہ سے وہ الحاد بد اخلاقی فسق و فجور ظلم و ستم سے محفوظ تھے یورپ کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ اس نے عقیدہ خدا کو سائنس سے الگ کر دیا اور اسی بنیادی عقیدہ کی جگہ مادہ و حرکت، مادہ کو انہوں نے سائنس کا پس منظر اور بنیادی عقیدہ قرار دیا۔

الحادی سائنس

جس کی وجہ سے الحادی سائنس ظہور میں آئی اور اس نے مفید مصنوعات کے ساتھ مہلک اور تباہ کن اسلحہ اور اخلاق حمیدہ کی مفاد پرستی اور صداقت اور سچائی کی جگہ نفاق جھوٹ مکر وفریب دغا بازی اور دھوکہ دہی عدل کی جگہ ظلم اور خونریزی کی تباہ کاریوں کو جنم دیا جس نے سائنس کی افادیت کو ختم کیا اور بے سائنس دنیا میں جو امن و انصاف اور عدل اور انسانی شفقت موجود تھی سائنس کی دنیا میں اس کا نام ونشان بھی باقی نہ رہا۔

قرآن اور سائنس

سائنسی قوانین کی دریافت عقل استقرائی اور تجربی کاوشوں سے کرتی ہے اسیلئے جب تک انسانی عقل کو حریت اور آزادی نصیب نہ ہو وہ سائنس کی طرف متوجہ ہو سکتی ہے اور نہ سائنسی قوانین کی دریافت کا سلسلہ جاری ہو سکتا ہے اور نہ سائنس کا علم وجود میں آسکتا ہے اور سائنس کے تمام مرحلے بند ہو جاتے ہیں سائنس کے چار مرحلے ہیں ۱۔ تجربہ ۲۔ مشاہدہ ۳۔ اخذ نتائج ۴۔ تنظیم نتائج، سائنسدان تجربہ کے ارادہ سے وہ یا خود کائنات کے حالات کے قریب جاتا ہے یا اپنے کارخانہ میں مصنوعی طور پر حالات و واقعات پیدا کر کے تجربہ کرتا ہے اور تجربہ کا مقصد مشاہدہ و مطالعہ حالات ہوتا ہے پھر ان حالات سے نتیجہ اخذ کرتا ہے پھر ان نتائج کو منظم کر کے ان کو ایک سائنسی قانون اور ضابطے کے قالب میں ڈالتا ہے اس تمام کاروائی کے لیے عقل کی آزادی اور سائنسی حقائق کی دریافت پر کڑی پابندی تھی اور سائنسی دریافت پر سائنسدان مجرم گردانا جاتا تھا اور اس کو شدید سزا دی جاتی تھی لہٰذا پولس اور سینٹ پال والی مسیحیت جو یورپ کا مذہب تھا اسلام کے داخلہ یورپ کے زمانہ سے قبل صدیوں تک سائنس سے محروم رہا۔ سپین سسلی اور اٹلی کی راہ سے جب اسلام وہاں داخل ہوا تو لوتھر جیسے اشخاص پیدا ہوئے اور یورپ نے مسلمان سائنسدانوں سے سائنس حاصل کرنا شروع کیا۔ مصنوعی مسیحیت

میں عقل اور سائنس پر پابندی اور اسلام میں آزادی کا بڑا سبب یہ تھا کہ تقریباً
ایک دو صدیوں کے بعد اصلی مسیحیت باقی نہیں رہی پولس یہودی اور سینٹ پال
نے نئی مسیحیت بنائی اور اس کو اصلی مسیحیت قرار دیکر پیش کیا جس کے بنیادی عقائد
عقل کے خلاف تھے مثلاً یہ کہ مسیح انسان کامل بھی ہے اور اللہ کامل بھی، اور یہ
کہ باپ بیٹا اور روح القدس تین بھی ہیں اور ایک بھی یا یہ کہ مسیح کے مصلوب ہونے
سے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں کیونکہ خدا نے مسیح کی شکل میں مصلوب ہو کر تمام مسیحیوں
کے گناہوں کی سزا خود بھگت لی اور مسیح نجات پا گئے ان بنیادی عقائد کو وہی مان
سکتا ہے جو عقل سے دست بردار ہو اس لیے مسیحیت محرّفہ کے لیے عقل پر پابندی
لگانا ضروری ہوا تاکہ ان عقائد کی نامعقولیت کا راز افشا نہ ہو لیکن مسیحیت کے برخلاف
اسلام نے بنیادی عقائد کے اثبات میں مثلاً وجود باری تعالیٰ۔ صفات باری، توحید
باری، مسئلہ نبوت، مسئلہ معاد جو اسلام کے بنیادی عقائد ہیں، سائنسی دلائل سے
کام لیا ہے اور سائنسی دلائل کی طرف انسان کو متوجہ کر کے ان مسائل کی صداقت ذہن
نشین کرائی جس کی تحقیق اپنی جگہ پر آئے گی۔

قرآن اور آزادی عقل

قرآن نے اپنے ماننے والوں کو متوجہ کیا کہ وہ
عقل سے کام لے کر اس کو استعمال کرے
صرف سائنس اور کوئی علوم میں نہیں بلکہ دینی علوم وحقائق میں بھی عقل سے کام لیں
تاکہ ان کی معقولیت ذہن نشین ہو سکے یہی عقل توجہ دینی اور دنیوی علوم کا سرچشمہ
بنی اور اسی سے دونوں علوم کے دروازے کھلتے گئے سورہ رعد میں ارشاد ہے
اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ یعنی قرآن کے گزشتہ بیان کردہ
مضامین میں دلائل ہیں اس قوم کے لیے جو عقل وفکر کو کام میں لاتی ہو سورۃ
مومنون میں ہے اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ یعنی ان مضامین

میں دلائل ہیں اس قوم کے لیے جو عقل استعمال کرتی ہے۔ اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (سورۃ یوسف) ہم نے قرآن اتارا عربی زبان میں تاکہ تم عقل سے کام لے کر اس کو سمجھو۔ ایسی بیسیوں آیات قرآن میں موجود ہیں جن میں عقل کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ قرآنی حقائق کو عقل کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں ان آیات کے ذریعہ عقل کے جمود اور تعطل کو توڑنا مقصود تھا تاکہ وہ دینی اور سائنسی حقائق جو مظاہر قدرتِ الٰہیہ ہیں دونوں کو عقل کے نور سے سمجھ لیں کیونکہ خدا کا قانونِ شریعت اور قانونِ قدرت باہم مربوط ہیں اور ایک دوسرے کے موید ہیں، مخالف نہیں علوم کونیہ اور سائنسی حقائق کی طرف بھی دینی حقائق کے بیان کے ضمن میں قرآن نے خصوصی توجہ دلائی ہے عمومی رنگ میں بھی اور خصوصی انداز میں بھی یہاں تک کہ قرآن نے سائنسی علوم کے اہم شعبوں کی طرف بھی اجمالی رنگ میں خاص توجہ دلائی ہے اور تفصیلات اس لیے بیان نہیں کی کہ قرآن کے اصلی موضوع بحث وہ دینی حقائق ہیں جو سائنسی سرحد سے خارج ہیں اور جو موافق عقل ہونے کے باوجود عقل کی دسترس سے بالاتر ہیں برخلاف سائنسی حقائق کے کہ وہ عقل حواس اور تجربے سے معلوم ہو سکتے ہیں صرف عقل کو ان کی طرف متوجہ کرنا ضروری تھا تاکہ خالق کائنات نے کائنات میں نفع انسانی کے لیے فوائد و منافع کا جو بے پناہ ذخیرہ رکھا ہے سائنسی تحقیق کے ذریعہ انسان اس سے استفادہ کر کے اللہ کی معرفت اور محبت اور عظمت دل پر نقش کر کے اس کا ممنونِ احسان ہو۔

عمومی سائنس قرآن حکیم نے جہاں مومنین کا یہ وصف بیان کیا ہے کہ وہ اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے خدا کا ذکر کیا کرتے ہیں وہاں ان کا یہ وصف بھی بیان کرتا ہے کہ وہ کائنات کی تخلیق پہ غور و فکر بھی کرتے ہیں جس میں کائناتی اور سائنسی علوم کی ترغیب پائی جاتی ہے۔ اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا

وَعَلٰی جُنُوْبِہِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ہٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (آل عمران) وہ یاد کرتے ہیں اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور کروٹ پر لیٹے اور فکر کرتے ہیں آسمان اور زمین کی پیدائش میں، کہتے ہیں اے رب ہمارے تونے یہ عبث نہیں بنایا تو سب عیبوں سے پاک ہے۔ہم کو بچا دوزخ کی آگ سے۔ اس آیت میں تنزلی سائنس سے ہٹا کر انسان کو ترقی یافتہ سائنس کی طرف متوجہ کیا گیا وہ یہ کہ سائنس مظاہر قدرتِ الٰہیہ کا مطالعہ و مشاہدہ ہے اس لیے مطالعہ کے نتیجہ میں صرف دنیاوی فوائد پر قناعت نہ ہونی چاہیے بلکہ مصنوعات کے اندر حکیمانہ قوانین کی دریافت سے معرفت صانع کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے تاکہ سائنسی کاوشیں یادِ الٰہی اور یادِ آخرت پر منتج ہوں اور سائنس کے ذریعہ جسم و روح دونوں کی ترقی کا سامان مہیا ہو سکے۔ صرف مادی اور جسمانی فوائد سے عالمی خوشحالی پیدا نہیں ہو سکتی۔ بقول اکبر ؎

ترقی مستقل وہ ہے جو روحانی ہوائے اکبر
اڑا جو ذرہ عنصر وہ پھر سوئے زمین آیا

یہ عجیب بات ہے کہ یہ فطری ضابطہ ہے کہ فعل و مصنوع کی عظمت سے فاعل اور صانع کی عظمت کا اثر دماغ پر پڑتا ہے اچھی تصنیف سے عظمتِ مصنف اچھی کتابت سے کاتب کی بلندی اچھے شعر و عمارت سے شاعر و معمار کی خوبی اور عقیدت دل پر نقش ہوا کرتی ہے لیکن بیسویں صدی کی تنزلی اور الحادی سائنس اس فطری نتیجہ کے خلاف خدا سے دوری کا سامان مہیا کرتی ہے، اور سابق جو کچھ عظمت اور محبتِ الٰہی دل میں ہوتی ہے وہ بھی ختم ہو جاتی ہے حسب ارشاد قرآن وَاَضَلَّہُ اللّٰہُ عَلٰی عِلْمٍ۔ کہ علم الیسوں کے لیے بجائے معرفت الٰہی کے گمراہی کا سامان بن جاتا ہے اس لیے قرآن نے معرفت الٰہی کے ضمن میں مطالعۂ مخلوقات

پر زور دیا ہے لیکن اس کے ساتھ سائنس کو مسلمان کرنے کا سامان بھی فراہم کیا، سائنس
اور تحقیقِ کائنات کو صرف دنیاوی فوائد کا ذریعہ مت سمجھو بلکہ کائنات اور کائناتی تحقیقات
کو آئینہ یادِ الٰہی آخرت بناؤ تاکہ دنیاوی فوائد کے ساتھ تم میں روح کی پاکیزگی اور اپنے
خالق سے ربط بھی پیدا ہو فوائد کائنات نتائج ہیں خدا کے حکیمانہ قوانین کے اور
مادہ صرف ان کے ظہور کا آلہ ہے نہ کہ فاعل اور خالق، اندھا اور مردہ مادہ ان
نتائج کو نہیں پیدا کرسکتا اَفَمَنْ یَّخْلُقُ کَمَنْ لَّا یَخْلُقُ۔ (قرآن) کیا جو پیدا کرنے
والی ذات ہے اس کے ساتھ وہ چیز برابر ہوسکتی ہے جو تخلیق سے عاجز ہو۔ اس
لیے یہ ضروری ہے کہ سائنس کا طرزِ تعلیم ایمانی سانچے میں ڈالنا ضروری ہے کہ نتائج
کا انتساب اصل فاعل یعنی خالق کو کر دیا جائے اور مادہ صرف سبب کے درجہ
میں رکھا جائے تاکہ سائنس ایمان خیز ہو نہ کہ الحاد انگیز، عمارت کی تخلیق معمار سے
ہے نہ کہ اس کے مادہ اور ملبہ سے بقول عارف جامی ؂

چو بینی کار اور در کارگر آر
قیاس کارگر از کار بر دار

اور بقول سعدی شیرازی ؂

برگ درختانِ سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا کا معنی ہے کہ مخلوقات کی تخلیق عبث نہیں
بلکہ دینوی فوائد اور معرفتِ خداوندی اور معرفت آخرت کا ذریعہ ہے۔

۲۔ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ
تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ
الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ

الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (سورہ بقرہ ج ۲)

ترجمہ: بیشک آسمان و زمین کے پیدا کرنے میں اور رات دن کے بدلتے رہنے میں اور جہازوں میں جو لے کر چلتے ہیں سمندر میں کام کی چیزیں اور پانی میں جس کو اتارا اللہ نے آسمانوں سے پھر جلایا اس سے زمین کو اس کے مرنے کے پیچھے اور پھیلائے اس میں سب قسم کے جانور اور بادل جو تابعدار ہیں اس کے حکم کا درمیان آسمان اور زمین کے بیشک یہ سب چیزیں نشانیاں ہیں عقلمندوں کے لیے۔

اس آیت میں عقل کو دعوت دی گئی ہے کہ کارخانہ حکمت کا مطالعہ کرے۔ سماویات، ارضیات، زمانیات، لیل و نہار یعنی رات دن کی حکیمانہ تبدیلی کا اور بحریات اور کائنات جو میں ہواؤں کے ادل بدل کا بادل کی تنظیم و تنسیق کا بارش اور نباتات و حیوانات کا، کیا ایسا منظم کارخانہ بے شعور اور اندھے مادہ کے وجود میں آ سکتا ہے، یا مادہ اس کا تصور کر سکتا ہے، اور قائم رکھ سکتا ہے اس میں مندرجہ بالا علوم سائنس کی طرف توجہ دلائی گئی لیکن ایمانی اور ارتقائی رنگ میں اس سے خالق کائنات کی ذات صفات اور حکمتوں اور اس کی بے پناہ قدرت کا سبق سیکھ کر اس کی طرف جھکو یہی وہی بلند سائنس ہے جو انسان کو خالق کائنات کی بلندی تک رسائی کا موجب ہے اور مادہ کی پستی سے اشرف المخلوقات کو اٹھا کر حقیقت کائنات کی اصلی روح یعنی ذات خداوندی تک پہنچاتی ہے

نباتاتی سائنس

وَهُوَ الَّذِي أَنشَأَ جَنَّاتٍ مَّعْرُوشَاتٍ وَغَيْرَ مَعْرُوشَاتٍ وَالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا أُكُلُهُ وَالزَّيْتُونَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ كُلُوا مِن ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ (انعام ج ۸) ترجمہ: اس نے پیدا کیے باغ جو ٹٹیوں پر چڑھائے جاتے ہیں اور جو ٹٹیوں پر نہیں چڑھائے جاتے

اور کھجور کے درخت اور کھیتی کہ مختلف ہیں ان کے پھل اور زیتون اور انار ایک دوسرے
کے مشابہ اور جداجدا کھاؤ اس کے پھل میں سے جب پھل آئے اور ادا کرو ان کا حق جس
دن ان کو کاٹو، اور بے جا خرچ نہ کرو اللہ کو ناپسند ہیں بے جا خرچ کرنے والے۔

اس آیت میں اللہ نے علم نباتات کی طرف توجہ دلائی ہے جو مظہر قدرت الہی ہیں
پانی اور مٹی ایک ہے ان سے اللہ نے رنگ برنگ کے پودے اور میوے پیدا کیے
جن کے رنگ اور شکل اور مزے مختلف ہیں جو اللہ کے عظیم حکمتوں کی معرفت کے خزانے
ہیں چونکہ یہ خدا کی قدرت کی کارستانی ہے اس لیے اللہ نے زمینی پیداوار کے سلسلے
میں دو پابندیاں لگادیں ایک منفی کہ اس کو بے جا صرف نہ کرو اور ایک مثبت کہ ان
میں اللہ کی طرف سے جو محتاجوں کا حق ہے اس کو پہلے دن ادا کر کے ان کو پہنچادو

انسانی سائنس

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ (سورہ مومنین پارہ ۱۸)

ترجمہ: ہم نے بنایا آدمی کو منتخب مٹی سے پھر ہم نے رکھا اس کو پانی کی بوند ایک جمے
ہوئے ٹھکانے میں پھر بنایا اس بوند کو لہو جما ہوا، پھر بنایا اس سے گوشت کی بوٹی۔ پھر
بنایا اس گوشت سے ہڈیوں کو، پھر پہنایا ان ہڈیوں پر گوشت پھر بنایا اس کو ایک
نئی صورت یعنی روح حیات پھونک کر ایک جیتا جاگتا انسان بنایا۔ سو بڑی برکت ہے
اللہ کی جو سب سے بہتر بنانے والا ہے جس نے موزوں صورت اور مرتب اور
مناسب قوتیں ان میں رکھیں یعنی انسان کا یہ وجود اس کا ذاتی نہیں بخشش قدرت ہے
چنانچہ موت آکر سب نقشہ بگاڑ دیتی ہے ـــــ اس آیت میں اللہ نے علم الانسان
اور علم الجنین کی طرف توجہ دلائی جو اللہ کی قدرت و حکمت کا آئینہ ہے۔

فضائی اور جوّی سائنس

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْ بَرَدٍ فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ (سورہ نور پارہ ۱۸)

ترجمہ : تو نے دیکھا کہ اللہ ہانک لاتا ہے بادل کو پھر ان کو ملا دیتا ہے پھر ان کو رکھتا ہے تہ بر تہ پھر تو دیکھے مینہ نکلتا ہے اس کے بیچ سے اور اتارتا ہے آسمان سے جو اس میں بادل کے پہاڑ ہیں، اولوں کو پھر وہ ڈالتا ہے جس پر چاہے، قریب ہے کہ اس کی بجلی کی روشنی لے جائے نگاہوں کو، اس میں دھیان کرنے کی جگہ ہے صاحب نظر لوگوں کو۔

اس آیت میں کائنات جو اور فضائی مظاہر قدرت کی طرف توجہ دلائی گئی کہ اللہ نے انسان، حیوانات اور نباتات کی زندگی کے لیے کیا پُرحکمت نظام قائم کیا ہے جو فضا میں ہے اور انسانی قدرت سے بالاتر ہے سائینسی تحقیق کے مطابق اگر پاکستان و ہندوستان پر صرف دس منٹ مصنوعی بارش برسائی جائے تو پانی کو بخارات میں تبدیل کرنے کے لیے نوے کھرب ٹن کوئلہ خرچ ہو گا ایک ٹن کی قیمت ساٹھ روپے ہے ۔ اس لحاظ سے مجموعی قیمت ۵۴ پدم ہے اور یہ رقم دونوں ملکوں کی سالانہ آمدنی سے سولہ ہزار گنا زیادہ ہے۔

حیوانی سائنس

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى اَرْبَعٍ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۔ (سورہ نور پارہ ۱۸)

ترجمہ : اللہ نے بنایا ہر پھرنے والے جاندار کو کوئی چلتا ہے پیٹ پر، کوئی چلتا

ہے دو پاؤں پر کوئی چلتا ہے چار پاؤں پر۔ بناتا ہے اللہ جو چاہتا ہے بیشک اللہ ہر چیز کر سکتا ہے۔

اس آیت میں علم الحیوانات کے سائنسی علم کی طرف اشارہ ہے کوئی پیٹ پر چلتا ہے مثلاً سانپ اور مچھلی کوئی دو پاؤں پر مثلاً انسان اور پرندے، کوئی چار پاؤں پر جیسے مویشی اور درندے اللہ چاہیے تو زیادہ بھی بنا سکتا ہے۔

جماداتی و معدنیاتی سائنس

وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ۔ ترجمہ: ہم نے فولاد پیدا کیا ہے آلات جنگ و دیگر نفع بخش مصنوعات جس سے تیار ہو سکتے ہیں اس میں علم المعدنیات اور اس کے فوائد کی طرف اشارہ ہے لوہا چونکہ سب معدنیات میں سے کار آمد ہے اس لیے اس کا خصوصی طور پر ذکر ہے۔

ان مذکورہ آیات میں قرآن نے اپنے اصل موضوع اثبات الوہیت و توحید کو ذہن نشین کرنے کے لیے جن کائنات کو بطور دلیل پیش کیا وہ سب سائنسی کائنات ہیں جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ معرفتِ خداوندی جو اسلام کی بنیاد ہے اس کے لیے معرفت کائنات کی ضرورت ہے معرفتِ کائنات کا تو سطحی علم صرف مشاہدہ سے حاصل کیا جا سکتا ہے لیکن کائنات کی گہری حکمت اور عمیق معرفت کے لیے کائنات کا تجرباتی اور استقرائی علم کا حاصل کرنا ضروری ہے۔ جس کو سائنس کہا جاتا ہے سائنس کے تمام شعبوں کی طرف مذکورہ آیات میں توجہ دلائی گئی ہے فلکیات، فضائیات، جوّیات معدنیات، نباتات، حیوانات انسان جو تقریباً اصولی رنگ میں تمام شعبہ ہائے سائنس پر حاوی ہے کل شعبہ ہائے سائنس ان چھ اقسام سائنس میں درج ہیں اور انہی کی جزئیات ہیں۔

سائنس کے لیے بنیادی عقیدہ

اس میں شک نہیں کہ سائنس کے لیے بنیادی عقیدہ کی ضرورت ہے جس کی بنا پر سائنسی ضوابط کو مرتب کیا جائے کمیونسٹ ملکوں کی سائنس اشتراکی عقیدہ پر مبنی ہے اور پوری سائنس کا محرک یہی عقیدہ ہے اور زندگی کے تمام اعمال پر اسی عقیدہ کا رنگ حاوی ہے یورپ اور مغربی بلاک کی سائنس بھی ایک بنیادی عقیدے پر مبنی ہے۔ وہ یہ ہے کہ خدا کو ماننے کے باوجود مغربی بلاک نے سائنسی دنیا سے عقیدۂ خدا کو خارج کر دیا ہے اور تمام سائنسی تحقیقات کو مادہ اور حرکت مادہ سے وابستہ کر دیا ہے۔ دونوں بلاکوں یعنی کمیونسٹ بلاک اور مغربی بلاک نے اگرچہ حقیقی خدا کو سائنس سے خارج کر دیا ہے لیکن فی الحقیقت ہر ایک نے ایک مصنوعی خدا عقیدہ کو سائنس کے لیے سنگ بنیاد قرار دیا جس سے واضح ہو گیا کہ سائنس کے لیے ہر حال میں ایک بنیادی عقیدہ کی ضرورت ہے خواہ وہ عقیدہ حقیقی خدا کو ماننے کا عقیدہ ہو یا مصنوعی خدا ماننے کا۔ کمیونسٹ بلاک کا مصنوعی خدا کارل مارکس یا اس کی اشتراکیت ہے اور مغربی بلاک کا مصنوعی خدا مادہ اور حرکت مادہ ہے اگرچہ وہ خدا کو مانتے ہیں لیکن کائنات سے انہوں نے خدا کو بے دخل قرار دیا ہے اور تمام کائنات ایٹمی ذرات یا برق پاروں اور ان کی حرکت کے مظاہر ہیں یہی بنیادی غلطی ہے جس نے انسان کو ایمانی سائنس سے محروم کر دیا الحادی سائنس کے جہنم میں دھکیل دیا ہے اور اسی بنیادی عقیدہ کی غلطی سے سائنس انسان کے لیے مہلک اور تباہ کن چیز بن گئی ہے اور اس کی تباہ کاری میں مزید اضافے کی سرگرمیاں جاری ہیں اس لیے انسان کا فرض ہے کہ وہ موجودہ سائنس کی تشکیل جدید کرے تاکہ الحادی سائنس ایمانی سائنس میں تبدیل ہو کر اس کے زہر کو تریاق میں تبدیل کر دیا جا سکے۔

موجودہ سائنس کی غلط بنیاد اور اس کی اصلاح

سائنسی کارروائیوں کو مصنوعی خدا کے عقیدہ سے وابستہ کرنا اور حقیقی خدا سے ان کو الگ کرنا خطرناک غلطی ہے کیونکہ اسامی عقیدہ اس صورت میں سائنس کا مخدوم اور محرک بن جاتا ہے اور سائنسی قوانین اسی عقیدہ کے خادم بن جاتے ہیں اب ظاہر ہے کہ مصنوعی خدا اشتراکیت ہو۔ یا مادیت ہو۔ ایک زمینی اور سفلی حقیقت ہے حقیقی خدا کی طرح ایک پاکیزہ بین العالمی حقیقت نہیں اس لیے اس غلط اساس پر جس سائنس کی بنیاد رکھی گئی ہو وہ بھی سفلی اور زمینی مقاصد کو بروئے کار لائے گی اور سائنس کی تمام قوت اس قوم کو سربلند کرنے اور اس کے علاوہ دیگر اقوام کو ذلیل اور کچل دینے میں صرف ہو گی اور بلند اخلاق اور حقیقی عدل و انصاف جس کا سرچشمہ حقیقی خدا کا عقیدہ ہے وہ فنا ہو جائے گی اور دنیا جھوٹ، مکر و فریب، نفاق اور مفاد پرستی، خود غرضی کا جہنم کدہ بن جائے گی، اور ہر قوم اپنی مادی اغراض اور مفادات کی تکمیل کے لیے سائنس کے اسلحہ سے مسلح ہو کر دیگر اقوام پر غلبہ پانے اور ان کو تباہ کرنے میں ہر پابندی سے بے نیاز ہو کر کمزور قوموں پر چڑھ دوڑے گی اور دنیا کسی وقت بھی ظلم اور انسان کشی خونریزی اور عالمی فساد کے محبوب مشغلہ سے فارغ اور خالی نہ ہو سکے گی یہاں تک کہ سائنس اپنی آخری تباہ کن قوت جوہری بم استعمال کر کے انسان، انسانی آبادی۔ انسانی تہذیب و تمدن کو خاکستر بنا کر دم لے گی گزشتہ دو عالمی لڑائیاں اور افریقہ ایشیا و یورپ میں بیسیوں چھوٹی لڑائیاں جو اس وقت تک جاری ہیں اور عالمی لڑائی کا سبب بن سکتی ہے یہ سب الحادی سائنس کے مہلک نتائج ہیں جو سب کے سامنے ہیں اور سائنس کے غلط بنیادی عقیدہ کے ثمرات ہیں جن کی مستقبل میں اصلاح کی امید بہت کم ہے جہالت سے پیدا شدہ گمراہی کا ازالہ آسان ہے لیکن تعلیمی اور غلط بنیاد پر قائم کردہ سائنسی

علوم سے پیدا شدہ گمراہی ناقابل علاج ہے یہ صرف ہمارا خیال نہیں بلکہ یورپ کے مدبر افراد بھی اس کو محسوس کرتے ہیں جدید گمراہیاں الحادی سائنس کی وجہ قدیم گمراہیوں سے بہت زیادہ ہیں دورِ جاہلیت اس دورِ تہذیب سے بلحاظ امن اخلاق انصاف محبت انسانی کے زیادہ بلند تھا۔

۱۔ برف فالٹ لکھتا ہے ہماری موجودہ تہذیب اپنے قومی معاشی عائلی اخلاقی مذہبی قومی نظام کے ہر شعبے میں حماقت جہالت اور فریب کا مستقل مظاہرہ ہے۔

۲۔ مارشل پتیاں نے ۲۱ جون ۱۹۴۰ء کی شام ۹½ بجے ریڈیو پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے پاس گزشتہ جنگ عظیم کی نسبت اسلحہ جنگ افواج و دیگر وسائل بہت زیادہ تھے حلیف سلطنتیں بھی تعداد میں کافی تھیں اور پھر ہم ہار گئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس شکست کی وجوہات کیا ہیں وہ یہ ہیں کہ ہمیں شکست ہٹلر نے دی بلکہ اپنے نوجوانوں نے دی جن کا کام کھانا پینا اور عیش اڑانا تھا۔ بعض کا خیال ہے کہ ہماری شکست کے اسباب تین "ڈال" ہیں۔ ڈرنک، ڈانس ڈنر۔

۳۔ برنڈ لکھتا ہے سائنسی تہذیب نے قدیم اقدار اور اخلاق ختم کیے اور اس خلا کو اور کسی چیز نے پر نہیں کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کے ایک بڑے حصے پر تعمیری قوتوں کی بجائے تخریبی قوتیں چھا چکی ہیں

۴۔ ڈاکٹر برہنٹر لکھتا ہے اسی سائنسی تہذیب کے دور میں انسانی اقوام کی حالت بالکل عہد طفولیت کی سی ہے جس میں بچہ ہر اس پابندی کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے جذبات کے راستے میں حائل ہو اسی حالت کے متعلق اقبال مرحوم نے درست کہا ہے کہ تہذیب جدید کے علمبردار کی زبان پر نعرہ امن

ہے لیکن الحادی سائنس جس دل ودماغ کی تعمیر ہوئی وہ جنگ اور خونریزی کے لیے بے تاب ہے ؎

گرگے اندر پوستین برہ | ہر زمان اندر تلاش برہ
مشکلات حضرت انسان از دست
آدمیت را غم پنہاں از دست

یورپ بھیڑیا ہے جس نے بھیڑ کا لباس پہن رکھا ہے اور ہر وقت کمزور قوم یعنی بھیڑوں کے شکار کرنے کی تلاش میں ہے پھر اللہ سے مکالمہ میں شکل میں کہتا ہے کہ خدا نے کہا ہے

گفتم کہ جہانِ ما آیا بتو می سازد | گفتم کہ نمے سازد گفتند کہ برہم زن

کہ موجودہ تہذیب کی دنیا تجھے موافق ہے میں نے کہا کہ نہیں، کہا کہ اس کو ملیا میٹ کردو یہاں تک کہ ایک شعر میں صاف کہا ؎

تا تہ و بالا نہ گردد ایں نظام
دین و دانش جملگی سودائے خام

وفات سے قبل چار بج کر ۱۰ منٹ ۱۹۳۸ء کو اقبال نے اسلامی سائنس کی ترغیب ان اشعار میں دی اور پھر وفات پا گئے۔

حکمت اشیاء فرنگی زادہ نیست | اصل او جز لذت ایجاد نیست
نیک اگر بینی مسلمان زادہ است | ایں گہر از دست ما افتادہ است
چوں عرب اندر اروپا پاکشاد | علم و حکمت را بنا دیگر نہاد
دانہ آں صحرا نشیناں کاشتند | حاصلش افرنگیاں برداشتند
ایں پری از شیشۂ اسلاف ماست | باز صیدش کن کہ او از قاف ماست

خلاصہ یہ ہے کہ سائنس کی بنیاد عرب مسلمانوں نے ڈالی اور ایمانی بنیاد پر ڈالی

لیکن فائدہ یورپ نے اٹھایا جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مسلمان قبل از استفادہ
غیر اقوام کے غلام بن گئے اور اپنی خانہ جنگی کی وجہ سے انہوں نے امن اور
اپنے اقتدار کو کھو دیا اس لیے ان کو سائنس سے استفادے کی فرصت نہ
مل سکی اور دیگر اشیا کی طرح ان کے سائنسی ورثہ پر بھی دشمن نے قبضہ کر لیا۔

باب دوم

خدا تعالیٰ کے وجود پر سائنسی

دلائل

اسلام کے بنیادی اصول تین ہیں۔ ۱۔ ثبوت باری اور توحید ۲۔ نبوت ۳۔ معاد اور مجازات اعمال ۔ ان تینوں امور پر ہم بحث کریں گے کہ کیا ان میں سے کوئی بنیادی عقیدہ ایسا ہے جو سائنس اور قوانینِ قدرت کے خلاف ہے ۔

۱۔ خدا کا ثبوت تاریخی اور فطری حیثیت سے

۱۔ خدا کا اعتراف انسان کی اصلی فطرت میں داخل ہے علم الانسان کے ماہرین نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ انسان جب فطری حالت میں تھا یعنی علوم وفنون کا بالکل وجود نہ تھا اس وقت انسان نے حقیقی خدا کی پرستش کی یا مصنوعی خدا کی مادیین (میٹریلیسٹ) کے سوا تمام محققین نے فیصلہ کیا کہ انسان نے پہلے خدا کی پرستش کی تھی مشہور محقق میکس مولر اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ ہمارے اسلاف نے خدا کے آگے اس وقت سر جھکایا جب وہ خدا کا نام بھی نہ رکھ سکتے تھے جسمانی خدا (بت) اس حالت کے بعد اس طرح پیدا ہوئے کہ فطرت اصلی مثالی صورت کے پردہ میں چھپ گئی یہی وجہ ہے کہ جس زمانے سے دنیا کی تاریخ معلوم ہے دنیا کے ہر حصے میں خدا کا اعتقاد موجود تھا ۔ آشوری، مصری، کلدانی اہل نینشیہ سب خدا کے قائل تھے ۔ پلو مارک کہتا ہے اگر تم دنیا پر نظر ڈالو گے تو بہت سے ایسے مقامات

ملیں گے جہاں نہ قلعے ہیں نہ سیاست نہ علم و صنعت و حرفت نہ دولت لیکن ایسا کوئی مقام نہیں مل سکتا جہاں خدا نہ ہو۔ نولیئر فرانس کا مشہور فاضل جو وحی اور الہام کا منکر تھا کہتا ہے کہ منو سولن سقراط ۔۔۔۔ و سب ایک سردار ایک مصنف اور ایک بت کی پرستش کرتے تھے (مالینسو تحفر کی کتاب الفلسفہ ترجمہ عربی مطبوعہ بیروت ص ۱۸۱)

۲۔ فطری امور کی جانچ کے لیے بڑا اصول یہ ہے کہ تمام اقوام عالم میں ایک امر جب مختلف اور گوناگوں امتیازات کے رنگ میں موجود ہو تو ان خصوصیات کے حذف کر دینے کے بعد جو قدرے مشترک رہ جائے وہی تمام اقوام کی فطرت ہے۔ مثلاً تمام اقوام میں کھانے پینے پوشاک مکان رہائش اور بیاہ شادی کے ڈھنگ اور طور طریقے مختلف ہیں اور ان کے طرز و شکل الگ الگ ہیں جب ہم ان خصوصیات کو حذف کر دیتے ہیں تو سب اقوام میں مشترک چیز نفس کھانا پینا کپڑا پہننا لباس مکان شادی و نکاح باقی رہ جاتا ہے اس لیے فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ نفس کھانا پینا لباس مکان شادی انسان اور اقوام عالم کی فطری ضرورتیں ہیں اسی طرح اقوام عالم میں خدا کا عقیدہ مختلف رنگوں میں موجود ہے کوئی مجرد خدا مانتا ہے کوئی مجسم خدا (بت) مانتا ہے کوئی ایک خدا مانتا ہے کوئی متعدد جو منکر خدا ہے وہ مادہ اور اس کی حرکت کو مختار کائنات یا بالفاظ دیگر خدا مانتا ہے جب ہم ان خصوصیات کو حذف کر دیتے ہیں تو نفس خدا کا عقیدہ قدر مشترک رہ جاتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہی عقیدہ تصور خدا انسان کا فطری عقیدہ ہے اور تسلیم خدا فطرت کی خاموش آواز ہے۔

۳۔ یہ چیز انسانی فطرت میں داخل ہے کہ وہ صانع اور اس کے مصنوعات کے مادہ اور ملبہ میں فرق کرتا ہے اور مادہ اور ملبہ ذریعۂ کار سمجھتا ہے لیکن کارساز نہیں سمجھتا مثلاً ایک عمارت جس مادہ اور ملبہ سے تیار ہوتی ہے انسان اس کو تعمیر کے لیے کافی نہیں سمجھتا بلکہ معمار کے وجود کو عمارت کے لیے ضروری

قرار دیتا ہے کائنات کی عظیم عمارت کا بھی یہی حال ہے کہ وہ صرف مادہ اور ملبہ سے وجود میں نہیں آئی بلکہ اس کے لیئے ایک حکیم دانا معمار کی ضرورت ہے وہی معمار خدا ہے جس کا عقیدہ فطرت کا تقاضا ہے۔

۴۔ پچھلے تین سو سال کی سائنسی کاوشوں نے انسان کو کائنات کے متعلق جس مادی نظریہ کی تشکیل کے قابل بنایا وہ یہ ہے کہ کائنات مادہ اور حرکت مادہ کے مختلف مظاہر کا نام ہے اور کسی بیرونی قوت کو اس میں دخل نہیں اور کائنات ایک وسیع مشین ہے جس کی توجیہ اجزائے مادہ کی حرکت سے ہوتی ہے نیوٹن ڈارون اور لامارک اسی توجیہ کو حقیقت ٹھہراتے ہیں۔ یہاں تک کہ ذہن وفکر خود خالص غیر مادی حقائق ہیں جن کی نہ کمیت ہے نہ وزن اور نہ حجم رکھتے ہیں۔ ان کو بھی انہوں نے انیسویں صدی کی تحقیقات کے تحت مادہ کا اثر اور نتیجہ قرار دیا ہے لیکن یہ مشکل وہ ابھی تک حل نہ کر سکے۔ کہ عالم ایک وسیع مشین ہے لیکن ان کے قوانین میں توافق وتناسب ہے جو ایک مقصد کی تکمیل کے لیے کام کرتے ہیں یہ توافق ان اجزائے عالم میں کہاں سے پیدا ہوا یہ کہنا لغو ہے کہ یہ ان اجزار کی طبعی خاصیت ہے اور یہ توافق ان اجزائے مادہ سے خارج چیز ہے بلکہ یہ توافق ایک بالاتر قوت نے ان میں پیدا کیا جو ان تمام قوانینِ قدرت پر حاکم ہے وہی خدا ہے۔

۵۔ اجزائے مادہ کی حقیقت ایک ہے لہٰذا ان اجزار کی مقتضیات اور خاصیات بھی ایک جیسے ہوں گے اب ان اجزار نے اگر بیرونی قوت کی مداخلت کے بغیر بے شمار اجسام عالم اور انواعِ کائنات کی جو شکل اختیار کی ان میں کثافت، لطافت شکل وخاصیات کے جو نمایاں امتیازات موجود ہیں یہ امتیازات کہاں سے آئے اگر کہا جائے کہ ان اجزائے مادہ کے ربط باہمی میں تعدد اجزا اور باہم دگر قرب وبعد اور ترتیب اجزائے عالم کی مختلف انواع وجود میں آئیں تو بعض چیزوں میں اجزائے مادہ کی خاص تعداد اور

اور مخصوص طرز اتصال اور ممتاز ترتیب سے مرتب ہونا ان اجزاء کی ذاتی خاصیت نہیں ورنہ سب اجزا میں ان تین امور کی یکسانیت موجود ہوتی اور ان سے پھر صرف ایک قسم کا جسم موجود ہوتا۔ کیونکہ اجزا مادہ بھی ایک ہیں مذکورہ تینوں خواص بھی ایک ہی مادہ کی خاصیات ہیں تو پھر اجسام عالم میں یہ اختلاف و امتیاز کہاں سے آیا بجز اس کے کہ حاکم کائنات کے دستِ قدرت سے یہ اختلاف نمودار ہوا اور وہی ذات اس اختلاف کا اصل عامل ہے۔

۶۔ اجزائے مادہ متحرک ہیں۔ ہر متحرک کے لئے محرک ضروری ہے۔ یعنی حرکت کنندہ کے لئے حرکت دہندہ کی ضرورت ہے اگر وہ محرک بھی متحرک ہو تو اس کے لئے ایک اور محرک کی ضرورت ہو گی اس صورت میں تسلسل اور لامتناہی کا وجود لازم آئے گا جو محال ہے اور جب عالم کے کل اجزا اور اسی طرح اجزائے مادہ متحرک ہیں تو ضرور ان کا محرک ایسی ذات ہو گا جو متحرک نہ ہو وہ مادیات سے ماوراء ہو گا اور ایسی شے صرف ذاتِ خداوندی ہے۔

۷۔ مادیات میں تنوع و تکثر پایا جاتا ہے یہ بقول ڈارون وغیرہ اگر ارتقا کا نتیجہ ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اجزائے مادہ میں ارتقا کا یہ خاص تصور کہاں سے پیدا ہوا، اور کیوں پیدا ہوا۔ جبکہ اجزاء شعور و حیات سے محروم ہیں اگر یہ کہا جائے کہ یہ ارتقائی نظام اتفاقی طور پر وجود میں آیا۔ تو اتفاقی واقعات مسلسل اور منظم نہیں ہوتے۔ کبھی شاذ و نادر وجود میں آتے ہیں۔ نہ یہ کہ وہ دائمی ضابطے کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ اس لئے اس کے سوائے چارہ نہیں کہ عالم کی جو شکل بھی ہے وہ کوئی اتفاقی نہیں بلکہ کسی صاحبِ حکمت حاکم کے طے شدہ پروگرام کے تحت ظہور رہا ہے اور وہی حاکم خدا ہے۔

۸۔ اشیاء عالم میں ایک حکیمانہ ترتیب موجود ہے۔ اجزاء حیوانات مرتب ہیں۔ نباتات کے اجزاء میں پر حکمت ترتیب موجود ہے۔ اسی طرح انسانی اعضاء میں مکمل ترتیب ہے اگر ان میں سے کسی چیز کی ترتیب بگڑ جائے تو اس چیز کی

کی ترتیب بگڑ جائے۔ تو اس چیز کی زندگی خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ عناصر کائنات جو سیارات کا بھی یہی حال ہے۔ مثلاً زمین اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھومتی ہے۔ اگر اس کی رفتار ایک سو میل فی گھنٹہ ہوتی تو اس حالت کے دن رات موجودہ دن رات سے دس گنا بڑے ہو جاتے جس کے نتیجہ میں دن کے طویل ہونے کی وجہ سے فصلیں گرمی کی وجہ سے برباد ہو جاتیں اور جو فصلیں بچ جاتیں وہ رات کی سردی سے ختم ہو جاتیں۔ اسی طرح سورج کا فاصلہ ہم سے ۹ کروڑ چالیس لاکھ میل ہے۔ اگر سورج اس سے دگنے فاصلے پر ہوتا تو سب انسان حیوان جم کر برف بن جاتے اور اگر سورج آدھے فاصلے کے اندازے پر ہمارے قریب ہوتا، تو تمام حیوانات، نباتات جمادات گرمی سے جل کر خاکستر بن جاتے۔ اب یہ حکیمانہ ترتیب کہاں سے آئی۔ بجز اس کے کہ یہ کہا جائے کہ یہ ایک حکیم ذات کی کارفرمائی کا نتیجہ ہے۔ جو خدا ہے۔ نہ کہ مادی اجزاء کی اندھی حرکت کا جدید فلسفہ کا اتفاق ہے کہ اگر کاغذ کی پرچیوں پر بالترتیب ایک سے دس تک کے ہندسے لکھے جائیں۔ اور تھیلے میں خلط ملط کر کے ایک اندھے آدمی سے کہا جائے کہ تھیلے سے ایک ایک پرچی نکالتے جاؤ تو کروڑوں سال نکالتے رہو بھی ترتیب وار ایک سے دس تک کے ہندسے نکل جانے کی نوبت نہ آئے گی۔ تو کارخانہ عالم کی یہ عظیم ترتیب اتفاقی ڈھنگ میں اندھے اور بے شعور مادے سے کیونکر وجود میں آسکتی ہے اسی کو قرآن حکیم نے بلیغ انداز میں یوں بیان کیا ہے۔ ولہ اسلم من فی السموت والارض خالق کائنات کے قانون کے آگے گردن نہاد ہیں۔ آسمان اور زمین کے کائنات صنع اللہ الذی اتقن کل شیئ یہ نقشہ عالم کاریگری ہے۔ اس ذات کی جس نے محکم ترتیب میں اس کو جکڑ دیا ہے۔

۹۔ اجزاء مادہ کی حرکت سے اگر کائنات خود بخود وجود میں آئی تو کائنات کے مختلف شعبوں میں جو مقصودیت اور یگانگت پائی جاتی ہے۔ وہ کہاں سے آئی جبکہ مادہ ان اوصاف سے خالی ہے۔ کہ وہ کائنات کے کسی شعبے کے لیے کوئی حکیمانہ نظام تجویز کرے اور پھر اس نظام پر کنٹرول کر سکے اور ان نظاموں کو

ایسی حالت میں رکھے کہ ایک نظام دوسرے سے متصادم نہ ہو ان امور کے لئے ایک خارجی قوت کی ضرورت ہے۔ دنیا کی چھوٹی مشین خود بخود نہیں چل سکتی اس کے لئے قابل انجینئر اور کارندوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو دنیا کی عظیم الشان مشین خود بخود کیسے چل سکتی ہے۔ اس لئے خارجی قوت یعنی ذاتِ رب العالمین کا وجود ضروری ہے۔ جو اس عظیم مشین کی ہر کڑی کو دوسری کڑی سے جوڑ دیں اور خاص مقاصد کی تکمیل کے لئے اس کو چلائے۔ اور اس پر کنٹرول رکھیں تاکہ نظامِ کائنات درہم برہم نہ ہو۔

۱۰۔ انکارِ خدا کی سب سے بڑی وجہ ازلیت مادہ کا تصور ہے۔ حالانکہ مادہ حادث ہے۔ ازلیت کے تصور کو اس غلط فہمی نے پیدا کیا کہ مادہ نہ ہو تو صرف نیستی سے ہستی وجود میں نہیں آسکتی حالانکہ یہ نظریہ ہی غلط ہے۔ اسلام کا یہ تصور کہ صرف آغازِ تخلیق میں نیست سے ہست ہوا۔ بعد ازاں تمام اجسام عالم اجزاء مادہ کی ترکیب سے پیدا ہوئے اور آغازِ تخلیق کے ایک واقعہ کے بغیر باقی کل تخلیقی واقعات اور تخلیقی واقعات اور تخلیقی سلسلے ہست سے ہست ہوتے ہیں، یعنی اجزاء مادہ کی ترکیب سے اجسام مادہ وجود میں آتے ہیں۔ اس لیئے ہر دور کے مشاہدہ میں جو تخلیقی صورتیں ہیں وہ ہست سے نیست کی ہیں نیست سے ہست ہونے کا واقعہ صرف ایک ہے اور وہ مشاہدات کی سرحدوں سے پہلے ایک بار وقوع میں آچکا ہے کہ جس وقت نہ کوئی جسم تھا نہ انسان نہ سائنس دان اب اگر کوئی نادان کہے کہ نیست سے ہست کا مشاہدہ کرا لو تب میں مانوں گا۔ تو اس کا صاف جواب یہ ہے کہ تم ہم کو اس زمانہ میں لے جاؤ جس میں اجزاء مادہ کو نیست سے ہست کر دیا گیا تھا۔ تو ہم مشاہدہ بھی کرالیں گے۔ اگر ایسا ممکن نہیں تو مشاہدہ کا یہ مطالبہ ایسا ہے کہ اس وقت کوئی کہہ دے کہ ہمیں اس وقت دارا اور سکندر کی جنگ کا مشاہدہ کرا لو۔ ظاہر ہے کہ مذکورہ جنگ سابق زمانہ سے متعلق ہے نہ اس زمانہ سے ۲ مادہ

اس لحاظ سے بھی حادث ہے کہ مادی اجزاء یعنی برق پارے دو حالتوں سے خالی نہیں یا متحرک ہوں گے یا ساکن کیونکہ اگر برق پارے دو وقتوں میں دو جگہوں میں ہوں گے تو متحرک، اگر دو وقتوں میں ایک جگہ ہی رہیں گے تو ساکن جب حرکت یا سکون میں سے کوئی ایک اجزاء مادہ کے ساتھ لازم ہے اور حرکت و سکون حادث اور نو پیدا ہیں۔ کیونکہ حرکت سکون سے فنا ہو جاتی ہے۔ اور سکون حرکت سے زائل ہوتا ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ مادہ بھی اپنے لوازمات یعنی حرکت و سکون کی طرح حادث ہے، ازلی نہیں۔ جب مادہ حادث ہوا تو محدث نے اس کو پیدا کیا ہوگا۔ وہ محدث اگر حادث ہوگا تو تسلسل لازم آئے گا۔ اگر قدیم ہوگا تو اس کو ہم خدا کہتے ہیں۔ ۳۔ اس کے علاوہ یہ نظریہ اب باطل ہو چکا ہے کہ مادہ ازلی ہے گم اور معدوم نہیں ہوتا۔ پروفیسر جوڈ کی کتاب افکارِ حاضرہ مترجمہ محمد بن علی میں ہے۔ کہ مادہ یعنی برق پاروں کی خصوصیات میں سے یہ بھی ہے کہ ایک مقام پر اپنا وجود کھو دیتا ہے۔ اور دوسرے مقام پر خود بخود وجود میں آ جاتا ہے۔ یہ چھلانگ نہیں بلکہ اعدام ہے ایک مکان میں، اور ایجاد ہے دوسرے مکان پر اس میں عدم مادہ کا صاف اقرار موجود ہے اور ثانوی وجود بغیر کسی مادہ کے ہوا جس سے نیست سے ہست ہونا ثابت ہوا

۱۱۔۔۔۔۔۔ انسانی مصنوعات میں سب وہ ہیں جو ہست سے پیدا ہوئے ہیں۔ یعنی کسی مادہ سے ترکیب پا چکے ہیں۔ اور انہی مصنوعات میں بھی اکثریت اُن مصنوعات کی ہے۔ جو نیست سے نہیں بلکہ مادی اجزاء سے وجود میں آئے ہیں جس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ نیست سے ہست کر دینا خارج از امکان ہے۔ حالانکہ یہ چند وجوہات سے غلط ہے۔ ا۔ ایک تو اگر انسان نیست سے ہست نہیں کر سکتا تو یہ کیا ضروری ہے کہ خالق بھی نیست سے ہست نہ کر سکے۔ الہٰی قدرت کو انسانی قدرت پر قیاس کرنا غلط ہے کہ جو انسان سے نہ ہو سکے وہ خدا سے بھی نہ ہو سکے ہاتھی اور چیونٹی دونوں حیوان

دونوں مخلوق ہیں لیکن ہاتھی بیس من بوجھ اٹھا سکتا ہے اور چیونٹی نہیں اٹھا سکتی تو کیا چیونٹی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ یہ کہہ دے کہ جو کام میں نہیں کر سکتی ہاتھی بھی نہیں کر سکتا۔ ۲۔ اس کے علاوہ نیست سے ہست کی مثال بھی موجود ہے لطیف اشیاء سب نیست سے ہست ہوتی ہیں، موم اگر گردی اور گول شکل میں ہو اور اس کو مبدل کر کے مربع شکل میں تبدیل کر دیں تو موم توجوں کی توں موجود ہے لیکن گردی شکل معدوم ہوئی اور مربع شکل نیست سے ہست ہوئی۔ موم اس مربع شکل کا محل ہے، مادہ یا ملبہ نہیں کیونکہ شکل ترکیبی اجزاء نہیں رکھتی۔ عشق و محبت بعض تصورات ذہنی سب نیست سے ہست ہوتے ہیں۔ لیکن اگر آپ ان کی تحلیل و تجزیہ کی کوشش کریں تو یہ ممکن نہیں کہ اس کے اجزاء ترکیبی نکل سکے۔ یہی حال مادہ کا ہے کہ سائنس کے لحاظ سے برقی پارے نہ نظر آتے ہیں، نہ ہم ان کو چھو سکتے ہیں۔ بلکہ ان کا وجود ایک خیال تصور کے درجہ میں ہے۔ اس لئے ان کا وجود بلا کسی ہست کے مادہ کے عدم سے وجود میں آیا ہے۔ پروفیسر جوڈ کی کتاب افکار حاضرہ اور سائنس کا ارتقاء محمد سعید میں مادہ کی یہ حقیقت مفصل طور پر مذکور ہے۔

۱۲۔ بارھویں دلیل وجودِ خالق کی یہ ہے کہ مادہ حیات اور شعور سے خالی ہے۔ مادئین کے نزدیک حقائق کائنات صرف مادہ اور اسکی حرکت کا نام ہے لیکن کائنات میں بالخصوص انسان میں حیات اور شعور نمایاں طور پر موجود ہے یہ چیز ایسے مادہ سے کیونکر پیدا ہوئی۔ جو حیات اور شعور دونوں سے خالی ہے۔ یہ وہ عقیدہ ہے کہ بیسویں صدی تک سائنس دان اسکے حل کرنے سے قاصر ہیں یہی وجہ ہے کہ جرمنی کا مشہور محقق درشو جو دہریت کا پر زور مبلغ تھا اس نے ۲۱ سال بعد دہریت سے توبہ کر لی۔ درشو کی طرح ریمونڈ جو علم الحیاتیات کا ماہر اور برلن اکیڈیمی کا گراں پایہ کلیم تھا۔ اس نے اپنے ایک مقالہ علم طبیعات کے حدود میں صاف کہہ دیا کہ سات مسائل کے حل کرنے سے سائنس عاجز ہے۔

۱۔ مادہ اور قوت کی اصلیت ۲۔ حرکت کا مبدار ۳۔ اور اسکے مبدار کا آغاز
۴۔ علم حیات کا مبدار ۵۔ کائنات کا باقاعدہ نظام ۶۔ قوت ناطقہ کا آغاز
۷۔ مسئلہ جبر و اختیار۔ معارج الدین صد ۱۲۷ صد ۱۲۸

یہی سائنس کے حدود ہیں جہاں سائنس پہنچ کر رک جاتی ہے اور اقرار عجز کرتی ہے۔ لیکن سائنس کی جہاں انتہا ہے وہ مذہب کی ابتدا ہے۔ ان سات سوالوں کو مذہب نے حل کر دیا ہے کہ صرف خدائے حکیم کے وجود کا اعتراف کرنے سے ان مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔ برق پاروں کے مادی تصور کے تحت ان مسائل کے حل کر دینے کا امکان ہی نہیں۔

خداوند تعالیٰ کے وجود پر فلسفہ اور ائمہ اسلام کے دلائل

اس سے قبل جو بارہ دلائل اثبات وجود باری پر پیش کیے گئے وہ فلسفہ جدید کے تحت پیش کیے گئے جن کو سائنسی دلائل کہا جاسکتا ہے اس کے علاوہ قدیم فلسفہ یونان کی اکثریت وجود باری کی قائل ہے اور انہوں نے اپنے فلسفہ کی روشنی میں اثبات باری تعالیٰ پر دلائل پیش کیے۔

۱۔ دلیل حدوثی

حدوثی دلیل جس کا حاصل یہ ہے کہ کل کائنات کی حقیقت یا جسم ہے جیسے عناصر اربعہ باد، خاک آب و آتش۔ افلاک۔ ستارے۔ مرکبات۔ معدنیات۔ نباتات۔ حیوانات انسان یا جسم سے قائم چیزیں مثلاً گرمی، سردی سختی نرمی، سیاہی سفیدی اور جسم حادث یعنی نوپیدا ہے کیونکہ ہر جسم مرکب ہے یعنی اجزا کے جوڑ سے پیدا ہوا ہے اور جس چیز کے لیے جوڑ ہو اس کے لیے توڑ بھی ہوتا ہے اور توڑ سے مرکب کا وجود ختم ہو جاتا ہے اس لیے جسم حادث اور قابل عدم ہے اس کے علاوہ جسم تغیر پذیر ہے کبھی گرم کبھی سرد کبھی نرم کبھی سخت کبھی سیاہ کبھی سفید ہے اور جس چیز میں صفات کا تغیر ہوتا ہے اس میں عدم اور وجود کا تغیر بھی آسکتا ہے کہ معدوم سے موجود اور موجود سے معدوم ہو جائے اس لیے جسم حادث ہے اور مادہ میں بھی یہی

اوصاف پائے جاتے ہیں، لہٰذا وہ بھی حادث قرار پایا۔ جب عالم حادث ٹھہرا تو اس کے لیے احداث اور ایجاد کرنے والا ضروری ہے اگر عالم کا موجد بھی حادث ہو تو اس کے لیے بھی پیدا کنندہ اور محدث کی ضرورت ہو گی اسی طرح تسلسل لازم آئے گا یعنی لامتناہی سلسلہ کا وجود جو دونوں فلسفوں کے لحاظ سے محال ہے لہذا محدث عالم ایسی ذات ہو گی جو حادث نہ ہو بلکہ قدیم ہو اور اس ذات کے لیے ضروری ہو گا کہ علم و حکمت سے موصوف ہو کیونکہ اس قدر عظیم پر حکمت عالی مشین کے لیے کسی بے سمجھ ہستی کا کام نہیں بلکہ معمولی میز بھی بے سمجھ جماد یا حیوان نہیں بنا سکتا اور اس ذات کا حیات اور ارادہ کے اوصاف سے موصوف ہونا بھی ضروری ہے تاکہ وہ حیات اور ارادے کی صفتوں کو انسان میں پیدا کر سکے۔ ایسی ذات صرف خدا ہے لہذا خدا کا وجود ثابت ہوا۔

۲۔ دلیل امکانی

۲۔ فلسفہ یونان کا متفقہ فیصلہ ہے اور جدید فلسفہ بھی اس سے متفق ہے کہ جب وجود کو کسی چیز کی طرف منسوب کیا جائے یا عدم کو تو یا اس چیز کا وجود یعنی ہونا ضروری ہو گا' یا عدم اور نہ ہونا ضروری ہو گا ہونا اور نہ ہونا دونوں غیر ضروری ہوں گے پہلی چیز کا نام واجب الوجود یعنی خدا ہے دوسری چیز کا نام محال اور ممتنع ہے جیسے دو "دونے پانچ یا دو نقیضوں مثلاً ایک کپڑے کا ایک وقت سیاہ، سفید ہونا۔ تیسری چیز ممکن ہے مثلاً انسان کا کوئی فرد مثلاً زید کا اس کا ہونا نہ ہونا دونوں ضروری نہیں اگر ہونا ضروری ہوتا تو اس کے وجود سے پہلے اس کا عدم نہ ہوتا، اور مرنے کے بعد بھی اس کا عدم نہ ہونا اور عدم بھی ضروری نہیں ورنہ زید کبھی بھی موجود نہ ہوتا۔ اس لیے تمام کائنات تیسری قسم یعنی ممکنات میں داخل ہیں کہ ان کا ہونا بھی ضروری نہیں اور نہ ہونا بھی ضروری نہیں بلکہ کائنات کا ہونا نہ ہونا کسی علت کی وجہ سے ہو گا لیکن وہ علت اور سبب کائنات میں ممکن نہ ہو گا ورنہ اس کے لیے دوسری علت کی ضرورت ہو گی اور لامتناہی سلسلہ

کا وجود لازم آئے گا جو محال ہے تو ضرور وہ علت واجب الوجود ہو گی اور وہی خدا ہے ممتنع کا تو خود وجود نہیں اور اس لیے وہ کسی ممکن کو وجود قطعاً نہیں دے سکتا۔

۲۔ دلیل بالذاتی

ممکنات عالم کے لیے وجود یا اس کی ذاتی صفت ہو گی اور خانہ زاد ہو گی یا عارضی یا بیرونی علت کی وجہ سے وجود ممکنات میں آیا ہو گا تیسری کوئی صورت نہیں، پہلی صورت صحیح نہیں کیونکہ ذاتی صفت لازوال ہوتی ہے اور موصوف سے زائل نہیں ہوتی۔ جیسے آگ کی گرمی کہ آگ سے جدا نہیں ہوتی جب تک آگ ہو گی تو گرمی ضرور ہو گی لیکن ممکنات عالم سے وجود الگ ہو سکتا ہے انسان نبات میں ہر ایک کبھی موجود ہے تو کبھی نہیں، حیوان تینوں کا حال وہ تمام اجسام عالم اور کائنات کا بھی حال ہے کہ سب ممکن ہے اور سب اجسام ہیں تو جب وجود کی جدائی انسان حیوان نبات سے ہو سکتی ہے تو دیگر ممکنات سے بھی ہو سکتی ہے تو کائنات اور ممکنات کی حالت وجود کے لحاظ سے ایسا ہے جیسے گرمی پانی کے لیے کہ پانی کے ساتھ کبھی گرمی ہوتی ہے جبکہ اس کو گرم کیا جائے اور کبھی نہیں ہوتی جب ٹھنڈا ہو لہٰذا ممکنات ذاتی صفت نہیں عرضی ہے جیسے پانی کی گرمی عرضی صفت ہے یہ ضروری ہے کہ اسی عرضی صفت کی علت سے سوال کیا جائے مثلاً پانی کے متعلق یہ سوال ہو سکتا ہے کہ پانی کیوں گرم ہے کیونکہ گرمی پانی کی ذاتی صفت نہیں لہٰذا گرمی کی علت سے سوال کیا جا سکتا ہے جس کا جواب یہ ہو گا کہ آگ نے پانی کو گرم کیا ہے لیکن آگ کے متعلق یہ سوال غلط ہے کہ آگ کیوں گرم ہے، کیونکہ گرمی آگ کی ذاتی صفت ہے اور ذاتی صفت ذات کے ساتھ لازم ہوتی ہے کہ کسی علت کی وجہ سے ذات میں نہیں ہوتی اسی طرح ممکنات کا وجود چونکہ ذاتی نہیں لہٰذا سوال ہو گا کہ ممکنات عالم کیوں موجود

ہیں جواب یہ ہوگا کہ واجب الوجود خدا نے اس کو وجود دیا اور اسی کی وجہ سے موجود ہیں تو آگے سوال نہ ہوگا کہ واجب الوجود کیوں موجود ہے کیونکہ آگ کی گرمی کی طرح وجود خدا کی ذاتی صفت ہے کہیں عارضی نہیں لہٰذا ممکنات کے وجود کا سوال اس وجود کی علت یعنی خدا پر ختم ہوا اور خدا کے وجود کا سوال بالذات ہونے کی وجہ سے کیونکہ ذریعہ نہیں کہا جا سکتا کہ وجود باری خدا کی ذاتی صفت ہے کسی بیرونی علت سے اس کی آمد نہیں ہوتی اس لیے خدا کی ہستی ثابت ہوئی۔

۴۔ دلیل نفسیاتی حُبّی

محبوبات کی دو قسمیں ہیں اول محبوب غیر کامل مثلاً جان، مال، اولاد، بیوی اور عزت و جاہ۔ یہ محبوبات اس لیے غیر کامل ہیں کہ زوال پذیر ہیں محبوب کامل رب العالمین جو تمام محبوبات غیر کاملہ اور تمام انسانی نعمتوں کا سرچشمہ ہے اور غیر کامل محبوب کی محبت محبوب کامل کی نسبت ناقص ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں انسان نے اللہ کی محبت کی راہ میں ان پانچ محبوبات غیر کاملہ جان، مال، اولاد، بیوی اور جاہ کو قربان کیا ہے کیونکہ کامل محبوب کی راہ میں ناقص محبوب کی قربانی ایک فطری امر ہے اب ہم دیکھتے ہیں کہ محبت غیر کاملہ کا محبوب موجود ہے، جان و مال اولاد بیوی عزو جاہ سب موجود ہیں کیونکہ معدوم چیز محبوب بن نہیں سکتی۔ تو محبوب کامل یعنی خالق عالم کیونکر معدوم ہوگا جبکہ معدوم محبوب بننے کے قابل نہیں لہٰذا محبوب کامل زندہ اور موجود ہے محبوب ناقص اس کے مقابلہ میں مردہ کی طرح ہے بقول حضرت رومیؒ ہے

عشق بامردہ نباشد پائیدار — عشق را باحیّ و باقیوم دار
غرق عشق شو کہ غرق ہست اندریں — عشق ہائے اولین و آخریں

۵۔ نفسیاتی دلیل التجائی

دنیا میں کمزور، ضعیف اور مظلوم افراد کی تعداد زیادہ ہے اور قوی و ظالم

افراد کی تعداد کم ہے جو ضعیفوں پر ظلم کرتے ہیں لیکن ان سے مظلوم انتقام نہیں لے سکتا اس لیے اگر قاہر و جابر قوت یعنی ذات باری تعالیٰ کا عقیدہ اور تصوّر موجود نہ ہو تو مظلوم کے لیئے کوئی سہارا باقی نہیں رہے گا اور مظلوم کا دل ناامیدی اور قنوطیت کے باعث ٹوٹ جائے گا اور اس کے ضعیف اور ٹوٹے ہوئے دل کے لیے کوئی سہارا نہ رہے گا جس سے اس کی قلبی قوت فنا ہو جائے گی اس لیئے عقیدہ ثبوت باری فطرت کا تقاضا ہے تاکہ وہ مظلوموں کے ٹوٹے ہوئے دلوں کے لیے مرہم کا کام دے اور اس کو ناامید نہ ہونے دے اور ان کو اس جذبہ کے تحت آمادہ عمل کر دے کہ اللہ کی قوت انقلاب پیدا کر کے اس کی امداد کرے گی لہذا ناامید نہ ہوں اور جوش عمل کو زندہ رکھیں یہی عقیدہ اثبات باری نے ہمیشہ انسانی تاریخ میں بے کسوں اور مظلوموں کو جرأت دلائی ہے اور اسی نے مظلوموں کو طاقت اور ظالموں پر غالب کیا ہے۔

۶- دلیل غرقی نفسیاتی

ذیل کے چھ دلائل بزرگان دین نے عام فہم سائنس کی شکل میں ارشاد فرمائے ہیں جو تفسیر کبیر میں مذکور ہیں جن میں سے ایک دلیل غرقی ہے امام جعفر صادق رضؓ سے کسی نے پوچھا کہ خدا کے وجود پر کیا دلیل ہے آپ نے فرمایا اگر تم سمندر میں کشتی پر سوار ہو اور کشتی ایسی ٹوٹ جائے کہ اس کی ایک تختی بھی تمہارے ملتفت باقی نہ رہے اور ڈوب جانے کا قوی خطرہ پیدا ہو جائے تو کیا اس وقت بھی تم کو غرق ہونے سے بچنے کی کوئی امید باقی رہتی ہے کہا کہ امید تو باقی رہتی ہے فرمایا کہ امید کا ظاہری سہارا تو موجود نہیں پھر بھی امید باقی ہے یہ امید پوشیدہ جس سہارے کی وجہ سے باقی ہے وہی خدا ہے جو ضمیر کی گہرائی میں موجود ہے

۷- دلیل فلکی

امام اعظم ابو حنیفہ کو ایک ملحد کے ساتھ مناظرہ میں بلایا گیا وہ مناظرہ کرنے کے لیے دیر سے پہنچے آپ سے تاخیر کی وجہ پوچھی گئی۔ آپ نے فرمایا میرا مکان دریائے دجلہ سے پار تھا کشتی موجود نہ تھی انتظار کیا یہاں تک کہ

درخت کٹ کر کشتی خود بخود تیار ہوئی پھر خود بخود میرے پاس کنارے پر پہنچی میں سوار ہوا تو خود بخود چلنے لگی یہاں تک کہ میں پار ہوا ملحد نے کہا کہ یہ پاگلوں کی سی باتیں ہیں کشتی نہ خود بخود بن سکتی ہے نہ ملاح کے بغیر خود بخود چل سکتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے تیری عقل میں فتور ہے امام اعظمؒ نے فرمایا اس سے بڑا پاگل پن تم میں موجود ہے کہ جب چھوٹی سی کشتی کے لیے خود بن جانا اور خود بخود چلنا نامعقول ہے تو کائنات کی یہ عظیم الشان کشتی خود بخود کیسے بنی اور خود بخود کیسے چل سکتی ہے ملحد لاجواب ہوا اور خدا کی ہستی کا اسے اقرار کرنا پڑا۔

۸۔ دلیل صوتی

امام مالکؒ سے باری تعالیٰ کے وجود پر دلیل دریافت کی گئی آپ نے آوازوں کے اختلاف سے وجود باری تعالیٰ پر استدلال کیا جس کا حاصل یہ ہے کہ تمام اولاد آدم میں سے ہر فرد کی آواز دوسرے سے مختلف ہے اور آج تک اور اسی طرح آئندہ بھی دو آدمیوں کی آوازیں ایک جیسی ہو بہو نہیں حالانکہ جس ہوا کے تموج سے آواز کی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ ایک ہے گلے کی ساخت بھی ایک جیسی ہے کروڑوں اور اربوں آوازوں میں یہ باریک فرق خدائے حکیم کی بہترین صنعت کاری کی دلیل ہے اور یہ ایک ایسا عمل بے شعور مادہ سے منسوب کرنا نادانی ہے۔

۹۔ دلیل توتی

امام شافعیؒ سے جب وجود باری تعالیٰ کی دلیل طلب کی گئی تو آپ نے درخت توت کے ورق اور اس کے پتہ کو دلیل میں پیش کیا کہ توت کی پتی ایک جیسی ہے، لیکن جب اس کو اونٹ کھاتا ہے تو اس سے مینگنی پیدا ہوتی ہے اور ریشم کا کیڑا اس کو کھاتا ہے اور اس سے ریشم پیدا ہوتی ہے اور جب شہد کی مکھی کھاتی ہے تو شہد پیدا ہوتا ہے اور جب آہو ختن اسے کھاتا ہے تو اس سے مشک اور کستوری پیدا ہو جاتی ہے۔

۱۰۔ دلیل بیضی امام احمدؒ سے ثبوت باری تعالیٰ کی دلیل دریافت کی گئی تو آپ نے مرغی کے انڈے سے بچہ نکالنے پر استدلال کیا انڈوں پر مرغی بیس اکیس دن بیٹھتی اور آزادانہ نقل وحرکت ترک کرتی ہے جو اگر دوسرے وقت میں کوئی زبردستی کسی جگہ بیٹھنے کا مرغی کو پابند کرنا چاہے تو پابند نہ ہوگی پھر اس مرغی کو یہ بتلانا کہ انڈے میں بچہ نکلنے کا وقت پہنچ گیا ہے پھر مرغی کا اس بچے کو غذا پیش کرنا اور سردی سے بچاؤ اور خطرات سے محفوظ رکھنے کے لیے بال و پر کے نیچے چھپائے رکھنا یہ سب الہامات الٰہیہ جو خدائے حکیم مرغی کے دل و دماغ میں ڈالتا ہے سب وجود باری تعالیٰ پر دلالت کرتے ہیں۔

۱۱۔ دلیل نباتی ابو نواس اور سعدی رحمہا اللہ علیہما نے نباتات سے خدا کی ہستی پر استدلال کیا ہے ابو نواسؒ نے کہا ؎

تَاَمَّلْ فِیْ نَبَاتِ الْاَرْضِ وَانْظُرْ	اِلٰی اٰثَارِ مَا صَنَعَ الْمَلِیْکُ
عُیُوْنٌ مِنْ لُجَیْنٍ شَاخِصَاتٍ	وَاَزْهَارٌ کَمَا الذَّهَبُ السَّبِیْکُ
عَلٰی قُضُبِ الزَّبَرْجَدِ شَاهِدَاتٍ	بِاَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ لَهٗ شَرِیْکٌ

سعدیؒ کہتے ہیں۔

برگ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار	ہر ورق دفتریست معرفت کردگار

نباتات کا تخم ایک، پانی ایک، مٹی ایک، پھر اس میں سے کچھ جڑھ کچھ پوست کچھ شاخ کچھ پھول اور کچھ تنہ اور رخارین جاتے ہیں یہ مختلف کاریگری صانع حکیم کا فعل ہے، جو خدا ہے

۱۲۔ دلیل عنکبوتی مکڑی کے جالے کا ہر ایک تار چار تاروں سے مرکب ہے اور ان چار تاروں میں سے ہر ایک چار ہزار تاروں سے مرکب ہے یعنی ہر ایک تار سولہ ہزار تاروں کا مجموعہ ہے اور پھر انتہائی باریک

ہے اگر کسی بڑے انجنیئر کو وہ مادہ دیا جائے جس سے وہ تار بنتا ہے تو وہ ہرگز نہیں بنا سکے گا کیونکہ اس قدر حقیر اور کم مادہ سے سولہ ہزار تاروں کا مجموعہ ایک باریک تار بنا دینا بڑا عظیم کارنامہ ہے پھر اس جالے میں مختلف ہندسی اشکال ہیں کیا یہ تمام کاروائی جو مکڑی جالا بنتے وقت وجود میں لائی یہ بغیر الہام الٰہی کے ممکن ہے۔؟ ہرگز نہیں۔اس سے باری تعالیٰ کا وجود ثابت ہوا۔ (تفسیر طنطاوی ج ۵ ص ۹)

۱۲۔ **دلیل لسانی**

اولادِ آدم جو زمین پر آباد ہے وہ اپنے مقصد کو اپنی زبان کے ذریعے ظاہر کرتی ہے جو اس نے اپنے والدین سے سیکھی ہے والدین نے اپنے والدین سے علی ہذالقیاس اوپر تک زبان سیکھنے کا یہ سلسلہ پہنچتا ہے اب اول انسان جس پہ دونوں فلسفوں کا قدیم ہو یا جدید اتفاق ہے کہ پہلا انسان جس سے پیشتر اور کوئی انسان نہ تھا وہ خواہ دستِ قدرت سے پیدا ہوا یا بقول ڈاروِن بشکل ارتقاء دونوں صورتوں میں سوال ہوگا کہ اول انسان نے بولی اور زبان کس سے سیکھی کیونکہ اس سے پیشتر تو کوئی انسان تھا ہی نہیں تو جواب یہی ہوگا کہ پہلے انسان کو زبان اور بولی کا علم خداوند تعالیٰ کے الہام سے حاصل ہوا اس لیے خدا موجود ہے۔

۱۳۔ **دلیل ارتقائی**

انسان قدرت کا شہکار ہے لیکن حیات ایک شعلہ ہے جو موت کے ایک جھونکے سے ختم ہو جاتا ہے لہٰذا ابدیتِ حیات ضروری ہے جس کی تحصیل کے لیے پانچ منازل طے کرنا لازمی ہے۔

۱۔ شخصی انا۔ ۲۔ ملی انا ۳۔ انسانی انا ۴۔ کائناتی انا

۵۔ الٰہی انا

شخصی انا کا مقصد یہ کہ شخص کی حرکات و اعمال کے لیے ایک بلند مقصد متعین

کیا جس کی وجہ سے جذبات کی تجدید پیدا ہو اور اعمال کا تناقض رفع ہو۔ قرآن نے وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی کے ذریعہ جذبات و خواہشاتِ شخصی کو خوفِ مجازات اعمال کے تحت محدود کیا ہے اور اعمال میں تناقض رفع کرکے یگانگت پیدا کی اور اس کے لیے مقصد تعمیر شخصیت بزنگِ صلاح متعین کیا۔

ملّی انا کے لیے افرادِ ملت کے تناقض اعمال کو ختم کرنا ہے اور شخصی مفادات کو ملت کے مفاد اجتماعی میں مدغم کرکے مقصد ملت کو متعین کرنا ہے قرآن نے اسی ملّی انا کے مقصد کو اس آیت میں واضح کیا ہے وَتَعَاوَنُوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ کہ افرادِ ملت کا جملہ تعاون حق کے لیے صرف ہو اور تعاون باطل سے کنارہ کش ہوں۔

انسانی انا کا مقصد یہ ہے کہ تمام اقوام عالم کے مقاصد کو ایک عظیم انسانی مقصد کے تحت منظم کیا جائے اور واحد انسانی مفاد کو تمام افراد انسان کے لیے نصب العین قرار دیا جائے تاکہ بین الاقوامی متضاد مفادات ایک ہی انسانی مقصد عظیم کے تحت منظم ہو کر سب انسانوں میں فکر و عمل کی یگانگت پیدا کرکے اقوام عالم کے باہمی فسادات اور محاربات کا خاتمہ کیا جائے۔ قرآن نے اسی وحدتِ مقصد کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ

اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک ماں باپ سے پیدا کیا اور بنایا تم کو قومیں اور ذاتیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان لو۔ بے شک تم میں عزت مند وہ ہے جو سب سے زیادہ پابندِ حق ہو۔

اس آیت میں وحدتِ بشری کا اعلان ہے کہ سب انسان درحقیقت ایک

ماں باپ آدم وحوا علیہما السلام کی اولاد ہے اور سب ایک ہی خدا کی مخلوق ہیں ایک اللہ کی زمین پر آباد ہیں لہٰذا سب انسانی مصلحت کے لیے کوشاں رہیں نسلی اور جغرافیائی تفریق سے بچیں کہ یہ تفریق محض تعارفی ہے تحاربی نہیں جس کی وجہ سے تم جنگیں برپا کرو ۔ عزت غلبہ اور قوت سے وابستہ نہیں انصاف اور حق پرستی سے وابستہ ہے یہ وہ انسانی انا ہے جس سے تمام اقوام ایک انسانی وحدت میں مدغم ہوجاتے ہے اور تمام مظالم اور خونریزیوں کا خاتمہ ہوجاتا ہے ۔

کائناتی انا : تمام کائنات عالم بھی ایک وحدت ہے جو انسان کی منفعت اور خدمت کے فرائض انجام دے رہی ہے وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ اللہ تعالیٰ نے تمام کائنات عالم کو تمہارے کام میں لگا رکھا ہے ۔ لہٰذا اس کو مفاد انسانی میں صرف کرنے کی کوشش کرو ، تعصب ، استعمار اور اور اختصاص فوائد کے مذموم مقصد سے اجتناب کرو ۔ اور کائنات عالم کے بیشمار فوائد کو نفع انسانی کے عمومی فائدہ میں مدغم کرو ۔

الٰہی انا :۔ اس کائناتی انا کے بعد الٰہی انا کی طرف انتقال کرو وہ یہ ہے کہ تمام اقوام دامم اور افراد بشر کائناتی مقصد مشترک کو رضائے الٰہی کے مقصد مشترک میں مدغم کردیں سب کی حرکات واعمال رضاالٰہی کے مقصد اور اس کے "قانونِ عدل کی اطاعت میں صرف ہو جس کا واحد ذریعہ ایمان وعمل صالح ہے اس سے انسان کائناتِ عالم سے بلند ہوکر خالقِ کائنات سے مربوط ہو جاتا ہے اور اس کی حیات فانی اپنے خالق سے مشابہت اور مناسبت کی وجہ سے حیات ابدی میں تبدیل ہوجاتی ہے اور اللہ ابدی کی طرح انسان اپنی زندگی کو ابدی بنا سکتا ہے ۔

خداوند تعالیٰ کے وجود پر دلائل

ہادیانِ مذاہبِ عالم اور خداء

۱۔ تمام انبیاء علیہم السلام بشمول حضرت ابراہیم و موسیٰ علیہم السلام سب کے سب خدا کے قائل ہیں (دیکھئے بائبل اور قرآن)

۲۔ کنفیوشس جو ۵۵۱ھ قبل مسیح علیہ السلام پیدا ہوئے چین میں بسنے والوں کی اکثریت اس کی پیرو ہے وہ خدا کی توحید کا قائل تھا کہتا تھا کہ خدا کی فطرت یہ ہے وہ عمل جو اس فطرت سے مطابقت رکھتا ہے ، وہ درست ہے وہ عملی زندگی کی اصلاح کا قائل تھا۔

۳۔ گوتم بدھ جس کے ماننے والے چین ، جاپان ، برہما ، تھائی لینڈ اور کسی قدر ہندوستان و پاکستان میں بھی موجود ہیں وہ کہتا تھا یقین رکھو کہ ایک بسیط اور غیر مرئی حقیقت جو اس کائنات کی روح ہے زندگی دکھ ہی دکھ ہے اس سے نجات پانے کا راستہ موت ہے ۔

۴۔ گیتا میں توحید ذاتی موجود ہے کہ خدا کی ذات ایک ہی ہے یہی کرشن کا مذہب تھا بعد میں لوگوں نے خود کرشن کو خدا بنالیا۔

۵۔ برہمن مت وحدت الوجود کا قائل تھا ، برہما ، وشنو ، اندر کو بلکہ ہر جزو کائنات کو وہ حقیقتِ مطلق کا جزو قرار دیتا ہے ۔

۶۔ شنکر اچاریہ خدا کی وحدت الوجودی تصور کا قائل تھا۔ فلسفہ خلاق

۷۔ ابراہیم زردشت خالص اسلامی توحید اور حیات لبعد الموت کا قائل تھا

۸۔ مانی جو ۲۱۵ء میں طبغون عراق میں پیدا ہوا خدا کا قائل تھا لیکن کائنات کو نور و ظلمت کا امتزاج مانتا تھا۔ انبیاء سابقین کا قائل تھا اللہ کو خالق خیر و شر مانتا تھا لیکن اس کا نظریہ رہبانیت تھا۔

۹۔ مزدک مانی کا پیرو تھا جو زن و زر اور زمین کے اشتراک کا قائل تھا قباد نے ۵۲۸ء میں اس کو قتل کیا۔

حکماء قدیم اور خداء

سقراط جو ۴۶۹ء قبل مسیح ایتھنز میں پیدا ہوا وہ خدا کا قائل تھا اور روح کو جسم میں قیدی تصور کرتا تھا کہتا تھا کہ مجھے غیب سے آواز آتی ہے مرنے کے بعد زندہ ہونے کا تصور یونانیوں میں پہلے سے موجود تھا سقراط بھی اس کا قائل تھا کہ مرنے کے بعد زندہ ہونا حق ہے وہ رہبانیت کی طرف مائل تھا۔ سوفسطائی لذتیت سے لڑتا تھا اس کو زہر کا پیالہ پلا کر قتل کیا گیا۔ اس وقت جمہوری حکومت تھی۔ (دیکھئے تاریخ الحکماء)

افلاطون، ارسطو، فیثا غورث سب خدا کے قائل تھے (ملل نحل شہرستانی)

فلاسفہ جدید اور خدا

یورپ اور امریکہ میں جس قدر کامل اور پختہ فلاسفر ہو گزرے ہیں وہ سب خدا کے قائل ہیں۔

۱۔ سب سے بڑا فیلسوف ڈاکٹر سپنسر کہتا ہے ان تمام اسرار سے یہ قطعی ثابت ہوتا ہے کہ انسان کے اُوپر ایک ازلی ابدی قوت موجود ہے جس سے تمام اشیاء

صادر ہوتی ہیں۔

۲۔ فرانس کا مشہور فیلسوف کیمل فلامریان کہتا ہے کہ تمام اساتذہ اس بات کے سمجھنے سے عاجز ہیں کہ وجود کیونکر ہوا اور کیونکر برابر چلا جاتا ہے اسی بناء پر ان کو مجبوراً ایک ایسے خالق کا اقرار کرنا پڑتا ہے جس کا مؤثر ہونا ہمیشہ اور ہر وقت قائم ہے۔

۳۔ پروفیسر لینی لکھتا ہے خدائے قادر و دانا اپنی عجیب و غریب کاریگریوں سے میرے سامنے اسی طرح جلوہ گر ہوتا ہے کہ میری آنکھ کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں اور میں بالکل دیوانہ بن جاتا ہوں۔ ہر چیز میں گو وہ چھوٹی ہو۔ اس کی کس قدر عجیب قدرت عجیب حکمت کس قدر عجیب ایجاد پائی جاتی ہے۔

۴۔ نوشل انسائیکلوپیڈیا میں لکھتا ہے۔ علوم طبیعات کا مقصد صرف یہ نہیں کہ ہماری عقل کی پیاس بجھائے بلکہ اس کا بڑا مقصد یہ ہے کہ اپنی عقل کی نظر خالق کائنات کی طرف اٹھائیں اور اس کے عظمت وجلال پر فریفتہ ہو جائیں۔

منکرین خدا کا شبہ

منکرین خدا کے شبہات صرف تین ہیں۔

۱۔ اگر مادہ قدیم نہ ہو بلکہ خدا کا پیدا کردہ ہو تو مادہ نیست سے ہست ہوا ہوگا لیکن نیست سے کوئی چیز ہست نہیں ہو سکتی اس کا جواب پہلے گزر چکا ہے۔

۲۔ امریکہ کا مشہور ملحد رابرٹ انگرسان انکارِ خدا پر یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ خدا محسوسات سے نہیں یعنی مادہ نہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ جو چیز مادی نہ ہو یا محسوس نہ ہو وہ موجود نہیں۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے علم کا ذریعہ صرف حس نہیں، عقل وجدان اور خبر صادق یہ سب اسباب علم ہیں اگر خدا عقل، وجدان یا وحی کی خبر صادق

سے ثابت ہو۔ لیکن حس سے ثابت نہ ہو۔ جب بھی خدا کا وجود یقینی ہے عثم عقدہ
موجود ہے لیکن محسوس نہیں۔ خود مادہ یعنی برق پارے غیر محسوس ہیں مگر وہ صرف
موجود تسلیم کیے گئے ہیں بلکہ تمام مادی علوم کی بنیاد ہی مادہ ہے خود زندگی مادی اور
محسوس چیز نہیں۔ لیکن اس کے موجود ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہمارے اردگرد
کا دائرہ چونکہ محسوسات کا ہے لہٰذا ہم نے موجود کو محسوس سمجھا حالانکہ موجودات کا دائرہ
محسوسات سے وسیع ہے مادیات کے دائرے میں ایک شے کا نہ ہونا اس امر کی دلیل
نہیں کہ وہ دوسرے دائرے میں بھی موجود نہ ہو۔ مچھلی اگر خشکی کے دائرے میں نہیں
تو ضروری نہیں کہ اس کا وجود بالکل نہ ہو۔ دریا اور سمندروں میں بھی مچھلیاں نہ ہوں
تمام مادی محسوسات کو وجود خدا نے دیا لیکن اس جہان فانی میں وہ خود محسوس نہیں
جیسے کل محسوسات نظر سے دیکھے جاسکتے ہیں لیکن خود نظر نظر نہیں آتی۔ اس کے علاوہ
محسوس کی دو صورتیں ہیں۔ محسوس بالذات اور محسوس بالواسطہ

محسوس بالذات یہ کہ ہم کو وہ چیز خود مثلاً آگ کے شعلے نظر آجائے اور محسوس
بالواسطہ یہ کہ آگ نظروں سے اوجھل ہو اور صرف دھواں نظر آئے جو آگ کا اثر
ہے اسی صورت میں بھی بالواسطہ آگ محسوس ہوجاتی ہے دھوئیں کے واسطے سے
یہ کل حکیمانہ کارخانۂ عالم خدا کے وجود کا اثر ہے جیسے دھواں آگ کا اثر ہے اس
لیے اس کارخانہ کے واسطے سے خدا بھی محسوس ہے جیسے آئینے کے واسطے سے
اشیاء محسوس ہوتی ہیں۔

۳۔ تیسرا شبہ یہ ہے کہ عالم میں برائی بھی ہے جو خدائے حکیم کی طرف منسوب
نہیں ہوسکتی ابن سینا نے شفا میں اس کا جواب خوب لکھا ہے کہ دنیا کی تین حالتیں
فرض کی جاسکتی ہیں یا محض بھلائی ہوگی یا محض برائی ہوگی یا زیادہ بھلائی ہوگی اور
کسی قدر برائی۔ پہلی صورت ایسی ہے جس کو خدا اختیار کرسکتا ہے کہ وہ ایسی دنیا

بنائے جو بھلائی ہی بھلائی ہو۔ صرف تیسری صورت قابلِ بحث ہے یعنی قدرتِ خداوندی کو ایسا عالم پیدا کرنا چاہیے یا نہیں، جس سے بھلائیاں زیادہ اور برائیاں کم ہوں۔ اگر ایسا عالم پیدا نہ کیا جاتا، تو بے شبہ اس پیدا ہونے سے چند برائیاں موجود نہ ہوتیں لیکن اس کے ساتھ بہت سی بھلائیوں سے محرومی ہوتی اور شرِ قلیل کی وجہ سے خیر کثیر کا ترک خلاف حکمت ہے (۲) ابن رشد نے یہ جواب دیا ہے کہ دنیا میں جو برائی پائی جاتی ہے، وہ بالذات نہیں بلکہ کسی بھلائی کی تابع اور لازم ہے غصہ بڑی چیز ہے لیکن یہ اس حاسہ کا نتیجہ ہے جس سے انسان حفاظتِ خود اختیاری کرتا ہے یہ حاسہ نہ ہو تو انسان قاتل سے اپنا بچاؤ بھی نہ کر سکے گا فسق و فجور بُری چیز ہے جس سے زنا وجود میں آتا ہے لیکن اسی جذبہ پر بقائے نسل انسانی کا مدار ہے۔

۲۔ باقی یہ اعتراض کہ اکثر اچھے لوگ دنیا میں فقر و فاقہ اور دکھ میں مبتلا ہیں اور بڑے لوگ عیش اڑاتے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ انسانی زندگی اس دنیا فانی تک ختم نہیں ہوتی عیش و عشرت کی زندگی کی یہ پوری تصویر نہیں یہ ان کی زندگی کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ یہ اشکال کہ کیا دنیا میں جو بھلائیاں برائیوں کے ضمن میں آئیں وہ الگ کیوں نہیں کی گئیں تاکہ دنیا میں صرف بھلائیاں ہوتیں اور برائی وجود میں نہ آتی اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا کرنا ناممکن ہے مثلاً آگ میں بہت بھلائیاں ہیں تمام دنیا کے ہر گھر میں اس سے روزانہ روٹی سالن، چائے وغیرہ کے پکانے کا کام لیا جاتا ہے سردی میں اس سے غسل کا پانی گرم کیا جاتا ہے اور بدن بھی سینکا جاتا ہے لیکن کبھی کبھی اس سے کپڑے اور مکان بھی جل جاتے ہیں۔ ایسی آگ ممکن نہیں کہ کھانا پکائے اور کپڑے نہ جلائے، یہی حال ہوا کا ہے، وہ مدارِ حیاتِ انسان و حیوانات اور نباتات

ہے لیکن کبھی یہ ہوا تیز چلتی ہے تو اس سے میوہ دار درخت بھی اکھڑ جاتے ہیں اور مکانات بھی گر جاتے ہیں پانی کا بھی یہی حال ہے کہ وہ مدار زندگی ہے لیکن جب سیلاب آتا ہے یا زوردار بارش ہوتی ہے تو حیوانات اور مکانات کو بھی بہا کر لے جاتا ہے۔ اور فصل کو بھی نقصان پہنچ جاتا ہے لیکن فائدہ زیادہ اور نقصان کم اور شاذ و نادر ہے

توحید باری تعالیٰ

ذات باری کا اعتراف تمام ادیان اور فلسفیوں میں اجمالی رنگ میں موجود ہے اس لیے اسلام نے زیادہ زور توحید پر دیا دیگر مذاہب میں یا تو توحید موجود نہ تھی یا ناقص تھی قرآن نے اعلان کیا وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (اگر مشرکوں سے سوال کریں کہ آسمان و زمین کو کس نے بنایا تو ضرور کہیں گے کہ اللہ نے بنایا ہے)۔ وَاِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ (جب اکیلا خدا پکارا جاتا ہے تو تم منکر ہو جاتے ہو اگر اور شریک کر لیا جائے تو تم مان لیتے ہو اور جب خدا کا تنہا ذکر کیا جاتا ہے تو منکرین قیامت کے دل بگڑ جاتے ہیں۔

ہم کو جن اسباب سے خدا کا یقین ہوتا ہے ان سے خدا کی توحید ذاتی کا بھی یقین ہوتا ہے عالم اگرچہ کثیر الاجزا اور کثیر الافراد ہے لیکن سب مل کر ایک ہے اور اسی ایک کل اور مجموعہ کے تمام پرزے ایک دوسرے سے ایسے وابستہ ہیں کہ صرف وہی ایک شخص اس کو چلا سکتا ہے جو ان تمام پرزوں کا موجد ہے اور وہی ان تمام پرزوں کے تناسب کا نگران ہے اب ایسے کارخانے کے موجد کئی خدا نہیں ہو سکتے

عالم شئے واحد ہے اور شئے واحد کی علت تامہ ایک ہوگی اگر دو ہوگی تو دوسری بالکل بیکار ہوگی اسی کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا۔ (اگر آسمان اور زمین میں کئی خدا ہوتے تو نظام عالم بگڑ جاتا)

وجہ یہ ہے کہ اگر کائنات عالم کے لیے دو خدا ہوں تو دونوں یا تو سب عالم میں تصرف کریں گے ایسی صورت میں اگر ایک خدا تصرف عالم کے لیے کافی ہوگا تو دوسرا خدا عبث اور بیکار ہوا اور اگر ایک کافی ہوگا تو ان دونوں میں سے کوئی بھی خدا نہ رہا کیونکہ ہر ایک تن تنہا تصرف عالم سے عاجز رہا اور عاجز خدا نہیں ہو سکتا اور اگر دونوں کا تصرف بطور تقسیم ہو کہ عالم کے نصف حصہ میں مثلاً ایک خدا تصرف کرے اور دوسرے نصف میں دوسرا تو ہر ایک نصف خدا ہوا۔ پورا خدا نہ ہوا۔ اور نصف خدا خدا نہیں۔ کیونکہ جز اور کل ایک نہیں ہو سکتے۔ نصف تلوار تلوار نہیں۔ نصف انسان مثلاً زید زید نہیں اگر یہ کہا جائے کہ دونوں اتفاق کر کے ایک جیسا تصرف کریں گے تو اتفاق حاجت پر مبنی ہوتا ہے کہ اختلاف میں ضرر ہوتا ہے اور اسی ضرر سے بچنے کے لیے اتفاق اختیار کیا جاتا ہے لیکن خدا کے لیے خوف وضرر اس کی خدائی کے خلاف ہے بہر حال ایک خدا سے زائد کی صورت میں نظام عالم برقرار نہیں رہ سکتا۔

توحید صفاتی وافعالی

جس طرح ذاتِ خداوندی ایک ہے تو صفات میں بھی کوئی شریک نہیں۔ صفات لوازم ذات ہیں اگر صفت میں کوئی خدا کا شریک ہوگا تو وہ بھی خدا ہوگا کیونکہ لوازم کے لیے ملزوم کا وجود ضروری ہے اس لیے خدا کے علم، قدرت، سمع، بصر، ارادہ، حیات اور خلق میں اس کا کوئی شریک نہیں اس کے فعل میں کوئی فاعل شریک نہیں۔

توحید عباداتی

جب اللہ کی ذات اور صفات میں کوئی شریک نہیں، تو عبادت میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں۔ عبادت اس ذات کی ہوتی ہے جو نفع اور ضرر پہنچانے کا سرچشمہ اور مرکز ہو اور وہی مرکز صرف ذات الٰہی ہے نہ غیر خدا قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِىْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اعلان کر دو اے پیغمبر کہ میں نفع رسانی یا ضرر رسانی کا کوئی اختیار اپنے لیے بھی نہیں رکھتا۔

توحید باری کا انسانی زندگی اور اس کے اعمال پر اثر

۱۔ اخلاقِ فاضلہ توحید کامل کے بغیر دل میں اخلاق فاضلہ پیدا نہیں ہو سکتے اطاعت خشوع، استقلال، توکل شجاعت اور اخلاص کی حالت اس وقت دل پر طاری ہو سکتی ہے جب یہ خیال ہو کہ ہماری تمام حاجتوں، ضرورتوں اور امیدوں کی تکمیل کا مرکز ایک ہی ذات ہے جو شخص ایک کے سوا دوسروں کو بھی حاجت روا مانتا ہے اس کا سر ہر آستانے پر جھک جاتا ہے۔

۲۔ تعمیرِ سیرت تعمیر شخصیت کے لیے ایک عمدہ نمونے کی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنی سیرت کی تعمیر اس بلند ذات کے نمونے پر کر سکے اور ایسی ذات صرف خالقِ کائنات ہے۔ جس کی نعمتوں کو دیکھ جذبۂ سخاوت و فیاضی پیدا ہوتا ہے اس کے حکم کو ملاحظہ کر کے ضبطِ نفس کا ملکہ پیدا ہوتا ہے اس کے علم و حکمت کو دیکھ کر علم و حکمت کا شوق بڑھتا ہے۔

اصلاح بشری وقیام امن وانصاف

عقیدۂ توحید سے اصلاح بشری اور بین الاقوامی امن قائم ہوتا ہے اور عدل وانصاف کا جذبہ فروغ پاتا ہے جب ہر موحد کے دل میں یہ عقیدہ جم جاتا ہے کہ وہ ایک حاکمِ اعلیٰ کے علم وقدرتِ قاہرہ کے تحت ہے اور اس کے سامنے ہر فعل وعمل کے لیے مسؤل ہے اور اس کی گرفت سے بچنے کے لیے کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوسکتی تو وہ دل کسی ظلم اور بے انصافی کی جرات نہیں کرسکتا چاہے انفرادی ظلم ہو یا اجتماعی اور اس طرح افراد اور حکومت دولتوں کے مظالم کا ستدباب ہوجاتا ہے۔ جو اس عقیدے کے بغیر ممکن نہیں نہ قانون کے ذریعے نہ تعلیم، پولیس اور فوج کے ذریعہ یہی وجہ ہے کہ دورِ حاضر میں پولیس، تعلیم، فوج، عدالتوں اور تمام تدابیر امن وانصاف کے باوجود امن وانصاف کا کہیں بھی وجود نہیں اور تمام تدابیر امن وانصاف ناکام ہوچکی ہیں۔

۴۔ ضُعفاء اور مظلومین کے دلوں کی تقویت

دنیا کے انسان قوی اور ضعیف، ظالم اور مظلوم میں تقسیم ہیں اور مادی اسباب کے لحاظ سے ضعیف اور مغلوب افراد واقوام کے لیے جد وجہد کا کوئی محرک موجود نہیں لیکن عقیدۂ توحید ایسے بے سہاروں اور ناامیدوں کے لیے ایک ایسی قوت ہے جس کی وجہ سے ان کے دل مضبوط اور قوی ہوجاتے ہیں اور یہی عقیدہ ان میں جوشِ عمل پیدا کرکے ان کو فاتح اور کامیاب بنا دیتا ہے صحابہ اکرام اور گزشتہ مسلمانوں کی فتوحات کا بڑا سبب عقیدۂ توحید کا پیدا کردہ جوشِ عمل تھا جس کی وجہ سے انھوں نے اپنے سے دس گنا طاقتور اقوام کو شکست دی جب موحد کا دل خالق کائنات کی عظیم طاقت کے ساتھ توحید کے رشتے کی وجہ سے مربوط ہوجاتا ہے تو حیرت انگیز کارنامے ظہور پذیر ہوجاتے ہیں۔

۵۔ عقیدۂ توحید جرأت و شجاعت کا سرچشمہ ہے

توحید کا عقیدہ یہ تصور عطا کرتا ہے کہ ہر مقصد کی کامیابی اور ہر جنگ میں فتح یابی کے لیے اگرچہ تمام مادی اسباب کی فراہمی ضروری اور فرض ہے لیکن کامیابی اور فتح یابی کا آخری فیصلہ خالقِ کائنات کی نصرت اور اس کی غیبی امداد پر موقوف ہے جس کی حکومت انسان کے ظاہر و باطن پر ہے اور اسی کے ہاتھ میں مادی اسباب کی مؤثریت اور بے اثر کر دینے کی باگ ڈور ہے جب وہی عظیم قوت ایمان و عمل صالح کے ذریعہ کسی فرد یا قوم کے ساتھ ہو تو اگرچہ وہ قوم تعداد میں اور اسباب و وسائل میں مقابل قوم سے کم ہو تو بھی اس کی نصرت قلیل التعداد جماعت کو کثیر التعداد اور کم وسائل رکھنے والی جماعت کو وسیع وسائل رکھنے والی قوم پر فتح دلا دیتی ہے۔ کَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللهِ اکثر بار ایسا ہوتا ہے کہ اللہ کی امداد تھوڑی جماعت کو بڑی جماعت پر غالب کر دیتی ہے إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ (اگر خدا تمہاری مدد کرے تو تم پر کوئی بھی غالب نہیں آسکتا) وَ إِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ (اور اگر اللہ تمہاری مدد چھوڑ دے تو کون طاقت تمہاری امداد نہیں کر سکتی۔) اس حقیقت کی صداقت کے لیے اسلامی تاریخ کے سینکڑوں واقعات واضح دلائل ہیں۔

۶۔ عقیدۂ توحید تنظیمِ ملّی کی بنیاد ہے

ایک قوم و ملت کی قوت کے لیے اس کی تنظیم ضروری ہے تنظیم اور اتحاد کی بنیاد فکر و عمل کی وحدت ہے عقیدۂ توحید موحد قوم کو فکر و عمل کی یگانگت عطا کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ ہر قسم کی قربانی کے لیے تیار ہو جاتی ہے اور کوئی دنیوی یا شخصی مفاد اس کی کامیابی کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی اور منزلِ مقصود کی راہ کی تمام رکاوٹوں کو سیلابِ توحید خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔

باب سوم

ضرورۃ الوحی والقرآن

انسان کی سعادت وشقاوت کے اُصول بتلانے کے یے عقل انسانی کافی نہیں ۔ایک تواس وجہ سے کہ عقل کے معلومات سائنس کے اُصول کے تحت تجربات اور مشاہدات کے تجزیہ و تحلیل سے ماخوذ ہیں اور سعادت و شقاوت کے اُصول عقائد، اخلاق اور اعمال کی خصوصیات کی معرفت سے ماخوذ ہیں جو کہ تجربات، مشاہدات اور محسوسات کے دائرہ سے خارج ہیں تجربہ اور مشاہدہ کے ذریعہ اُن کا تجزیہ و تحلیل نہیں کیاجاسکتا اور ان کے یے کوئی لیبارٹری ہے

دوم اس وجہ سے کہ عقل کے فیصلوں میں وہم کی مداخلت ہوتی ہے ،جس کی وجہ سے عقل کے فیصلوں میں غلطی واقع ہو جاتی ہے ۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ عقول متفاوت ہیں عقل صحیح کی صورتیں کم اور عقول فاسدہ کی صورتیں ان امور کے متعلق زیادہ ہیں

چوتھی یہ کہ عقل کے فیصلے لبا اوقات جذبات کے تحت ہوتے ہیں ،جن کی وجہ سے ان کے فیصلے اکثر غلط ہوتے ہیں ۔یہی وجہ ہے کہ اقوام عالم کی عقلوں کے فیصلے معرفت الہٰی دریافت حقیقت نبوت اور مجازات اعمال اور امورِ آخرت اور صحیح اور غلط اعمال کے متعلق متضاد ہیں ۔کوئی قوم شرک کو صحیح سمجھتی ہے کوئی تثلیث کو، کوئی خدا پرستی کو، کوئی مخلوق پرستی کو. کوئی قوم گائے کا گوشت کھانے کو معصیت سمجھتی ہے کوئی اس کے خلاف ۔ کوئی خنزیر خوری کو اچھا سمجھتا ہے، کوئی اس کے خلاف ۔کسی کا طریقہ عبادت ورضاء الہٰی کچھ ہے کسی کا کچھ۔ کسی کا تصور نبوت اور ہے کسی کا اور ۔کوئی مجازات اعمال جنت و دوزخ کی شکل میں مانتا ہے کوئی لبصورت راحت والم رُوحانی، کوئی لبصورت تناسخ ۔یہی حال تمام امور روحانیہ میں ہے،

جو اس امر کی دلیل ہے کہ مذکورہ امور میں عقل کافی نہیں۔ اب ہم وہ دلائل عقلی پیش کرتے ہیں جن سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ ان امور کی معرفت کے لیے خالق کائنات کی وحی اور کلام الٰہی یا بالفاظ دیگر قرآن کی ضرورت ہے تاکہ انسان کی سعادت و شقاوت کے اصول کا قطعی فیصلہ اس طرح طے ہو جائے کہ جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔ جس کے دلائل حسب ذیل ہیں۔

ا۔ ضرورۃ القرآن کی دلیل بقائی

پہلی دلیل، دلیلِ بقائی ہے۔ فطرۃً ہر انسان کی خواہش ہے کہ اس کو دوام بقاء و حیات حاصل ہو کیونکہ انسان کی کل نعمتیں وابستۂ حیات ہیں۔ اگر حیات نہ ہو تو کل نعمتیں مال، جاہ، اقتدار، خوراک، پوشاک، بیوی سب بیکار ہیں۔ اس فطری جذبے کی دلیل یہ ہے کہ ہر انسان کی بقاء حیات پر اگر کوئی دشمن حملہ کرے تو وہ حبِ ذات اور حبِ بقاء کے جذبے کے تحت مدافعت کی کوشش کرتا ہے اور حیات و بقاء کو محفوظ رکھنے کی جدوجہد کرتا ہے۔ اسی طرح اگر اس پر کسی بیماری کا حملہ ہو جس سے حیات و بقاء کو خطرہ لاحق ہوتا ہے تو وہ علاج معالجہ پر بڑی رقم خرچ کر کے بقاء حیات کے لیے سعی کرتا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ حبِ بقاء کا جذبہ فطری ہے۔ اب اس عالمِ تغیرات اور جہانِ فناء میں کسی انسان کو یہ فطری مقصد حاصل نہیں۔ اب اگر زندگی کے کسی دور میں بھی انسان کو دوام حیات اور استمرار بقاء کا مقصد حاصل نہ ہو تو ایسی صورت میں یہ کہا جائے گا کہ انسان نے ایک ناممکن چیز کی فطری خواہش کی جو علم النفسیات کے لحاظ سے درست نہیں، کیونکہ ناممکنات فطری مطلوب نہیں ہو سکتے اور نہ ایک ناممکن مقصد پر تمام افرادِ انسانی متفق ہو سکتے ہیں۔ یہ بات ناممکن ہے کہ دو دونے پانچ ہو تو کیا پوری انسانی تاریخ میں صرف ایک شخص ایسا مل سکتا جس کی یہ خواہش ہو کہ دو دونے پانچ ہو جائے۔ یہ ناممکن عقلی ہے۔ اسی طرح ناممکن عادی بھی فطرۃً تمام انسانوں کا مطلوب نہیں بن سکتا۔ کوئی انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے یہ خواہش نہیں رکھتا کہ وہ انسان ہو کر ساری عمر کھانے پینے اور سانس لینے سے بے نیاز ہو جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ناممکن امر

خواہ عقلی ہو یا عادی، تمام انسانوں کا فطری مطلوب نہیں بن سکتا، تو دوام حیات جو فطرۃً تمام انسانوں کا مطلوب ہے وہ ناممکن نہیں بلکہ ممکن الحصول ہے۔ اب دوام بقاء کے لیے اس دنیا میں جو عالم تغیرات ہے ایسی چیزیں موجود ہیں جو اگر جلد خراب اور بگڑنے جانے والی چیزوں کے ساتھ لگ جائے تو اُن کے ربط و تعلق سے اس کو ایک محدود زمانے تک بقاء حاصل ہو جاتی ہے۔ مثلاً تازہ مچھلی کو نمک لگا کر اور خشک کر کے ایک مدت تک باقی رکھا جا سکتا ہے۔ چین وغیرہ میں شہد سے بھرے ہوئے صندوق میں آدمی کی لاش کو رکھ کر بقاء محدود کا سامان کیا جاتا ہے۔ مصر کے آثار قدیمہ میں ایسے سیب دریافت ہوئے کہ اس پر لکھی ہوئی تاریخ سے یہ معلوم ہوا کہ پانچ ہزار سال سے وہ سیب ممی کی وجہ سے جو انسانوں کے ایک عالم تغیر میں ایک دریافت کردہ مصالحہ ہے محفوظ ہے تو کیا جب عالم تغیر میں اضافہ بقاء کا یہ سامان موجود ہے تو ابدی اور لافانی اشیاء میں ایسا کوئی مصالحہ نہیں جس کا ربط و تعلق انسان کی روح سے حاصل ہو کر اس کو دوام بقاء اور استمرار حیات کے وصف سے متصف کر دے۔ ابدی اور لازوال چیزیں اللہ اور اس کی صفات ہیں جن سے انسان کے ساتھ قابل اتصال چیز صرف اللہ کا وصف کلام یا وحی الٰہی ہے جو اپنی ابدیت کی وجہ سے انسان کے لیے دوام حیات اور بقاء مستمر کا سامان بن سکتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے مختلف انبیاء علیہم السلام پر اپنا کلام اُتارا تاکہ انسان کو دوام حیات جو اس کا فطری مطلوب ہے حاصل ہو۔ یہ شبہ کہ کلام الٰہی مثلاً قرآن تو دنیا میں نازل ہوا تو دنیا میں اس نے دوام حیات کیوں نہیں بخشا

نامعقول ہے کیونکہ دوام حیات کے لیے دارالفناء دُنیا سے منتقل ہونا ضروری ہے تاکہ مؤثراتِ فنا کے عوامل سے اس کو خارج کر کے دوام حیات کے مصالحہ سے ایسے محفوظ جہانِ حیات میں اس کو بقاء دوام حاصل ہو جہاں پر اس کی ضد اور مخالف مؤثرات موجود نہ ہوں۔ اس کے علاوہ اس جہان میں اگر دوام ہو تو کرۂ ارضی کی تنگنائی تمام افراد انسانی کی سکونت کی متحمل نہیں ہو سکے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ دوام بقاء کے فطری جذبے کی تکمیل کے لیے کلام الٰہی اور وحی ربانی

کی ضرورت ہے ۔ یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اسلامی زاویہ نگاہ سے کلامِ الٰہی پر ایمان رکھنے والوں کو جس طرح جنت کی صورت میں دوام حیات حاصل ہوگا تو منکرین کلام الٰہی اور کفار کو بھی دوزخ کی صورت میں دوام حیات ہوگا لیکن وہ حیات موت سے بدتر ہے ۔ جس کا جواب یہ ہے کہ کلامِ الٰہی کا اثر دوام حیات ہے کیونکہ کلامِ الٰہی ابدی ہے اور اس کا اثر بھی حیات انسانی کو ابدی بناتا ہے جو مومنین اور کفار دونوں کے حق میں بشکل دوام جنت اور دوام دوزخ موجود ہے تو کلامِ الٰہی کا اصل اثر دوام حیات رہا ۔ لیکن دوام حیات کی دو قسمیں ہیں ۔ دوام باراحت اور دوام بادردوام ۔ یعنی ایک سکھ کا دوام اور دوم دُکھ کا دوام ۔ یہ فرق انسانی استعداد اور طرزِ عمل نے پیدا کیا ہے کہ سکھ والوں نے ایمانی استعداد کے ساتھ کلامِ الٰہی سے ربط قائم کیا اور کفار نے مخالفت اور استعداد انکار کے ساتھ قائم کیا اس لیے دوام کی نوعیت میں فرق آیا ۔ جس کی مثال یہ ہے کہ سورج کے شعلوں کا اثر چیز کو سفید کرتا ہے لیکن جب دھوبی گھاٹ میں کپڑے دھوتا ہے اور سورج کی روشنی پڑتی ہے تو اس سے کپڑے تو سفید ہو جاتے ہیں لیکن خود دھوبی کا بدن سیاہ اور کالا ہو جاتا ہے حالانکہ سورج کا ربط دونوں سے یکساں ہے ۔ یہ تفاوت کپڑے اور دھوبی کے بدن استعداد کے فرق کی وجہ سے ہوا ۔ یہی حال اہلِ ایمان اور اہلِ کفر کا ہے ۔ قرآن نے بھی اسی فرق کو واضح کیا ہے ۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَاۗءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا
(بنی اسرائیل آیۃ ۸۲)

ہم قرآن کو اُتارتے ہیں تمام کمزوریوں کو دُور کرنے اور قوت و رحمت کا سامان کرنے کے لیے لیکن کفار کے معاندانہ ظلم کی وجہ سے یہ قرآن اُن کے لیے نقصان کا سامان بن جاتا ہے ۔

۲۔ دلیل قانونی

انسان میں فطرۃً دو قوتیں شہویہ (نزوعیہ) و غضبیہ موجود ہیں ۔ قوتِ شہویہ قدرت

نے اس کو اس لیے عطا کی ہے کہ اس کے ذریعہ اپنے فوائد کے لیے جدوجہد کرے اور غضبیہ اس لیے کہ اگر کوئی دوسری قوت ان کے ساتھ ان فوائد کے حصول میں مزاحمت اور مقابلہ کرے تو قوت غضبیہ کے ذریعہ مدافعت کرکے اس کا مقابلہ کرے۔ انسانی فوائد کے کلیات ماکولؔ، مشروبؔ، ملبوسؔ، مسکنؔ ہے اور بعد از بلوغ منکوحؔ یعنی بیوی ہے۔ یہی تمام انسانوں کے محبوب مقاصد ہیں۔ یہ سب جسمانی مقاصد ہیں، یعنی کھانے کا سامان، پینے کا سامان، پوشاک اور مکان رہائش۔ اور روحانی اور معنوی مقاصد دو اور ہیں دینؔ اور جاہؔ یعنی وہ دین اور عزت کی طلب بھی کرتا ہے۔ اور اگر کوئی مزاحمت کرے تو قوۃ غضبیہ کے ذریعہ اس مزاحم سے مقابلہ بھی کرتا ہے۔ جب یہ سب چیزیں تمام انسانوں کے مقاصد ہیں تو ہر ایک ان کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ان کے حصول کی راہ میں جو بھی مانع و حائل بنے گا تو اس کے ساتھ مزاحمت و مقابلہ کرے گا، جن کی وجہ سے ان امور میں افراد انسانی کے درمیان جھگڑے اور منازعات اور مخاصمات قائم ہوں گے اور دیوانی و فوجداری مقدمات برپا ہوں گے جو ہر ملک اور ہر قوم میں ہمیں صاف نظر آ رہے ہیں۔ اس لیے ان سات حقوق کی حفاظت کے لیے قانون عادلانہ کی ضرورت فطرتاً ناگزیر ہے تاکہ اقامتِ انصاف ہو اور نزاع ختم ہو۔ اب وہ قانون کس کا ہو؟ انسان کا یا خدا کا۔ تو یہ ظاہر ہے کہ اس قانون عادلانہ کے بنانے والے کے لیے مندرجہ ذیل چار اوصاف کا ہونا ضروری ہے۔

۱۔ علمِ محیط ۲۔ رحمتِ کاملہ ۳۔ قدرتِ تامہ ۴۔ غیر جانبداری

علم محیط اس لیے ضروری ہے کہ انسانی حقوق کے ہر پہلو کا علم رکھتا ہو اور انسانی فوائد و حقوق کے متعلق اس کو انسان کے تمام ادوار حیات پر نظر ہو یعنی دنیا، قبر، آخرت تاکہ اس کا عادلانہ فیصلہ انسانی زندگی کے ان تمام منزلوں میں درست ہو، ایسا نہ ہو کہ ایک دور کے لیے درست ہو اور باقی کے لیے غلط ہو اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ فیصلہ

انسان کے انفرادی نتائج کے لحاظ سے بھی درست ہو اور اجتماعی لحاظ سے بھی، اور ظاہری نتائج کے لحاظ سے بھی اور گہرے اور عمیق نتائج کے لحاظ سے بھی۔ مثلاً اگر انسان سُود کے جواز اور رضامندی کے ساتھ زنا اور لواطت کے جواز کا قانون بنانے جیسے یورپی قانون ہے تو اس میں شخصی آزادی کے خوش نما جذبے کا تو لحاظ رکھا گیا ہے۔ لیکن ان سب میں سوسائٹی اور معاشرے کے اجتماعی ضرر، اسی طرح سُود کے عمیق نتائج یعنی جرص میں اضافہ انسانی ہمدردی کے فقدان اور زنا اور لواطت سے صحتِ جسمانی اور عملی قوتوں کی کمزوری کی مضرتوں کو نظر انداز کیا گیا ہے نیز قبر و آخرت میں جو ان پر عذاب ہوگا اکو بھی پسِ پشت ڈال دیا گیا ہے۔

رحمتِ کاملہ اس لیے ضروری ہے کہ قانون عادلانہ کی تدوین کے وقت غفلت نہ برتی جائے اور دیدہ و دانستہ قانون میں ایسے اجزاء شامل نہ کر دے جو خلافِ انصاف ہوں۔

قدرتِ کاملہ اس لیے ضروری ہے کہ کسی دباؤ میں آکر راہِ عدل سے انحراف نہ کر دے یا مجرم کو سزا دینے میں کمزوری نہ دکھائے۔

لا جانبداریت یعنی قانون ساز کے لیے غیر جانب دار ہونا اس لیے ضروری ہے کہ وہ ہم قوم ہم وطن، ہم رنگ اور ہم زبان لوگوں کی طرف داری نہ کرے اور قانون سازی میں ان کی رعایت کرکے اوروں کو نقصان نہ پہنچائے، جیسے کہ اہلِ یورپ آج کل ایسا کرتے ہیں۔

یہ چاروں صفات جو قانونِ عادلانہ کی تشکیل کے لیے ضروری ہیں وہ صرف ذاتِ خداوندی میں موجود ہیں، نہ اس کے برابر کسی کا علم محیط ہے نہ اس کے برابر کسی کی رحمت۔

اَللّٰہُ اَرْحَمُ بِعِبَادِہٖ مِنَ الْاُمِّ بِوَلَدِھَا۔ خدا کی رحمت اس سے زیادہ ہے جو ماں کو اولاد پر ہے۔

نہ اس کے برابر کسی کی قدرت ہے کہ کسی سے دب کر قانون بنانے میں اس کی رعایت کرے یا مجرم کی سزا میں کسی سے ڈرے، اور صرف خدا کی ذات ہے جو غیر جانبدار ہے نہ وہ کسی کے

ساحقہ قومیت یا وطن میں شریک ہے کہ ہم قوم اور ہم وطن لوگوں کی رعایت کرے نہ کسی کا ہم رنگ اور ہم زبان ہے بلکہ وہ ایسی ذات ہے جو لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ، لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ "نہ اس کی نسل ہے نہ کسی سے شرکت ہے" اس لیے قانون عادلانہ جو انسان کا فطری حق ہے وہ صرف اسی ذات سے مختص ہے۔

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی، باقی بتانِ آذری

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ ۔ (یوسف آیہ ۳۶)
قانون بنانا صرف خالقِ کائنات کا حق ہے

اور وہی قانونِ خداوندی، وحی الٰہی اور احکامِ ربانی یا قرآن کا نام ہے لہذا قرآن کی ضرورت نوع انسانی کے لیے ثابت ہوئی۔ بہر حال انسانی حقوق کے متعلق قانون خداوندی کے سوا کسی انسانی قانون کی حکمرانی جاہلیت کی حکمرانی ہے۔

أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ۚ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ۔

کیا لوگ انسان کے جاہلانہ قانون طلب کرتے ہیں اللہ سے بہتر قانون کس کا ہے اس قوم کے لیے جو حقیقت پر یقین کرتی ہو۔ مائدہ آیہ ۵۰

غیر حق چوں ناہی و آمر شود
زور بر ناتواں قاهر شود

زیر گردوں قاہری از آمری است
آمری از ما سوی اللہ کافری است۔ (اقبال)

۲۔ ضرورۃ القرآن کی دلیل غذائی

دلیل غذائی انسان جسم اور روح سے مرکب ہے جس میں روح جسم کی نسبت اعلیٰ اور اشرف ہے اور بدن اس کی نسبت ادنیٰ اور خسیس ہے یہی وجہ ہے کہ جب موت کے ذریعہ بدن سے روح نکل جاتی ہے تو بدن بیکار ہو جاتا ہے اور روح کی یہ برتری اس قدر واضح اور بدیہی ہے کہ حیوانات اور جمادات تک اس سے باخبر ہیں۔ مثلاً اگر روح بدن میں موجود ہو اور وہ کئی دن کسی جگہ سویا ہوا ہو تو کوئی

چیز اس پر حملہ آور نہیں ہوتی، نہ کیڑے مکوڑے پاس پھٹکتے ہیں، نہ کوے گدھ اس کا گوشت نوچتے ہیں، نہ زمین اس کے بدن کو کھاتی ہے اور نہ ہوا اور سورج کی دھوپ اس کو بدبودار کر سکتی ہے۔ لیکن اسی انسان کے بدن سے جب جان اور روح نکل جاتی ہے تو جمادات اور حیوانات اس پر حملہ آور ہو جاتے ہیں حالانکہ مرنے سے پہلے وہ کائنات کا حاکم تھا نہ محکوم۔ وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ۔ [1] پھر زمین اس کے جسم کو کھاتی ہے اور دھوپ بدبو کرنا شروع کرتی ہے اور کیڑے مکوڑے ناک اور منہ میں گھسنا شروع کرتے ہیں اور کوے گدھ اس کا گوشت نوچنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ سب چیزیں جو پہلے انسان سے مغلوب تھیں موت کے بعد کیوں غالب آ گئیں۔ اسی وجہ سے کہ وہ الہام الٰہی کے ذریعہ اس امر سے واقف ہیں کہ انسان میں قوت و غلبے کی علت اس کی روح ہے۔ موت سے جب وہ جدا ہوئی تو اب وہ غالب نہیں رہا بلکہ ان سب چیزوں سے مغلوب ہو گیا جو روح کی برتری کی دلیل ہے۔ اب جب بدن کم تر اور روح برتر ہے اور کمتر کی غذا کے لیے قدرت نے انتظام کیا ہے، یہاں تک کہ گندم کا دانہ جس کو انسان کھاتا ہے تو اس کا پودا جب بنتا ہے کہ وسیع کارخانہ عالم اس میں اپنا کام کرے۔ زمین اور پانی تخم گندم سے پودا اگاتے ہیں۔ ہوا اس کو تازہ و تر رکھتی ہے ستاروں کی کشش اس کی نشوونما کی خدمت کرتی ہے، سورج اس فصل اور دانے کے پکا کر دینے میں مددگار ہے۔ اس طرح یہ وسیع کارخانۂ عالم بدن انسانی کی تیاری میں لگا ہوا ہے یہاں تک کہ سورج سمندروں سے بخارات اڑا کر بادل میں تبدیل کرتا ہے تاکہ پانی برسے اور اس حقیر جزء انسانی یعنی بدن کی غذا کی تکمیل ہو۔ اب یہ ضروری ہے کہ قدرت نے ضرور انسان کے اس اعلیٰ اور برتر جزء کی غذا کا بھی انتظام کیا ہو گا کیونکہ یہ ممکن نہیں اور حکمت خداوندی کے خلاف ہے کہ کمتر جزء کی غذا کا انتظام کیا جائے اور اعلیٰ جزء کی غذا کو نظر انداز کیا جائے۔ یہ تو ایسا ہو گا کہ کوئی گھوڑے پر سوار شخص کسی کا مہمان ہو جائے وہ گھوڑے کے کھانے پینے کا انتظام کر دے لیکن خود گھوڑے کے سوار یعنی اس شخص کو نظر انداز کر دے زندگی کا بندوبست

---

[1] سورۃ الجاثیۃ آیۃ ۱۳

نہ چلنے کا۔ یہاں بھی بدن سواری کی طرح ہے ،اور روح اُس پر سوار ہے ۔ اگر بدن اور سواری کی غذا کا انتظام قدرت کی طرف سے ہوا ہے تو رُوح کی غذا ۔ کا انتظام بھی ضروری ہے کیونکہ نہ گھوڑا غذا کے بغیر اپنے فرائض بجا لا سکتا ہے نہ گھوڑے کا سوار فرائض پورے کر سکتا ہے اس لیے کہ غذا کی ضرورت دونوں کو ہے دونوں یعنی بدن اور روح اسی عالم تغیر میں رہائش رکھتے ہیں اور دونوں اپنے اپنے فرائض کی بجا آوری میں غذا کے محتاج ہیں ورنہ گھوڑا چل سکے گا اور نہ سوار ، جو کئی دن سے غذا سے محروم ہو گھوڑے کے لگام کو قابو میں رکھ سکے گا اور ممکن ہے کہ ٹھوکر لگنے سے دونوں کا خاتمہ ہو جائے ۔ بدن زمینی ہے اور اس کی غذا بھی زمینی ہے لیکن روح امرِ ربّی ہونے کی وجہ سے عالمِ بالا سے تعلق رکھتی ہے لہٰذا اس کی غذا بھی لطیف اور عالمِ بالا سے ہونی چاہیئے اور وہ غذا وحیِ ربانی اور کلام الٰہی یا قرآن ہے جس میں غذا ہونے کی دو خصوصیات موجود ہیں ۔ میلان طبعی ، اور نشوو ارتقا جیسے غذاء مثلاً روٹی اور گوشت کی غذا ہونے کی یہ دو علامتیں ہیں ۔ اوّل طبیعت کا مائل ہونا پتھر اور لوہا غذاء جسمانی اس لیے نہیں کہ اس کی طرف میلان نہیں ۔ کوئی نہیں چاہتا کہ وہ پتھر لکڑی کو پیس کر کھائے یا لوہے کا برادہ بنا کر کھائے ۔ دوم نشوونما بھی ، جو گوشت روٹی میں موجود ہے وہ پتھر اور لکڑی دونوں میں نہیں ۔ اگر کوئی پتھر اور لکڑی پیس کر کھائے تو ترقی بدن نہیں ہوگی بلکہ بدن ہلاک ہو گا ۔ یہی دو علامتیں غذاء روحانی ہونے کی قرآن میں موجود ہیں میلان بھی کہ اجنبی زبان اور ضخیم کتاب ہونے کے باوجود لوگ اس کی تلاوت کرتے ہیں اور اس کو حفظ کرتے ہیں اور بقاء حفظ کے لیے موت تک اس کا دور و تکرار کرتے ہیں اور وقت اور محنت کی یہ قربانی قرآنی غذائیت کی روحانی کشش کا نتیجہ ہے اس لیے وہ غذا روحانی ہے اگر غذا جسمانی نہ ہونے سے موت جسم واقع ہوتی ہے تو غذاء روحانی نہ ہونے سے موت روح جو حقیقی موت ہے واقع ہو جاتی ہے اور اسی غذاء قرآنی سے حیاتِ حقیقی کا پیدا ہونا اس آیت میں مذکور ہے ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ

اے ایمان والو! اللہ و رسول کا کہا مانو جبکہ وہ کو اس قرآن کی طرف بلاتے ہیں جس میں تمہاری حقیقی زندگی ہے۔ سورہ انفال رکوع ۳ پارہ ۹ آیۃ ۲۴

وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ ۭ

سورۃ فاطر آیۃ ۲۱

اعلان کر دو کہ قرآنی غذا سے محروم مردہ لوگ ان لوگوں کے برابر نہیں جنہوں نے قرآن کی غذاء رُوحانی سے حقیقی حیات پائی ہے۔

۴۔ دلیلِ دوائی

اس عالم تغیر میں بدنِ انسانی اور روحِ انسانی دونوں کو تغیرات پیش آتے رہتے ہیں جن کے اسباب بدن کے لیے یا مخالف آب و ہوا یا فاسد غذا۔ یا کسی غیر موزوں فعل و حرکت کا ارتکاب، یا کوئی اور حادثہ ہوتا ہے۔ اسی طرح روح کے لیے گندہ، فاسقانہ، ملحدانہ مشرکانہ ماحول، بری تعلیم، بری تربیت، برا قانون اور برے افعال روحانی امراض کے اسباب ہیں جس کی وجہ سے ڈاکٹر یا حکیم کی طرف علاج کے لیے رجوع کیا جاتا ہے۔ قدرت نے جب انسان کو اس عالم تغیر میں بسایا ہے تو ساتھ ہی اسی عالم کون و فساد میں اس نے اُن کے امراض اور بدنی تغیرات کے علاج کے لیے قدرتی دوائیں بھی رکھی ہیں تاکہ ان کے استعمال سے وہ صحت یاب ہو۔ بدن اور اس کی دوا چونکہ دونوں مادی چیزیں ہیں اس لیے انسان اپنے تجربہ و تحلیل و تجزیہ کے ذریعہ اُن کی خاصیات کو دریافت کرکے بدنی امراض کے ازالہ کے لیے ان کو استعمال کر سکتا ہے اور مسلسل تجربہ کے ذریعہ ایک جسمانی طب کے قوانین کو مرتب کرنے کی اہلیت رکھتا ہے لیکن روح انسانی اور اس کے صفات اور امراض تجربہ انسانی کے دائرہ سے خارج ہیں۔ اس لیے اس کے متعلق نہ انسان کوئی تجربہ کر سکتا ہے نہ اس کے امراض کی تشخیص کر سکتا ہے اور نہ مؤثر ادویہ کو متعین کر سکتا ہے۔ روح خود امرِ ربی اور عالم بالا سے متعلق

حقیقت ہے لہذا اس کی دوا بھی عالم بالا سے ہوگی جس سے اس کے امراض کا ازالہ ہوگا۔ زمینی دوا ، اس پر اثر انداز نہیں ہوسکتی کیونکہ خود روح زمینی نہیں اور روحانی امراض کا علاج بدنی امراض کے علاج سے زیادہ اہم ہے کہ بدنی مرض سے وقتی موت اور روحانی مرض سے دائمی موت و ہلاکت واقع ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ بدن کا معالجہ خالق کائنات نے خود انسانی تجربے کے سپرد کردیا ہے لیکن روحانی علاج کے لیے سلسلۂ انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ انتظام فرمایا۔ وہی انتظام وحی الہٰی اور کلام ربانی ہے جو صحت روحانی کا علاج مجرب اور نسخۂ بے خطاء ہے۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ۔ (بنی اسرائیل آیۃ ۸۱)

ہم نے قرآن اُتارا جس میں روح کا علاج اور اس کی قوت بخشی کا سامان موجود ہے جو اللہ کی رحمت ہے یقین کرنے والوں کے لیے۔

اس لیے قرآن کے سوا اس وقت ازالۂ امراضِ روحانی و فیضانِ صحتِ روحانی کے لیے اور کوئی علاج اور نسخہ کائنات میں موجود نہیں کیونکہ مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ کے تحت قرآن تمام شرعیات انبیاء علیہم السلام سابقین کو شامل اور اس میں ابدی صحتِ روحانی کے ابدی اصول موجود ہیں یہی وجہ ہے کہ یورپ نے علوم کے انبار پڑھ ڈالے اور انہی کے ذریعہ آسمان ترقی پر پہونچے لیکن اس شفاء روحانی سے محرومی کی وجہ سے شرفِ انسانیت سے محروم ہیں نہ ان میں نیکی ہے نہ خدا ترسی، نہ عدل نہ اطمینانِ قلب نہ امن۔ بلکہ ان کی مریض اور گندہ روحوں کی وجہ سے دنیا روز بروز جہنم کدہ بنتی جارہی ہے اور فواحش و منکرات اور خونریزی کا وہ سیلاب موجزن ہے جس کے رُک جانے کی اُمید نہیں بلکہ پوری دنیا کی تباہی کا شدید خطرہ پیدا ہوگیا ہے کیونکہ بُرائی روز افزوں ہے۔

۵۔ دلیلِ نوری

اشیاء کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مبصرات جو آنکھوں سے نظر آتی ہیں جیسے زمین سے آسمان تک

کی چیزیں دوم غیر مبصرات بلکہ معقولات جیسے ایمان کفر، طاعۃ، معصیت اعمال انسانی کا حسن وقبح، پہلی قسم کی چیزوں کے لیے قدرت نے دو نُور پیدا کئے ہیں داخلی نُور اور خارجی نُور

داخلی نُور یعنی آنکھ کی روشنی جو داخل انسان میں ہے۔ اگر کسی کی آنکھ آندھی ہو اور بینائی کے نُورِ داخلی سے محروم ہو تو وہ سانپ اور رسی میں فرق نہیں کر سکتا۔

دوم نورِ خارجی جو انسان سے باہر ہے۔ مثلاً سورج یا خاص مثلاً بجلی، لالٹین، چراغ وغیرہ جو انسانی بدن سے خارج اور باہر ہے اگر یہ خارجی روشنی نہ ہو تو چاہے داخلی روشنی یعنی آنکھ کی بینائی درست ہو، جب بھی تاریکی میں وہ سانپ اور رسی میں فرق نہیں کر سکتا۔ دونوں نُور خارجی اور داخلی جمع ہوں تب علم وامتیاز حاصل ہوگا۔

اسی طرح دوسری قسم کی چیزوں کے لیے بھی داخلی اور اندرونی روشنی یعنی عقل کی روشنی اور خارجی یعنی آسمانی روشنی کی ضرورت ہے تاکہ وہ ایمان وکفر، نیک وبد خیر وشر میں فرق کر سکے وہ خارجی روشنی رُوحانی امور کے لیے کلام الٰہی ہے جو سورج کی طرح آسمانی نُور ہے۔

وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْ اُنْزِلَ مَعَہٗ — اعراف، آیۃ ۱۵۶ — پیروی کرو اس روشنی کی جو حضورؐ کے ساتھ نازل کی گئی ہے۔

۶۔ دلیلِ حُبّی

انسان بدن اور روح کا مجموعہ ہے وہ بدن اور جسم کے لحاظ سے جسمانی محبوبات مثلاً کھانے پینے، پوشاک مکان اور جو ان محبوبات کی تحصیل کا ذریعہ ہو مثلاً مال کا خواہاں ہے یعنی ان سے فطرۃً محبت کرتا ہے۔ اسی طرح اپنی روحانی خواہش کو فطری تقاضا کے تحت وہ فطرۃً خالقِ کائنات اور خدا سے بھی محبت کرتا ہے، جو اس کا فطری تقاضا ہے، یہی وجہ ہے کہ انسان اپنی پوری تاریخ میں اسی حبِّ الٰہی کے تقاضا سے خالی نہیں رہا خواہ اُس نے اس فطری تقاضا کا صحیح اظہار کیا ہے جیسے موحدین ومؤمنین نے، یا غلط اظہار کیا ہے جیسے مشرکین

اور بُت پرستوں نے کہ انہوں نے غیر اللہ کو اللہ کا مظہر سمجھ کر اس کی عبادت کی، لیکن ان دونوں صحیح اور غلط طریقوں کی پرستش کا اصل محرک یہی حُبِّ الٰہی کا فطری جذبہ رہا یہاں تک کہ روس اور چین کے منکرین خدا بھی اسی جذبہ کی وجہ سے مجبور ہوئے، کہ چونکہ اس فطری جذبۂ حُبِّ الٰہی کو مٹایا نہیں جاسکتا۔ اس لیے انہوں نے اس فطری جذبہ کی تسکین کے لیے لینن اور ماؤزے تنگ کی تصویریں اور مجسمے قدم قدم پر نصب کر دیئے جن کی پرستارانہ تعظیم انہوں نے عملاً جاری کی۔ میں نے "کمیونزم اور اسلام" نامی اپنی کتاب میں کمیونسٹوں کا یہ قول نقل کیا کہ خدا کی جگہ پر لازم ہے کہ ہم ایک مصنوعی خدا لوگوں کے لیے لبطور بدل تجویز کردیں تاکہ اس فطری جذبے کی تسکین کا سامان ہو چنانچہ انہوں نے اشتراکیت کے ممتاز لیڈروں کو یہ مقام دیدیا۔ بہرحال اس سے ثابت ہوا کہ محبتِ الٰہیہ فطری جذبہ ہے اور ہر جذبے کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ اس حبِّ الٰہی کے لیے مظہر ہونا ضروری ہے اور وہ مظہر خدا کی پسند اور ناپسند کی پیروی کرنا ہے کیونکہ ہر محبوب کی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ جو امور اس کو پسند ہوں محبّ اس کو بجالائے اور جو ناپسند ہوں اُن سے اجتناب کرے تاکہ جذبہ محبت کی تکمیل ہو لیکن اس امر کا فیصلہ کہ خدا کی پسند اور ناپسند چیزیں کونسی ہیں تاکہ اس کی مرضیات اور لامرضیات کا پتہ لگ سکے یہ اسی وقت ممکن ہے۔ کہ خدا خود اپنے کلام کے ذریعہ اپنی پسند اور ناپسند امور کا تعین کر دے۔ خدا تو بہت بلند ہے اپنے جیسے انسانوں کی مرضی اور لامرضی اور پسند اور ناپسند کا پتہ ہمیں نہیں لگ سکتا۔ تاوقتیکہ وہ اپنے کلام کے ذریعہ سے اس کی وضاحت نہ کر دے یہاں تک کہ میزبان کے پاس اگر مہمان آجائے تو اس سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ تم کس قسم کا کھانا پسند اور کونسا ناپسند کرتے ہو تاکہ اس کے مطابق انتظام کیا جائے۔ جب مہمان قول و کلام کے ذریعہ بتلادے تب اس کے پسند کھانے کا انتظام کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ خدا کی محبت کی تکمیل کے لیے وہ ہمیں بتلادے کہ فلاں عقائد و اخلاق و اعمال و اقوال اس کو پسند ہیں اور فلاں ناپسند۔ جب جاکر اس کی رضامندی کی راہ کھل سکتی ہے اور محبت

کا تقاضا پورا ہو سکتا ہے اور یہ بتلانا بغیر کلام الٰہی کے ناممکن ہے اس لیے وحی اور کلام الٰہی کی ضرورت ہے تاکہ اس کی مرضیات اور نامرضیات کا علم حاصل کیا جا سکے اور وہ کلام قرآن ہے جس سے ضرورت قرآن ثابت ہوئی۔

۷۔ دلیل اتباع

دنیا میں اتباع اور تابعداری موجود ہے۔ اولاد والدین کی اطاعت کرتی ہے، تلامذہ اور شاگرد اپنے اساتذہ کی اطاعت کرتے ہیں۔ رعیت حکومت کی اطاعت گذار ہے، ماتحت عملہ اپنے افسران کا تابع فرمان ہے۔ زیر احسان افراد اپنے محسن کے وفا شعار ہیں۔ یہ صورتیں اور ان صورتوں کے علاوہ تابعداری کی جس قدر شکلیں ہیں وہ سب فطری اور معقول ہیں اور اسی اطاعت کی وجہ سے نظامِ تمدن قائم ہے۔ اگر اولاد اپنے والدین کی اطاعت نہ کرے تو عائلی زندگی تباہ ہو جائے گی، شاگرد استاد کا کہا نہ مانے تو نظام تعلیم درہم برہم ہو جائے گا، رعیت میں حکومت کے لیے اور ماتحت عملے میں افسران کی اطاعت نہ ہو تو نظامِ مملکت ختم ہو جائے گا اسی طرح جس پر احسان کیا جائے وہ اگر محسن کا تابع فرمان نہ ہو تو دنیا سے احسان کا وجود ختم ہو جائے گا۔

اب غور طلب امر یہ ہے کہ دنیا عالم اسباب ہے لہذا اس دنیا میں ہر چیز کے لیے کوئی نہ کوئی علت اور سبب کا ہونا ضروری ہے۔ بنا بریں ان مذکورہ اطاعتوں کے لیے علتِ اطاعت اور سبب اتباع کا ہونا ضروری ہے۔ وہ سبب اطاعت کیا ہے وہ خود ان امور میں غور کرنے سے نمایاں ہے اور وہ صرف دو چیزیں ہیں۔ ایک احسان دوم اقتدار۔ اولاد پر والدین، شاگرد پر استاد اور زیر احسان افراد پر محسن کا احسان ہے۔ اور احسان ان تینوں صورتوں میں اطاعت کا جذبہ پیدا کرنے کا فطری سبب ہے۔ حکومت کو رعیت پر اور ماتحت عملہ پر اقتدار حاصل ہے جو اطاعت کا سبب ہے۔ ان پانچ صورتوں کے علاوہ دو صورتیں اور بھی ہیں جن میں اطاعت پائی جاتی ہے۔ مثلاً عاشق معشوق کی اطاعت کرتا ہے۔ عوام اہلِ علم مثلاً امام ابو حنیفہ

امام بخاریؒ اور اہلِ معرفت مثلاً شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ و دیگر بزرگان دین کی اطاعت کرتے ہیں۔ ان دونوں صورتوں کا سبب ایک ہی چیز ہے وہ حسُن یعنی خُوبی ہے خواہ ظاہری حسُن ہو جیسے معشوق کا حسُن عاشقوں کی نظر میں یا باطنی اور معنوی حسُن ہو جو علماء، دین اور بزرگان دین میں موجود ہے۔ لہٰذا اطاعت کی تمام صورتوں کے علل و اسباب صرف تین ہیں۔

۱۔ قدرت ۲۔ احسان ۳۔ حسُن

یعنی تین اسباب میں جہاں کہیں ایک سبب بھی موجود ہوگا اس کا فطری تقاضا یہ ہوگا کہ وہاں اطاعت کی جائے گی۔ اب ہم اسی معیار پر انسان اور خالقِ کائنات کا تعلق پرکھتے ہیں۔ اگر خدا میں اسبابِ اطاعت موجود ہوں تو اس کی اطاعت بھی انسان کے لیے لازمی ہوگی ورنہ نہیں ظاہر ہے کہ انسان میں جو قدرت ہے یا احسان جس کا معنی بخششِ نعمت ہے یا حسُن وہ سب خالقِ کائنات کا عطیہ اور بخشش ہے کہ وہی ہر قدرت و نعمت و حسُن کا اصلی مرکز ہے۔ اس کی قدرت کے برابر کسی حاکم اور انسانی بادشاہ کی قدرت نہیں نہ اس کے برابر کوئی احسان کر سکتا ہے اور نہ اس کے برابر کسی میں حسُن ہے کہ ہر حسین ظاہری و باطنی کا حسُن اسی ذات کا عطیہ ہے۔ انسانوں میں یہ تین اسباب ضعیف ہیں اور خدا میں قوی تر۔ پھر انسان میں تین اسباب ضعیفہ میں سے صرف ایک سبب موجود ہے، اور خدا میں تینوں کے تین جمع ہیں اور قوی تر درجے میں۔ تو کیا پھر فطرۃً اس کی اطاعت لازمی اور ضروری نہ ہوگی؟ یقیناً ہوگی لہٰذا خدا کی ہستی عقلاً واجب الاطاعت ٹھہری، اور اطاعت نام ہے حکم ماننے کا۔ لہٰذا اس فطری اتباع اور اطاعت کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس خدا کے احکام کا مجموعہ بشکل کلام اور وحی انسانوں کو پہونچے تاکہ اتباع و اطاعت، کے اس فطری جذبے کی تکمیل کا سامان ہو، وہی کلام قرآن ہے جو ابد تک محفوظ ہے۔ لہٰذا قرآن کی نوع انسانی کے لیے ضرورت ثابت ہوگئی۔

۸۔ دلیلِ نفسیاتی

انسان اگر اپنے نفس اور رُوح کے آئینہ پر نظر ڈالے تو کلام الہٰی یا قرآن کی ضرورت

خود اس کے دل و دماغ اور ضمیر کی خاموش آواز ہے۔ ایک سلیم الفطرت انسان خواہ صحرائے افریقہ میں ہو یا آزاد قبائل کے کوہستان میں، جب وہ کسی برائی کا ارتکاب کرتا ہے۔ خواہ زنا ہو یا قتلِ ناحق تو اس کا دماغ اور ضمیر اس کے جرم کے ارتکاب سے ضرور متاثر ہوتا ہے اور وہ خود اپنے ضمیر کے اندر اس جرم کے اثر سے ایک قسم کا انفعال، تاثر اور تکدر و انقباض محسوس کرتا ہے اگرچہ اس کے اس فعل پر کوئی گرفت کرنے والا موجود نہ ہو اور نہ کوئی حکومت موجود ہو اور نہ کوئی عدالت یا پولیس اور نہ اس جگہ کوئی ضابطہ قانون نافذالعمل ہو بلکہ وہ علاقہ جس میں یہ جرم عمل میں آیا ہے، ہر قانون سے آزاد ہو۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی حالت میں اس تاثر، تکدرِ قلب اور انقباضِ دماغ کا سبب کیا ہے؟۔ اگر کہا جائے کہ یہ تاثر اس وجہ سے ہے کہ اس نے جرم کیا یعنی قانون کو توڑا ہے تو مفروضہ صورت میں کوئی انسانی قانون موجود نہیں اور نہ سزا کا اندیشہ ہے پھر تاثر کیوں پیدا ہوا؟۔ ظاہر ہے کہ چاہے غیر شعوری طور پر سہی لیکن مذکورہ جرم کے ضمیر نے محسوس کیا کہ اس نے کسی قانون کی خلاف ورزی ضرور کی ہے۔ اگر وہاں انسانی قانون ناپید ہے تو ایک حقیقی اور الٰہی ضابطہ انسانی اعمال کے متعلق ضرور موجود ہے۔ کہ اس جرم سے اس ضابطہ کو توڑا گیا ہے اور وہی حقیقی اور الٰہی قانون جس کی خلاف ورزی نے اس مجرم کے ضمیر میں تاثر پیدا کیا وہ کلامِ الٰہی ہے۔ یا بالفاظ دیگر قرآن ہے جس سے قرآن کی ضرورت نفسیاتی تاثر ثابت ہوئی۔

۹۔ دلیلِ تخلیقی

عالَم یعنی ماسوا اللہ صرف دو چیزوں کا نام ہے۔ انسان اور خادمِ انسان۔ اور ان دونوں کا نام عالم ہے۔ عالم چونکہ تخلیقِ الٰہی اور فعلِ خداوندی ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اس کی تخلیق میں کوئی حکمت ہوگی جب کہ انسان حقیر کوئی فعل بلا منفعت و حکمت نہیں کرتا

تو خالق حکیم کیونکر بے فائدہ اور بے مصلحت کام کرے گا۔ مشہور ہے۔ فِعْلُ الْحَكِيمِ لَا يَخْلُوْ عَنِ الْحِكْمَةِ۔ اب مخلوقاتِ الٰہیہ میں عقلاً وجودِ حکمت ضروری ٹھہرا، خواہ انسان ہو یا خادم انسان۔ مؤخرالذکر یعنی خادم انسان کی حکمت کی دریافت بالکل ظاہر ہے کہ عرش سے لے کر فرش تک کل کائنات خادم انسان ہے جن سے انسان کی پرورش ہوتی ہے خواہ انسان اس کو جانے یا نہ جانے زمین معدنیات، نباتات، حیوانات، آگ، ہوا سمندر سب سے انسان کی منفعت وابستہ ہے سورج کی گرمی اور روشنی، ستاروں کی چمک اور کشش سب انسان کی فائدہ رسانی میں مصروف ہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ط سورۃ الجاثیۃ آیۃ ۱۳ — اور مسخر کیا تمہارے واسطے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔

خالقِ کائنات نے زمین و آسمان کو تمہاری خدمت اور نفع رسانی میں لگا دیا ہے اور ایسی زبردست تسخیری اور جبری ڈیوٹی میں ان سب کو جکڑ دیا ہے کہ کسی نگران کی ضرورت نہیں اور نہ ادائے خدمت انسان میں سستی اور غفلت کا اندیشہ ہے۔ لہٰذا ماسوائے انسان جو مخلوقات ہیں ان کی حکمتِ تخلیق واضح ہے کہ انسان کی خدمت گذاری اور اس کی تربیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ان اشیاء میں ایک بھی موجود نہ ہو تو انسان زندہ نہیں رہ سکتا جس سے یہ ثابت ہوا کہ انسان کی زندگی کو قائم رکھنا ان تمام چیزوں کی تخلیق کا مقصد ہے لیکن یہ چھوٹا سا انسان جس کی خدمت گذاری کے لیے قدرت نے اس قدر کائنات کا عظیم الشان کارخانہ پھیلا رکھا ہے۔ اس کی تخلیق کس حکمت کے لیے ہوئی ہے؟ کارخانۂ کائنات کا مقصد تو خود انسان ہے لیکن خود انسان کی تخلیق کس مقصد کے لیے ہوئی۔ وہ مقصد ظاہر ہے کہ کارخانۂ عالم سے متعلق نہیں، کیونکہ عرش سے فرش تک کی کائنات کو انسان کی تخلیق اور وجود سے کوئی فائدہ نہیں البتہ انسان کو ان سے فائدہ ہے جس کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اگر یہ کارخانہ نہ ہو تو انسان زندہ نہیں رہ سکتا بلکہ معدوم ہوگا لیکن اگر انسان نہ ہو اور باقی کارخانہ موجود ہو تو وہ قائم رہ سکتا ہے اور اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ انسان سب سے اشرف ہے لہٰذا

اس کا مقصد بھی اشرف ہوگا جیسے گھوڑا اشرف ہے گدھے سے تو اس کا مقصد بھی گدھے کے مقصد سے اعلیٰ ہوتا ہے۔ وہ مقصد تخلیق انسانی اس کے بغیر کچھ نہیں کہ جہاں انسان کے لیے ہے اور انسان خالقِ جہان یعنی خدا کے لیے ہے کہ وہ نائب اور خلیفہ خدا ہونے کی حیثیت وہ کام کرے جو اس کے آقا کا منشا ہے۔ اسی منشاء الٰہی پر خود عامل ہو اور دوسروں کو عامل بنائے۔ اسی کا معنی ہے عبدیت اور بندگی۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ الذریٰت آیۃ ۵۶ — جن و انس کی تخلیق خالقِ کائنات کی عبدیت اور بندگی کے لیے ہے۔

اس بندگی اور منشاء الٰہی کی تکمیل میں خدا کا کوئی نفع نہیں بلکہ خود انسان کا فائدہ ہے کہ اس طرح وہ اپنے مقصد تخلیق کی تکمیل کرکے حیاتِ ابدی کی مسرتوں سے بہرہ ور ہو جائے گا۔ اب مقصدِ تخلیق یا منشاء الٰہی معلوم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ خود خدا اپنے منشاء کی وضاحت کر دے اور وہ وضاحت اللہ کے کلام اور وحی الٰہی کے بغیر ناممکن ہے۔ لہٰذا کلام الٰہی کی ضرورت ثابت ہوئی جو قرآن حکیم ہے۔

۱۰۔ دلیلِ ترحمی

رحمت و شفقت صفات کمال اور خوبی ہے اور رحمت کا نہ ہونا نقص ہے جس سے اللہ کی ذات پاک ہے اس لیے قرآن میں جگہ جگہ رحمتِ الٰہی کا تذکرہ موجود ہے اور دیگر کتبِ سماویہ میں بھی اور عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ خالقِ کائنات میں رحمت کا ہونا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ عالم کائنات کا موجودہ نقشہ اس کی رحمت کے مشاہدے کا آئینہ ہے۔ کائنات میں جو کچھ ہے وہ صرف دو چیزیں ہیں۔

۱۔ مرحوم و منعم :۔ یعنی جس پر رحمت اور انعام ہوا ہو۔ وہ انسان ہے۔

۲۔ رحمت و نعمت :۔ وہ تمام مخلوقات علوی و سفلی کا نام ہے۔ جو خدا کی طرف سے

انسان کے لیے نعمت ہے اور اس کے لیے سامانِ رحمت ہے۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ط اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ	اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو گن نہیں سکتے بے شک انسان بے انصاف اور ناشکرا ہے

ابراہیم آیۃ ۳۴

جب اللہ کی رحمت کا یہ حال ہے تو اب قیاس کرو کہ انسانی اعمال میں نہ سب مفید ہیں، نہ مضر بلکہ کچھ مفید اور نفع مند ہیں اور کچھ مضر اور تباہ کن ہیں۔ اس پر اقوامِ عالم کا اتفاق ہے۔ مثلاً عدل اچھا ہے ظلم بُرا، لیکن اعمال لطیف اشیاء ہیں جن کی مضرت اور منفعت کسی لیبارٹری کے ذریعہ تحلیل و تجزیہ کے ذریعہ معلوم نہیں کی جا سکتی۔ خواہ وہ اعمال وعقائد ہوں یا اخلاق وعبادات ومعاملات لہٰذا اگر ان امور کے متعلق جن تک انسانی فکر و عقل کی رسائی ناممکن ہے، اگر خداوند تعالٰے کی طرف سے بھی ہدایت کا سامان موجود نہ ہو اور انسان تباہ کن اور زہر آلود عقائد و اعمال میں مبتلا ہو جائے اور خالق کائنات صرف تماشائی بن کر رہے تو یہ اُس کی شانِ رحمت کے خلاف ہے۔ اگر ایک انسان کو یہ معلوم ہو کہ اس طعام میں زہر ملا دیا گیا ہے اور دوسرا بے خبر انسان اس کو کھا رہا ہو اور باخبر انسان خاموش رہے اور اُس کو نہ بتلائے تو یہ خاموشی اس خاموش انسان کی بے رحمی کی دلیل ہوگی۔ اسی طرح اگر اندھا کنوئیں یا کھڈے میں پاؤں رکھ رہا ہو اور بینا انسان اس کو اطلاع دینے سے چُپ رہے تو یہ بھی بے رحمی ہوگی۔ جب ایک انسان باخبر کا یہ فرض ہے کہ وہ دوسرے بے خبر انسان کو مضر امر کی مضرت کی اطلاع دے تو احکم الحاکمین اور ارحم الراحمین کے لیے کب یہ شایانِ شان ہے کہ وہ مضر و مہلک و تباہ کن اور زہریلے اعمال کی اطلاع ان انسانوں کو نہ دے جو ان کی تباہ کاریوں اور مضرت رسانیوں سے بیخبر ہیں اور ان کے پاس مضرت معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ بھی نہیں۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ اللہ تعالٰے کی طرف سے ایسا ہدایت نامہ موجود ہو جس میں نجات دہندہ اور مہلک عقائد و اعمال کی تشریح کی گئی ہو یہی

ہدایت نامہ کلام الہٰی یا قرآن ہے جس کی انسان کو ضرورت ہے۔

صداقت و اعجاز القرآن

قرآن کے اعجاز اور معجزہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کلام الہٰی اور ہدایت آسمانی و ربانی ہے اس کے معارف و علوم اللہ تعالےٰ کی ذات کے لامحدود سرچشمۂ علم و عرفان کے ابدی قوانین ہیں اور کسی انسان کے محدود اور ناقص فکر و دماغ کا نتیجہ نہیں اور نہ ہی کسی انسانی افکار و نظریات کی طرح وہم و خیال اور جذبات اور خواہشِ نفسانی سے متاثر اور تبدل پذیر تصورات کا مجموعہ ہیں۔ وہ فطرت اور حقیقت ہے جو کبھی نہیں بدلتی اور نہ اس میں غلطی کی گنجائش ہے اور نہ اس کے قوانین میں ترمیم و تبدل کی ضرورت ہے اور نہ اس میں تمام اقوام بشریہ کے حقوق کے متعلق عدل و انصاف کی شاہراہ سے ہٹنے کا احتمال ممکن ہے، جس کے متعلق بالترتیب قرآن حکیم کا خود اپنا دعویٰ یہ ہے۔

لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۖ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ
حم السجدہ آیہ ۴۲

قرآن کے مطالب میں آگے پیچھے کسی باطل کے گھسنے کی گنجائش نہیں وہ ایسی ذات کی نازل کردہ کتاب ہے جو حکمت و دانائی کا سرچشمہ ہے اور تمام صفاتِ کاملہ سے موصوف ہے۔

لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ
انعام آیہ ۱۱۵

قرآن میں کسی وقت بھی ترمیم و تبدیل کی گنجائش نہیں۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا ۚ
انعام آیہ ۱۱۵

قرآن کی ہدایات سچائی اور عدل انسان میں تمام اور مکمل ہیں۔

اب صرف یہ بات رہ گئی، کہ قرآن حکیم جو انسانی صفات کی جامع کتاب ہے کیا یہ واقع میں اللہ کی کتاب اور اس کا کلام ہے یا کسی انسان کی ذہنی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اگر پہلی صورت

ہے تو یہ معجزہ ہے یعنی سرغیرالٰہی طاقت کو عاجز کرنے والی کتاب قرار پائے گی اور اس کے کلام الٰہی ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہے گا۔ اور اگر دوسری صورت ہے تو پھر اس کا کلامِ الٰہی ہونا محلِ بحث رہے گا۔ ہم آئندہ یہی ثابت کریں گے کہ قرآن معجزہ ہے اور کُل انسانی قوتیں اس کے بنانے سے بلکہ اس کے بنانے سے بلکہ اس کے معمولی جزو بنانے سے بھی عاجز ہیں۔ اسی وجہ سے یہ کلامِ الٰہی اور معجزہ ہے جو دیگر معجزاتِ انبیاء علیہم السلام کی طرح وقتی نہیں بلکہ دائمی اور ابدی معجزہ ہے جس کا جواب منکرین قرآن قیامت تک پیش نہیں کر سکتے۔ جیسے یورپی عیسائی مترجم قرآن جارج سیل کے اس قول سے تصدیق ہوتی ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ قرآن ایسی کتاب ہے کہ کسی انسان کا قلم ایسی معجزانہ کتاب نہیں لکھ سکتا یہ معجزہ مُردوں کے زندہ کرنے کے معجزے سے بھی بڑا معجزہ ہے (تاریخ اسلام جلد ا صفحہ ۱۲۷، از عبد القیوم ندوی)

سب سے پہلے ہم معجزہ کی تشریح کرتے ہیں۔ تاکہ قرآن کا اعجاز اور معجزہ ہونے کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

معجزہ اور اعجاز کی تشریح

دُنیا میں جس قدر اُمورات رونما ہوتے ہیں اُن کی کُل تین قسمیں ہیں

۱۔ عادیات ۲۔ عجائبات ۳۔ معجزات

عادیات عادیات سے مراد وہ اُمور ہیں جن کا تعلق ایسے اسبابِ مادیہ سے ہو، جن کو عام اور خاص سب لوگ جانتے ہوں جیسے گندم کاشت کرنے سے گندم کا پودا نکل آنا، گٹھلی کے دبانے سے درخت پیدا ہونا، دوا کے استعمال سے مرض دُور ہونا، روٹی کے کھانے اور پانی پینے سے بھوک اور پیاس کا دُور ہونا، تجارت سے نفع حاصل ہونا، سامانِ جنگ سے دشمن پر فتح پانا، یہ سب امور عادیہ ہیں یعنی عام عادات اور رواج کے مطابق ان مادی اسباب سے مذکورہ نتائج حاصل ہوتے ہیں۔

عجائبات

عجائبات سے مراد ایسی چیزیں ہیں جو مادی اسباب کے نتیجے میں پیدا ہوں، لیکن مخصوص ماہرینِ فن کے علاوہ عام اشخاص کو ان اسباب اور اُن سے پیدا شدہ نتائج کے متعلق کوئی علم نہ ہو. مثلاً جدید مصنوعات سائنس مشین کے ذریعہ ریل گاڑی دوڑانا، ہوائی جہاز اُڑانا، بحری جہاز چلانا، ریڈیو اسٹیشن سے آوازوں اور تقریروں کو پھیلانا، میزائل، ایٹم بم، ہائیڈروجن بم بنانا، یہ سب عجائبات میں داخل ہیں۔ اسی طرح سحریات بھی کہ یہ سب کچھ مادی اسباب اور مہارتِ فن کے نتائج ہیں۔ لیکن مخصوص افراد کے بغیر عام اشخاص کو ان اسباب اور ان پر مسببات مرتب ہونے کا علم نہیں اس لیے ان کو یہ امور عجیبہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان دونوں قسموں یعنی عادیات اور عجائبات میں ایک خاصیت مشترک ہے۔

مشترک خاصیت

ان دونوں قسموں کی نظیر دوسرے لوگ بنا سکتے ہیں اور بنانے پر قادر ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ عادیات کے لیے خاص مہارت فن کی ضرورت نہیں۔ کوئی بھی گندم کاشت کر کے گندم کی فصل اسباب عادیہ کے تحت حاصل کر سکتا ہے، لیکن دوسری قسم کی عجائبات مثلاً مصنوعاتِ سائنس کے لیے مہارتِ فن کی ضرورت ہے اور جو شخص ان مادی اسباب کا ماہر ہوگا وہ ان عجائبات کو بنا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان عجائبات کا پہلا موجد ایک شخص ہوا لیکن اس کے بعد ہزاروں نے مہارت حاصل کر کے ان عجائبات کو بنایا۔ خود یہ بات ہمارے سامنے ہے کہ امریکہ نے ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بنایا بعد ازاں چین نے بنایا ہے۔ اس لیے ان عجائبات میں اختصاص نہیں ہوتا بلکہ مہارتِ فن سے ہر شخص ان عجائبات کی نظیر بنانے پر قدرت رکھتا ہے کیونکہ قانون ہے، جو کام ایک انسان کر سکتا ہے کم و بیش دوسرا انسان بھی ویسی قابلیت پیدا کر کے اس کو کر سکتا ہے۔ اس لیے عجائبات سائنس معجزات نہیں کہ دوسرا اُس کو نہ کر سکے۔

معجزات

معجزات وہ ہیں جن کا وجود مادی اسباب پر مبنی نہ ہو، خواہ عام

اسباب ہوں جیسے امور عادیہ یا خاص اسباب ہوں جیسے سائنس کے امور عجیبہ۔ بلکہ ان کا وجود خالق کائنات کی مخفی قوت اور مشیت کا نتیجہ ہو جس کو نبی کے سوا کوئی دوسرا انسان حاصل نہیں کر سکتا۔ مثلاً یورپ بھی ہوائی جہاز اُڑاتا ہے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا تخت بھی اُڑتا تھا، کام ایک ہے۔ لیکن تخت سلیمانی کا اُڑنا معجزہ تھا اور ہوائی جہاز کا اُڑنا معجزہ نہیں کیونکہ ہوائی جہاز مشین کے ذریعہ اُڑایا جاتا ہے جو ہر انسان ویسی مادی مشین بنا کر جہاز کو اُڑا سکتا ہے لیکن حضرت سلیمان کا تخت مشین سے نہیں، مشیت الٰہی کی تسخیر ہوا سے اُڑتا تھا جس کی نقل اُتارنے پر نہ پہلے کوئی قادر ہوا اور نہ اب اور نہ آئندہ۔ کیونکہ مشیت کی کارسازی اوروں کے لیے ممکن نہیں۔

قرآنی معجزہ

بلاغی دلیل

دُنیا میں دو قسم کی مصنوعات ہم دیکھتے ہیں۔ ایک الٰہی مصنوعات مثلاً سورج، چاند وغیرہ، ایک انسانی مصنوعات مثلاً موٹر سائیکل وغیرہ پہلی قسم الٰہی مصنوعات ہیں۔ دوسری قسم انسانی مصنوعات ہیں۔ اب دونوں قسموں کے درمیان فرق اور امتیاز پر جب ہم غور کرتے ہیں کہ ان دونوں میں امتیازی معیار کیا چیز ہے تو کھلی اور بدیہی طور پر ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ جو خدائی مصنوعات ہیں وہ انسانی قوت سے خارج ہیں۔ اور جو انسانی مصنوعات ہیں وہ انسانی قوت کے دائرے کی چیزیں ہیں، جن کو آج ہر انسان بنا سکتا ہے اور لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں مختلف ممالک میں بنتے ہیں۔ مگر خدائی مصنوعات مثلاً سورج، چاند نہ کسی سے بن سکتے ہیں نہ کسی انسانی کارخانے میں تیار ہوتے ہیں اور نہ کسی بازار میں بکتے ہیں۔ یہی حال بعینہٖ کتابوں کا بھی ہے۔ کچھ کتابیں اس دنیا میں انسانوں کی بنی ہیں اور قرآن کے متعلق یہ دعوےٰ ہے کہ یہ کتاب خالق کائنات کے علم و قدرت کا نتیجہ ہے نہ کسی انسانی علم و قدرت کا۔ اس کا فیصلہ بھی اسی معیار امتیازی پر ہوگا کہ اگر اس کتاب کا کُل یا معمولی

جو۔۔ انسانی قدرت سے بن سکتا ہے تب تو یہ انسانی کتاب ہوگی اور معجزہ نہیں ہوگا اور اگر انسانوں کی مجموعی قوت اس کی چھوٹی سورۃ یعنی سورۃ کوثر جو ایک سطر سے زیادہ نہیں بنا سکتی۔ تو اس کے معجزہ اور اللہ کی طرف منسوب ہونے اور کلام اللہ ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہ سکتا قرآنِ حکیم نے اسی معیار کی بنیاد پر اپنے اعجاز اور کلام الٰہی ہونے کی متعلق عرب کے فصحاء و بلغاء کو چیلنج دیا اور فرمایا۔

وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ۔ (البقرہ ۲۲)

اگر تم کو اس قرآن کے کلام الٰہی ہونے میں شبہ ہے تو تم سب مل کر اور اپنے کل مددگاروں کو بلا کر اس کی چھوٹی سورت جیسی بنا لاؤ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔

اور ساتھ فرمایا:۔

وَلَن تَفْعَلُوا (البقرہ ۲۳) یعنی تم ہرگز ایسا نہیں کر سکتے

دوسری آیت میں اس سے بھی زوردار الفاظ میں فرمایا۔

قُل لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ أَن يَأْتُوا بِمِثْلِ هَٰذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا (بنی اسرائیل ۸۸)

اگر سارے انسان اور جن جمع ہو جائیں کہ قرآن کا توڑ بنائیں اور نظیر اس کی لائیں تو نہیں لا سکتے۔ چاہے سب مل کر ایک دوسرے کی مدد کریں۔

اس آیت میں اس قوم کو خطاب کیا گیا جس کو اپنی ادبی قابلیت اور فصاحت و بلاغت پر ناز تھا اور جو قرآن کے دشمن تھے۔ قرآن کے دعویٰ کو توڑنا ان کے لیے ہر چیز سے زیادہ اہم اور ضروری تھا اور یہ اعلان حضور علیہ السلام کی زبان سے کروایا گیا کہ ساری عمر میں آپ نے نہ کوئی تعلیم پائی تھی نہ کسی وقت اُن کی شعر و شاعری کا کوئی چرچا ہوا اور نہ ہی انہوں نے ادبی تعلیم پائی اور نہ ہی شعر و شاعری یا فصاحت و بلاغت کی کوئی مشق ان کو حاصل تھی اور نہ ہی چالیس

سال کی طویل زندگانی میں ماہرینِ زبان کی مجالس میں ان کی کوئی خاص شہرت تھی بلکہ وہ اُمّی اور ناخواندہ تھے۔ اس چیلنج اور اعلان نے مخالفین اسلام و قرآن کی ادبی غیرت اور مخالفانہ جوش کو لقیناً اس زور سے بھڑکایا کہ اگر ان کے بس میں ہوتا تو وہ نہایت آسانی اور بے ضرر طریقہ سے قرآن اور صاحبِ قرآن کو، قرآن جیسی صرف ایک سطر عبارت بنا کر شکست دے سکتے تھے اور یہ شکست بھی نمایاں ہوتی اور ان کا مقصد سو فی صدی حاصل ہو جاتا کیونکہ خود قرآن کا دعویٰ تھا کہ اگر ایسا کر سکے تو پھر قرآن کلامِ الٰہی نہ ہوگا اور صاحبِ قرآن خدا کے رسول بھی نہ ہوں گے۔ لیکن انہوں نے اپنے ادبی ذوق اور فطرتِ سلیمہ کی بنیاد پر قرآن کی نظیر لانے کو ناممکن سمجھا، اس لیے فتح اور کامیابی کا یہ آسان راستہ انہوں نے چھوڑ کر دوسرا دشوار گذار راستہ اختیار کیا۔ یعنی قرآن کے مقابلے میں انہوں نے جنگ و جدل کا ایسا طولانی سلسلہ قائم کیا جن کے لیے اُن کو بے اندازہ مالی و جانی قربانی دینی پڑی اور بعضوں کو ملک اور وطن ترک کرنا پڑا۔ اگرچہ اس راہ میں بھی اُن کو کامیابی نصیب نہ ہوئی لیکن زبان و قلم کی معمولی جنبش کے آسان ترین راستہ کو چھوڑ کر تلوار اور خونریزی کا راستہ اختیار کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ اُن کے پاس قرآن کے چیلنج کا جواب نہ تھا اور یہ وہ لوگ تھے کہ اس وقت سے لے کر اب تک اور آئندہ ختم دنیا تک ان کے زورِ بیان، فصاحت و بلاغت کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ یہ قرآن کے اعجاز کی بلاغی دلیل ہے، یہ دلیل نہایت عام فہم اور صاف ہے۔ تمام مستشرقین یورپ وغیرہ نے اپنے خاص سازشی پروگرام کے تحت ان بڑی بڑی تنخواہوں کا حق ادا کرنے کے لیے جو اُن کو اسلام دشمنی کے صلہ میں مل رہی ہیں، یہاں بھی حسبِ عادت چند بے سروپا شبہات پیش کئے ہیں، جن کو ہم نمبروار نقل کر کے اس کا جواب دیتے ہیں۔

پہلا شبہ

پہلا شبہ اہلِ استشراق نے یہ پیش کیا ہے کہ قرآن سازی سے فصحاءِ عرب کا عاجز ہونا کیونکر یقین کیا جا سکتا ہے، ممکن ہے کہ وہ قرآن کے توڑ بنانے پر قادر ہوں لیکن انہوں نے اس کی ضرورت نہ سمجھی ہو جیسے ایک انسان یونہی یا رک جانے پر

قادر ہوتا ہے لیکن حاجتِ سفر نہ ہونے کی وجہ سے نہیں جاتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک نیویارک کے سفر کے لیے صرف قدرت کافی نہیں بلکہ باعثِ سفر کا موجود ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔ قرآن کی نظیر لانے پر اگر بلغاء عرب کو قدرت ہوتی تو اظہار قدرت کے لیے اس سے بڑھ کر موقعہ کونسا ہو سکتا تھا، جب کہ ان بلغاء اور قرآن کے ماننے والوں میں مقابلہ جاری تھا قرآن کو شکست دینے سے۔ جو ان کے آبائی دین کا ابطال کرتا تھا ان کا آبائی دین بھی محفوظ ہو جاتا اور اس مذہبی مقابلہ میں وہ اپنے حریف گروہ، صاحبِ قرآن اور مسلمانوں اور خود قرآن کو نظیر قرآن پیش کر کے شکست بھی دے سکتے تھے۔ قرآن کے مقابلہ پر اپنی کامیابی ان کو اس قدر عزیز اور اہم تھی جس کے لیے انہوں نے بے انتہا مالی و جانی قربانیاں پیش کیں، جس پر جنگِ بدر، اُحد، خندق، حنین کے واقعات اور قرآن کے ماننے والوں پر مکہ معظمہ میں ان کے ظالمانہ کارنامے گواہ ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ قرآن کو جو ان کے آبائی دین کی تردید کرتا تھا شکست دینے سے ہمارے دین کی بھی فتح ہوگی اور ہماری فصاحت و بلاغت کی یکتائی بھی برقرار رہے گی۔ مسلمان جو اس مذہبی جنگ کا ایک فریق تھے وہ بھی ذلیل ہو کر ناکام ہو جائیں گے۔ کیا اس سے بڑھ کر فصحاء عرب کے لیے بڑا باعث اور محرک کوئی ہو سکتا تھا جس کے متعلق یہ شبہ کیا جا سکے کہ وہ نظیرِ قرآن بنا سکتے۔ لیکن چاہا نہیں۔ ایسی شدید ضرورت کے باوجود نہ چاہنا ایسا بے معنی ہے کہ ایک پیاسا کسی بیابان میں پیاس سے مر گیا ہو اور اس کے متعلق یہ احتمال پیش کیا جائے کہ وہ پانی پینے پر قدرت رکھتا تھا لیکن پانی اس لیے نہیں پیا کہ اس کے لیے پانی پینے کا کوئی باعث موجود نہیں تھا اس لیے اس نے پانی پینا نہیں چاہا۔ یہی حقیقت اہل استشراق کے اس شبہ کی بھی ہے کہ فصحاء عرب قرآن کا توڑ بنا سکتے تھے لیکن انہوں نے بنانا نہیں چاہا۔ اس کے علاوہ حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کو آریہ سماج کے بانی پنڈت دیانند نے مناظرہ کا چیلنج دیا۔ اور پہلے وہ حضرت مولانا سے مناظرہ کر کے اُن کے علمی مقام کا اندازہ کر چکا تھا۔ اس دوسرے چیلنج کے جواب کے لیے جب حضرت

مولانا پہنچے تو دیانند نے مناظرہ کرنے سے انکار کر دیا اور عذر یہ پیش کیا کہ میں نے اس وقت مناظرے کا ارادہ نہیں کیا۔

جس پر مولانا نے فرمایا کہ ارادہ تو اپنے اختیار میں ہے اگر پہلے ارادہ نہیں کیا تو اب کرلو جس پر وہ خاموش ہوا، یہی حال مذکورہ شبہے کا ہے کہ نظیر قرآن پیش کر سکتے تھے لیکن چاہا نہیں اور ارادہ نہیں کیا۔ ہم کہتے ہیں کہ عراق، مصر، شام، لبنان، بیروت میں اس وقت کافی عیسائی موجود ہیں جن کی مادری زبان عربی ہے اور عربی زبان میں انہوں نے بیسیوں کتابیں لکھی ہیں اور کئی جلدوں میں عربی کی ڈکشنریاں شائع کی ہیں اور عربی زبان کے بہترین شاعر ہیں، تم ان سے کہو کہ عیسائی حکومتیں اور عیسائی قومیں کروڑوں روپے قرآن اور اسلام کے خلاف ہر سال خرچ کر رہی ہیں وہ اس وقت کوئی قرآن کی نظیر بنا کر پیش کر دیں۔ لیکن عیسائی قومیں ممکن ہے کہ چاند تک پہنچ سکیں، لیکن اگر ان کے لیے ناممکن ہے تو صرف یہ کہ وہ قرآن کا توڑ بنا سکیں۔

دوسرا شبہ اہل استشراق نے دوسرا شبہ یہ پیش کیا ہے کہ ہر چیز کے بنانے کے لیے ضروری ساز و سامان ہونا ضروری ہے۔ ممکن ہے کہ فصحاء عرب کے پاس وہ اسباب موجود نہ ہوں جو قرآن کے لیے ضروری ہیں۔ یہ شبہ بھی بے بنیاد ہے اس لیے کہ ایک چیز کے بناؤ نے کے لیے ضروری اسباب صرف چار ہیں۔

۱۔ قدرت یا مہارت **۲۔ مادہ:۔** یعنی جس سے وہ چیز بنے۔

۳۔ باعث و محرک:۔ یعنی ایسا مقصد جو اس کے بنانے پر آمادہ کرے۔

۴۔ نمونہ:۔ اس چیز کے نمونے کا سامنے موجود ہونا، جس کے طرز پر کسی چیز کا بنانا مقصود ہو۔

مثلاً میز بنانے کے لیے پہلی چیز قدرت و مہارت ہے کہ آدمی نجاری اور بڑھئی کا کام جانتا ہو، عام آدمی میز اس لیے نہیں بنا سکتا کہ اس کو میز سازی کی مشق و مہارت نہیں۔

دوسری چیز میز کا مادہ ہے یعنی لکڑی جس سے میز بنائی جاتی ہے اگر لکڑی وغیرہ نہ ہو تو

وہ ہوا سے میز نہیں بنا سکتا کیونکہ وہ میز کا مادہ نہیں۔

تیسری چیز باعث ہے کہ میز بنانے سے اس کا کوئی مقصد پورا ہوتا ہو۔ مثلاً میز کی قیمت حاصل کرنا یا اپنے گھر کی ضرورت کو پورا کرنا تاکہ یہ باعث و محرک اس کو میز سازی کے عمل پر آمادہ کرے

چوتھی چیز نمونہ ہے کہ اس کے سامنے میز کا کوئی نمونہ بھی موجود ہو تاکہ اس طرح کا میز بنا سکے

اب دیکھنا چاہیئے کہ قرآن حکیم کے نزول کے وقت فصحاء عرب کے پاس یہ چار اسباب موجود تھے یا نہیں۔ تو یہ ظاہر ہے کہ یہ تمام اسباب چاروں کے چار ان کے پاس موجود تھے۔

اوّل قدرت و مہارت۔ تو کلام سازی میں نظم ہو یا نثر وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے اور یہی مشق کلام سازی ان کا عام مشغلہ تھا۔ دوم قرآن کی عبارت جن حروف سے وہ حروف ہجائیہ اُٹھائیس ہیں جو الف، بآ سے شروع ہو کر یا پر ختم ہوتے ہیں۔ وہی قرآن کی عبارت کا مادہ اور مصالحہ تھا جو اُن کے پاس موجود تھا۔ جن سے وہ روزمرّہ اپنا کلام بنایا کرتے تھے۔ سوئم باعث و محرک قرآن بھی اُن کے پاس موجود تھا۔ وہ یہ کہ قرآن کے مٹانے کے لیے وہ سر دھڑ کی بازی لگا رہے تھے تاکہ اُن کا پُرانا دین محفوظ ہو جائے اور اس کے خلاف دین قرآن کو شکست دیدے چہارم نمونہ بھی موجود تھا۔ پیغمبر اسلام علیہ السّلام نے اُن کو قرآن بار بار سُنایا اور قرآن کے چیلنج کا مطلب یہ تھا کہ اسی نمونہ پر جو تمہارے سامنے ہے، چند جملے تیار کر کے لے آؤ۔ مِنْ مِّثْلِهٖ سے معلوم ہوتا ہے۔ پھر ان چار اسباب کے علاوہ اور کونسی چیز کی ضرورت تھی جو فصحاء عرب کے پاس نہ تھی، اس لیے وہ قرآن کی نظیر پیش کرنے سے عاجز آئے۔ اس لیے اس شُبہ کی کوئی بنیاد نہیں۔

تیسرا شُبہ یہ شُبہ بھی پیش کیا گیا ہے کہ ممکن ہے کہ فصحاء عرب نے قرآن کا کوئی توڑ بنایا ہو، اور ہم تک نہ پہنچا ہو۔ یہ بھی محض طفل تسلّی ہے کیونکہ اس وقت محدود چند افراد کے بغیر پوری دنیا قرآن کے خلاف اور اب بھی قرآن کے مخالفین کی تعداد قرآن پر ایمان لانے والوں سے زیادہ ہے۔ تو جب مومنین کی تھوڑی جماعت نے قرآن کریم

کو آنے والے مومنین تک پہنچایا۔ تو سوال یہ ہے کہ اگر اس وقت مخالفین کی طرف سے یا کسی بھی وقت میں کوئی توڑ بنا دیا گیا ہوتا جو مخالفین کے مقصد کی چیز تھی تو کثیر التعداد مخالفین نے اس توڑ کو کیوں آنے والے مخالفین تک نہیں پہنچایا۔ نہ پہنچایا جانا اس امر کی دلیل ہے کہ توڑ کسی سے بن ہی نہ سکا تھا۔

چوتھا شبہ اس شبہ کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ جس طرح دورِ حاضر میں سائنس کا ایک ماہر نئی چیز ایجاد کرتا ہے اور دوسرے نہیں بنا سکتے تو یہ اس امر کی دلیل نہیں کہ اس چیز کا نہ بنایا جانا معجزہ ہونے کی دلیل ہے اسی طرح قرآن کو سمجھو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مصنوعاتِ جدیدہ کسبی چیزیں ہیں۔ اس لیے جب ایک موجد بنا لیتا ہے تو دوسرے بھی اس کو بنانا شروع کرتے ہیں لیکن قرآن ایسا نہیں۔ ورنہ اب تک کسی سے کیوں نہ بن سکا۔

پانچواں شبہ اس شبہ کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کا انبہار سحر کے مماثل ہے۔ سحر بھی ساحر کے سوا دوسرا نہیں کر سکتا لیکن وہ خالقِ کائنات کا فعل یا معجزہ نہیں کہلاتا۔ اس شبہ کا جواب ظاہر ہے کہ سحر اور معجزہ میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ سحر کسبی ہے اور اسباب پر مبنی ہے۔ اگرچہ وہ اسبابِ مادی پوشیدہ ہیں لیکن جب دوسرا شخص ان اسباب کو بروئے کار لاتا ہے تو وہ بھی ساحرانہ اعمال پیش کر سکتا ہے اور ایک ہی زمانہ میں متعدد ماہرینِ سحر کارروائیاں کرتے ہیں۔ ساحرین عہد موسیٰ علیہ السلام کی کثرت اس کی دلیل ہے۔ اس لیے جب ان ساحروں نے محسوس کیا کہ عصاء موسیٰ معجزہ ہے کہ مادی اسباب پر مبنی نہیں اور ہماری ساحری کسبی، فنی اور اسبابی چیز ہے تو انہوں نے معجزہ کی شناخت کر کے فوراً ایمان لایا۔

چھٹا شبہ اہلِ استشراق کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ بلاغت میں یکتا تھے اس لئے دوسرے لوگ ان کی ہمسری نہ کر سکے ورنہ قرآن کلام محمدؐ ہے۔ یہ شبہ بوجوہات ذیل غلط اور خلافِ واقعہ ہے۔

پہلے یہ کہ عرب نے جو قرآن کے بدترین دشمن تھے یہ شبہ کیوں پیش نہیں کیا۔ کیا اُن کے

سامنے کے واقعات سے اُن کی نسبت اہل استشراق زیادہ باخبر ہیں۔ بلکہ گذشتہ کل شبہات جو اہل استشراق نے پیش کئے ان کی تردید کے لیے یہ امر کافی ہے کہ اگر ان شبہات کی گنجائش ہوتی تو خود عرب بلغا۔ جو قرآن کے دشمن تھے ان شبہات کو ضرور پیش کرتے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ جس سے معلوم ہوا کہ یہ تمام شبہات من گھڑت ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر قرآن کلام رسول علیہ السلام ہوتا تو رسول کا کلام احادیث کی شکل میں اب بھی موجود ہے۔ اور ان میں اور قرآن میں نمایاں فرق ہے۔ جو اعجازی رنگ قرآن کی عبارت میں ہے وہ کلام رسول اور احادیث میں قطعاً موجود نہیں۔ اہل استشراق نے یہ عذر پیش کیا ہے کہ پیغمبر اسلام کا کلام دو قسم کا ہوتا تھا۔ ایک بلا تیاری اور فوری، وہ معمولی تھا اور ایک پوری تیاری کے بعد تھا۔ وہ یکتا اور بے مثل ہوتا تھا۔ یہ عذر اس لیے غلط ہے کہ نزول قرآن میں بعض اوقات ایسا ہوا کہ مجلس میں ایک سائل نے سوال کیا اور قرآن فوراً اس کے جواب میں نازل ہوا اور حضورؐ نے سائل کو سنا یا جس میں تیاری کا سرے سے موقع ہی موجود نہ تھا۔ جیسے وَيَسْئَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ[1] وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ[2] وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ[3] وغیرہ بیسیوں واقعات سوالات کے جوابات میں فوراً آیات سنائی گئیں اور تیاری کے لیے وقت نہیں مل سکا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اگر قرآن حضور علیہ السلام کا کلام ہوتا تو پھر یہ کسبی اور ذہنی اور مشقی کارروائی کا نتیجہ ہوتا تو پھر کیا وجہ ہے کہ مشہور مشاق اور ممتاز بلغا۔ ایسے کلام کی دو تین آیتیں بھی نہ بنا سکے۔ جس سے صاف ہوتا ہے کہ قرآن خدائی کلام تھا، جو خدا کے سوا سب انسانوں کی قدرت سے خارج تھا اور اسی کا نام معجزہ ہے۔

---

[1] و [3]۔ سورہ البقرۃ آیۃ ۲۱۸، [2] سورہ البقرۃ آیۃ ۲۲۱

ساتواں شبہ مادہ پرست مستشرقین قرآن کے معجزہ ہونے سے منکر ہو کر یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ معجزہ ماننا نظام عالم کی مصلحت کے خلاف ہے، اور علت و معلول کے عام ضابطے کا توڑ ہے کیونکہ معجزہ کا معنی یہ ہے کہ ایک چیز کی علت موجود ہو جیسے آگ جلا دینے کی علت ہے اور معلول اُس پر مرتب نہ ہو سکے۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ کے اثر کا نہ ہونا معجزہ مانا جاتا ہے یا کسی چیز کی علت موجود نہ ہو اور وہ چیز وجود میں آجائے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سمندر پر لاٹھی مارنا سمندر میں سے بارہ سڑکیں پیدا ہونے کی علت نہیں تھا لیکن معلول یعنی بارہ راستوں کا سمندر میں پیدا ہونا متحقق ہوا اسی طرح معجزہ شق القمر یا مٹھی بھر کنکریوں سے کفار کی فوج کی شکست یا تھوڑے پانی سے بڑی جماعت کا سیراب ہونا یا تھوڑے طعام سے بڑی جماعت کا سیر ہو جانا یہ سب واقعات ایسے ہیں جن میں معلول کو بلا علت تسلیم کیا گیا ہے اور قانونِ تعلیل کے ضابطے کا توڑ ہے اور اس دعوی کی تائید میں قرآن کی آیت وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللهِ تَبْدِيلًا — سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ اس آیت میں سنۃ اللہ کی تبدیلی کی نفی کی گئی اور قانونِ تعلیل سنۃ اللہ ہے تو وہ معجزہ سے تبدیل نہیں ہو سکے گی

اس شبہ کا ایک جواب تو یہ ہے کہ مستشرقین عیسائی ہیں اور انجیلوں میں اور اسی طرح تورات میں بھی معجزات مذکور ہیں لہذا معجزات کا وجود ہر آسمانی کتاب بلکہ ہر مذہب میں ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے لہذا اسلامی معجزات سے انکار خالص تعصب ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ معجزات انبیاء علیہ السلام ذریعہ ہدایت ہیں اور ہدایتِ انسانی سے بڑھ کر اور کیا مصلحت ہو سکتی ہے۔ لہذا معجزات کو خلاف مصلحت کہہ دینا غلط ہے۔ آیت میں جس سنۃ اللہ کے متعلق تبدیل نہ ہونے کا اعلان کیا گیا وہ آیت کے سیاق و سباق کے پیش نظر معجزات سے متعلق نہیں بلکہ اہل ایمان کے ثواب اور اہلِ کفر کے عذاب سے متعلق ہے جس میں تبدیلی نہیں ہو گی۔ اور بالفرض اگر معجزات پر بھی اس کو حاوی سمجھا جائے تو آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی سنت کو غیر اللہ تبدیل نہیں کر سکتا نہ یہ کہ خود اللہ بھی تبدیل نہیں کر سکتا۔ جس ذات کی جو سنت و عادت ہو اس کو وہ ذات تبدیل بھی کر سکتی ہے۔ بالفرض اگر کسی بادشاہ کی یہ

سنت و عادت ہو کہ وہ وزیر اعظم کے مشورہ کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا تو کیا اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اس عادت و سنت کے برخلاف بلا مشورہ وزیر اعظم کوئی کام نہیں کر سکے گا۔ خود فلاسفۂ یورپ کے اقوال سے بھی معجزاتِ اسلام کی صحت کی تائید معلوم ہوتی ہے۔ کارپنٹر لکھتا ہے "خالقِ فطرت اگر چاہے تو کبھی کبھی قانونِ فطرت کے خلاف کام کر سکتا ہے[1]"۔ ہربرٹ ڈالیر "مادہ ایتھر، حرکت" میں لکھتا ہے کہ بغیر علل و اسباب ظاہری کے کام ہو سکتا ہے اور معجزہ غیر اغلب نہیں۔ ڈاکٹر وارڈ "سسٹم آف لاجک" میں لکھتے ہیں کہ صحرا کے ہزار کمروں میں اگر ۲۵ کی چابیاں مل جائیں تو یہ ضروری نہیں کہ ۵۰ کی چابیاں بھی ویسی ہی ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ علل و اسباب چابیاں ہیں جو عقلِ انسانی نے دریافت کی ہیں اور جو اسباب دریافت نہیں ہوئے وہ بہت زیادہ ہیں۔ لہٰذا ہر واقعہ کے حل کو ان دریافت شدہ علل کی چابی سے کھولنا درست نہیں۔ پروفیسر ہکسلے لکھتے ہیں کہ ہم فطرت کی حد بندی نہیں کر سکتے[2]۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم فطرت پر یہ پابندی نہیں لگا سکتے کہ جس قانون کے تحت اس نے کام کیا اس کے بغیر نہیں کر سکتی۔ انگلستان کے ولیم جیونس لکھتے ہیں۔ کارخانۂ فطرت میں خداوندی مداخلت کو ہم باطل نہیں ٹھہرا سکتے[3] کائنات کا خالق حذف و اضافہ بھی کر سکتا ہے۔ یہی رائے بہت سے فلاسفۂ مغرب کی ہے۔ اور میرے نزدیک یہی رائے صحیح ہو سکتی ہے کیونکہ قانونِ تعلیل کی بنیاد استقراء ناقص پر ہے جس سے قطعی علم حاصل نہیں ہو سکتا اور یہ اربابِ سائنس کا مسلّم قانون ہے کہ تجربہ اور استقراء جب کہ محیط نہ ہو اس سے یقینی علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ہمارے تجربہ میں جس قدر آگ آئی ہیں وہ جلاتی ہیں لیکن کیا ہم نے تمام آگوں کا تجربہ کیا اور اس آگ کا بھی کیا جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام ڈالے گئے تھے؟ اگر نہیں تو یہ استقراء ناتمام ہوا۔ جس سے آتشِ ابراہیمی کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ ہر علت جس معلول کو پیدا کرتی ہے وہ اس قوت کے ذریعہ سے پیدا کرتی ہے جو علت کے اندر موجود ہو اور وہ قوت خالق

ع۱ سیرۃ النبی از شبلی صفحہ ع۲ ممکنات و ناممکنات از ہکسلے صفحہ ۱۹ ع۳ اصول سائنس صفحہ ۲۲۔

کائنات کی بخشش اور عطیہ ہے۔ جو ذات کوئی چیز دے سکتی ہے وہ چھین بھی سکتی ہے۔ جب چھین لے تو علت کی تاثیر ختم ہو گئی۔ اس لیے اس بجائے نام علت پر معلول مرتب نہیں ہوا، کیونکہ قدرت کے سلب تاثیر نے اس کی علیت ختم کر دی۔ اسی طرح اگر کوئی معلول بغیر علت کے وجود میں آیا۔ مثلاً عصائے موسیٰ علیہ السلام سے سمندر کا پھٹ جانا، تو یہ ہو سکتا ہے کہ لاٹھی انفلاقِ بحر کی علت نہیں لیکن یہ اس وقت کہ اس میں خالقِ فطرت نے تعلیلی قوت نہ ڈالی تھی لیکن اگر ڈال دے تو پھر معلول بلاعلت نہیں بلکہ علت کے تحت وجود میں آیا کیونکہ انفلاقِ بحر کے وقت میں اس عصا کے اندر انفلاقی قوت ڈال دی گئی تھی۔ یہ سب کچھ ہم نے فلسفہ کے تحت لکھا، ورنہ اصل جواب تو یہ ہے کہ ہر چیز چاہے علت ہو یا کوئی اور چیز، اس کا وجود اور اس کی قوتِ تاثیر ارادۂ الٰہی کا معلول ہے، ارادہ الٰہی بدل جانے سے اشیاء میں تبدیلی ہوتی ہے اور معجزاتِ الٰہیہ جو خدائی افعال ہیں، اُن کا صدور صرف ارادۂ الٰہی کے تعلق سے ہوتا ہے اور یہی انسان اور خدا میں فرق ہے کہ انسان کا صرف ارادہ عمل نہیں کرتا جب تک اس اس ارادے کے ساتھ اسباب کی شرکت نہ ہو۔ مثلاً اگر آدمی سیر ہونے یا سیراب ہونے کا ارادہ کرے تو سیر ہونا و سیرابی محض اس آدمی کے ارادے سے پیدا نہ ہوں گے، جب تک روٹی کھانا اور پانی پینا۔ جو سیری اور سیرابی کے اسباب ہیں۔ ارادہ کے ساتھ شامل نہ ہوں۔ لیکن خالقِ فطرت کے لیے اسباب کی ضرورت کبھی نہیں۔ اس کا صرف ارادہ مراد کو وجود میں لانے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ [1] میں اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے۔ کیا آسمان و زمین کے بنانے میں صرف ارادۂ الٰہی نے کام نہیں کیا اور مزدوروں کی ضرورت پیش آئی؟ ہرگز نہیں۔ یہی معاملہ معجزات کا ہے کہ وہ عادی اسباب کے بغیر ارادۂ الٰہی سے وجود میں آتے ہیں۔

---

[1] سورۃ یٰس رکوع ۵ آیۃ ۸۱

آٹھواں شبہ اہل استشراق کہتے ہیں کہ اگر قرآن معجزہ ہو تو یہ وحی الٰہی ہوگا اور وحی الٰہی اور اس کے ذریعہ علوم کا القاء غیر معقول ہے۔ اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ خود بائیبل میں انبیاء علیہم السلام کی وحی کا ذکر موجود ہے تو وحی اور نبوت یہود و نصاریٰ کی تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ لہٰذا وحی نبوی سے انکار محض ضد اور عناد ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کا کسی پیغمبر کے قلب پر الفاظ و معانی کا القاء بالکل معقول ہے اور اس کے ذہن نشین کرانے کے لیے مسمریزم کے اعمال سے تائید ہوتی ہے جو ایک روحانی عمل ہے صاحبِ مناہل العرفان نے علوم القرآن میں لکھا ہے[1] کہ عیسائی مبلغین جن کو مبشرین کہتے ہیں، مصر میں آئے اور ایک نوجوان پر تنویم مقناطیسی کا عمل کیا۔ پہلے پوچھا تمہارا نام کیا ہے۔ اُس نے اصل نام بتایا، عامل نے اس نوجوان معمول پر توجہ ڈال کر کہا کہ تمہارا یہ نام نہیں بلکہ دوسرا نام ہے۔ اس طرح اُس نے اپنے عمل سے اس کے ذہن سے اصلی نام مٹا کر مصنوعی اور فرضی نام ذہن نشین کرایا اور دیگر باتیں اس عمل کے ذریعہ اس کے ذہن میں ڈال دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہی مخفی طریقے سے ڈالے ہوئے الفاظ اور علوم اس نوجوان کے ذہن میں راسخ ہوئے اور عمل کا اثر ختم ہونے پر بھی ویسے رہے۔ یہ واقعہ بہت لوگوں کے سامنے مصر میں ہوا۔ جس سے معلوم ہوا کہ انسان مخفی طریقے سے دوسرے انسان کے ذہن میں الفاظ منتقل کر سکتا ہے، تو کیا خدا کسی منتخب رسول کے ذہن میں الفاظِ وحی و قرآن منتقل نہیں کر سکتا؟

تیسرا جواب یہ ہے کہ ٹیپ ریکارڈر نے حقیقتِ وحی کو ذہن سے قریب تر کر دیا کہ ایک انسان کے الفاظ کو بے جان ٹیپ ریکارڈ میں منتقل کیا جا سکتا ہے اور وہی الفاظ محفوظ

---

[1] مناہل العرفان صفحہ ۶۰

رہتے ہیں تو کیا خدا انسان سے بھی عاجز ہے کہ وحی کے الفاظ بے جان آلہ میں نہیں، بلکہ ایک منتخب بنی کے لوحِ ذہن میں منتقل کر کے محفوظ کر دے۔

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰی ۙ — ہم آپ کے ذہن میں الفاظِ وحی ڈالیں گے جن کو تو نہیں بھولے گا۔

سورہ اعلیٰ آیہ ۵

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۚ — ہمارے ذمہ ہے تیرے ذہن میں وحی کے الفاظ کو جمع کرنا پھر تم سے پڑھوانا ہے

سورۃ قیامۃ آیۃ ۱۷

نواں شبہ

اہل استشراق کہتے ہیں کہ قرآن کے مضامین غیر مرتب ہیں، جو اعجاز کے خلاف ہے اس کا جواب اولاً یہ ہے کہ جیسے امام ولی اللہؒ نے بیان کیا کہ قرآنی طرز مصنفین کے طرز پر نہیں بلکہ دستور عرب قدیم کے طریقہ پر ہے۔ جیسے کہ سبعہ معلقات میں متعدد مضامین ایک ہی قصیدہ میں بیان ہوتے ہیں کبھی اظہار محبت، کبھی بارش کی تعریف کبھی گھوڑے کی تیز رفتاری کا بیان۔ گویا قرآن ایک شاہی مکتوب ہے کہ جس میں بادشاہ متعدد اشیاء کے انتظام کا کسی گورنر کو حکم دیتا ہے۔ اس لیے اس میں ترتیب کو تلاش کرنا معقول نہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ تمام مضامین کو مصنفین کی طرح جدا جدا باب میں مرتب نہ کرنا نقص نہیں، بلکہ یہ ایک جداگانہ اعجاز ہے کہ جب یہ کتاب اصل کے اعتبار سے خدا کی ہے انسان کی بنائی ہوئی نہیں ہے تو طرز ترتیب میں بھی مصنفین سے وہ جداگانہ شان رکھتی ہے اگر انسانی کتاب ہوتی تو اس میں ضرور انسانی ترتیب کی نقل اتاری جاتی

تیسرا یہ کہ جیسا امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ قرآن خود معجزہ ہے۔ اس کی ترتیب عمیق بھی ایک مستقل معجزہ ہے چنانچہ انہوں نے قرآن کی ترتیبی اعجاز کو کل قرآن میں بالالتزام بیان کیا ہے۔ دیگر مفسرین نے بھی کیا۔ بیان القرآن سبق الغایات فی نسق الآیات میں بھی قرآن کی ترتیب کو بیان کیا گیا ہے۔ جو اہل استشراق کو نظر نہیں آئی۔ احقر نے اسی انداز پر قرآن کی آخری منزل کی تفسیر جو سب سے زیادہ مشکل ہے، عربی میں جمع کر دی ہے۔

جو ابھی تک طبع نہیں ہوئی۔

چوتھا جواب یہ ہے کہ جن کو بے ترتیبی نظر آتی ہے وہ اُن کا قصورِ نظر ہے۔ قرآن کا مقصد عام مصنفین کی طرح صرف تعلیم نہیں بلکہ تعلیم کے ساتھ تعمیل بھی ہے یعنی جو بتلایا گیا امر ہو یا نہی، اس پر عمل بھی کرایا جائے اور انسانی ضمیر کو عمل کے لیے تیار کیا جائے۔ جس کے لیے قرآن امر و نہی کی تعلیم کے بعد کبھی جنت اور اس کی نعمتوں کا ذکر کرتا ہے اور کبھی دوزخ اور اس کی تکلیفات کا، تاکہ انسان کو نتائج سے آگاہ کیا جائے کہ تعمیلِ حکم کا نتیجہ جنت اور اس کی راحتیں اور عدمِ تعمیل کا نتیجہ دوزخ اور اس کی تکلیفات ہیں۔ کبھی اوصاف الٰہیہ کو ذکر کیا جاتا ہے تاکہ اللہ کی عظمت قلب میں راسخ ہو کر انسان اس کے حکم کی تعمیل کے لیے تیار ہو جائے۔ کبھی انسان پر اپنی نعمتوں کا ذکر کرتا ہے تاکہ ان احسانات سے شرمندہ ہو کر عمل کے لیے آمادہ ہو جائے۔ کبھی وہ واقعات و قصص ذکر کرتا ہے جس میں اہل اطاعت پر انعام ہوا یا اہل عصیان پر عذاب ہوا، تاکہ اطاعت کی طرف انسان کو رغبت ہو اور معصیت سے نفرت۔ یہی چار اصول اگر معلوم ہوں تو قرآنی مضامین میں کسی قسم کی بے ترتیبی کا شبہ پیدا نہ ہوگا۔

دسواں شُبہ اہل استشراق کہتے ہیں کہ بعض آیات میں زبان عربی کے عام قاعدہ کے برخلاف عمل ہوا ہے جس کو لحن کہا جاتا ہے۔ جو اعجاز کے خلاف ہے مثلاً عروہ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتا ہے کہ میں نے اُن سے لحن قرآن کے متعلق پوچھا مثلاً

۱۔ اِنَّ ھٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ ط (سورہ طٰہٰ آیۃ ۶۳) یہ دونوں جادوگر ہیں۔

۲۔ وَالْمُؤْمِنُوْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِیْمِیْنَ الصَّلٰوۃَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوۃَ ط — اور مسلمان ہیں سو مانتے ہیں اس کو جو تجھ پر نازل ہوا۔ اور جو تجھ سے پہلے نازل ہو چکا ہے اور نماز قائم کرنے والے اور زکوٰۃ دینے والے۔

(سورہ النساء آیۃ ۱۶۲)

۳۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِئُوْنَ ط (سورۃ المائدۃ آیۃ ۶۹)	بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور وہ لوگ جو یہودی ہیں اور فرقہ صابئین والے

تو آپ نے فرمایا۔

۴۔ یَا ابْنَ اُخْتِیْ هٰذَا عَمَلُ الْکُتَّابِ اَخْطَاُوْا فِی الْکِتَابِ رَوَاهُ اَبُوْ عُبَیْدٍ فِیْ فَضَائِلِ الْقُرْاٰنِ وَاَخْرَجَ ابْنُ الْاَنْبَارِیِّ فِیْ کِتَابِ الرَّدِّ عَلٰی مَنْ خَالَفَ مُصْحَفَ عُثْمَانَ	اے میرے بھانجے یہ لکھنے والوں کا کام ہے جنہوں نے کتاب میں غلطی کی ہے۔ اسے ابو عبیدہ نے فضائل قرآن میں نقل کیا ہے۔
عَنْ عِکْرَمَةَ لَمَّا کُتِبَتِ الْمَصَاحِفُ عُرِضَتْ عَلٰی عُثْمَانَ فَوَجَدَ فِیْهَا حُرُوْفًا مِنَ اللَّحْنِ فَقَالَ لَا تُغَیِّرُوْهَا فَاِنَّ الْعَرَبَ تَسْتَقِیْمُهَا بِاَلْسِنَتِهِمْ	اور عکرمہؓ سے منقول ہے کہ جب مصاحف لکھے گئے تو حضرت عثمانؓ پر پیش کے گئے تو آپ نے ان میں حروف لحن پائے تو آپ نے فرمایا انہیں تبدیل مت کرو کیونکہ عرب انہیں اپنی زبانوں سے درست کریں گے۔

گویا مذکورہ تین آیات جن میں بظاہر لحن نظر آتا ہے لیکن بے قاعدگی صدیقہؓ سے پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ یہ کاتبوں کی غلطی ہے۔ دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے نسخے لکھ کر حضرت عثمانؓ پر پیش کے گئے۔ آپ نے فرمایا اس میں فروگذاشت ہیں لیکن عرب اس کو اپنی زبانوں سے درست کر دیں گے۔

اس شبہ کا پہلا جواب یہ ہے کہ یہ دونوں روایتیں ضعیفُ الاسناد، منقطع اور مضطرب ہیں علامہ الوسی فرماتے ہیں کہ یہ روایت عثمان سے صحیح نہیں اور ان دونوں کی تردید خود ان روایتوں میں موجود ہے۔ وہ یہ کہ حضرت عثمان نے قرآن کے نسخوں کو دیکھ کر فرمایا۔ بِاَنَّهُمْ اَحْسَنُوْا وَاَجْمَلُوْا الخ لکھنے والے صحابہ نے حسین اور جمیل طریقے سے مرتب کیا۔ پھر اس کے بعد یہ کیسے

فرما سکتے ہیں کہ ان میں غلطیاں ہیں۔ یہ تو مدح اور قدح کا تضاد ہے۔ جو روایت میں ساقط ہونے کے لیے کافی ہے[1]۔ پھر مناہل میں قرآن کے پیش کرنے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ تعالے عنہ نے ان نسخوں میں صرف تین جگہ تصحیح فرمائی۔ ا۔ لَمْ يَتَسَنَّ اس کے ساتھ ھا لگا کر يَتَسَنَّهْ کر دیا۔

۲۔ أَمْهِلِ الْكٰفِرِيْنَ کو فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ کر دیا

(سورۃ طارق آیۃ ۱۷)

۳۔ لَا تَبْدِيْلَ لِلْخَلْقِ کو لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ سے بدل دیا۔

(سورۃ الروم آیۃ ۳۰)

جب آپ کو تصحیح قرآن کا اس قدر اہتمام تھا کہ جہاں معمولی غلطی پائی اس کو درست کئے بغیر نہ چھوڑا تو مذکورہ روایت پر کیسے اطمینان کیا جا سکتا کہ آپ نے لحن اور غلطی کا اقرار کرنے کے باوجود اس کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا جو عقل کے خلاف ہے۔ لہٰذا یہ نقل روایۃً و درایۃً دونوں لحاظ سے درست نہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ لحن سے مراد رسم الخط کا وہ خاص طریقہ ہے جو عام طور پر معمول نہ تھا۔ ابو عبیدہ نے فضائل القرآن میں لکھا ہے کہ لحن کے معنی خلاف الخط المعروف جیسے لَاَاذْبَحَنَّهٗ اور وَلَا اَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ

تیسرا جواب یہ ہے کہ لحن سے مراد طرز تلفظ ہے نہ غلطی جیسے وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ط (سورۃ محمد آیۃ ۳۰)

اَیْ نَهْجِ التَّلَفُّظِ مَثَلًا اَلصِّرَاطُ بِالصَّادِ الْمُبْدَلَةِ مِنَ السِّيْنِ[2]

باقی جو تین غلطیاں یا بے قاعدگیاں پیش کی گئی ہیں اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ اگر قرآن میں

---

[1] مناہل العرفان جلد نمبر ۱ صفحہ ۲۷۹ [2] مناہل القرآن صفحہ ۲۸۰

قواعد عرب کے خلاف کوئی لفظ ہوتا تو زمانۂ قرآن کے مخالفین اس غلطی کو ضرور پیش کرتے اور قرآن کے اعجاز کو توڑ کر فتح حاصل کرتے۔ جب انہوں نے ایسا نہیں کیا تو یہ شبہ نامعقول ہے۔ تاہم میں ہر ایک کا نمبروار جواب دیتا ہوں۔

(۱) ان ھذان لساحران قاعدہ کے مطابق ان ھذین ہونا چاہئیے کہ ان نصب دیتا ہے۔ اولاً تو اس کا جواب یہ ہے کہ قاعدہ زبان کا تابع اور اسی سے ماخوذ ہوتا ہے قرآن نے جو استعمال کیا ہے یہ عرب میں قبیلہ کنانہ، بنی الحارث کی لغت ہے کہ تثنیہ کو تینوں حالات میں الف سے پڑھتے ہیں جیسے مناہل العرفان میں مذکور ہے۔

دوسرا یہ کہ ان ضمیر شان مقدر میں عامل ہے جو انہ ہے اور ھذان لساحران مبتدا خبر ہے۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ ھذان کا الف تناسب لفظ ساحران کی وجہ سے ہے جیسے سلاسلا واغلالا۔ (سورۃ دھر آیۃ ۴) اور یہ بھی عربی کا قاعدہ ہے۔ قرآن میں من سبا بنباء یقین میں سبا کا کسرہ وتنوین بنبا کی مناسبت کی وجہ سے ہے۔

(۲) المقیمین کا منصوب ہونا مدح کی بناء پر ہے۔

(۳) والصابئون کا مرفوع ہونا یا بربنا مبتدا ہونے کے ہے اور خبر محذوف ہے یعنی والصابئون کذالک یا مرفوع ہے عطف ہے محل ان مع الاسم پر یا معطوف ہے ھادوا کی ضمیر مرفوع پر۔

گیارہواں شبہ یہ ہے کہ بعض انسانوں نے بے نظیر کلام عربی میں بنایا۔ مثلاً فیضی کی تفسیر بے نقط، جیسے دیانند نے ذکر کیا کہ اس کی عبارت ان حروف سے بنی ہے جو غیر نقطہ دار ہیں۔ مثلاً م، ل، ح، س وغیرہ۔ اور مسیلمۃ الکذاب، ابن الراوندی الزندیق، ابو العلاء المعری، ابو الطیب المتنبی۔ یہ شبہ بے بنیاد ہے۔

فیضی کی تفسیر بے نقط

فیضی نے جو کام کیا وہ خود فیضی کی نگاہ میں معجزہ نہیں اور تمام بلغاء کی نگاہ میں بھی معجزہ نہیں۔ یہی کام متنبی سے چھ سو سال پہلے عرب ادب میں معمول رہا۔ خود مقامات حریری میں ایسی عبارات فیضی سے بہت پہلے موجود ہیں کہ بعض خالص حروف مہملہ میں بعض حروف معجمہ میں اور بعض عبارات کا ایک لفظ مہملہ حروف یعنی غیر نقطہ دار حروف سے مرکب ہے اور دوسرا لفظ معجمہ سے یعنی نقطہ دار حروف سے۔ اس کے علاوہ فیضی نے ایسا کرنے کو قرآن کا توڑ نہیں سمجھا اور نہ یہ دعویٰ کیا بلکہ وہ آخر زندگی تک قرآن کے اعجاز کا قائل رہا بلکہ اسی تفسیر میں وہ قرآن کے اعجاز اور تعریف کو زور دار الفاظ میں پیش کر چکا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

کلام اللہ لاحد لمحامدہ و لا عد لمکارم مدہ اماء لا ساحل له

قرآن اللہ کا کلام، جس کی تعریفوں کی انتہا نہیں اور جس کی فضیلتیں شمار میں نہیں آسکتیں وہ ایک ایسا سمندر ہے جس کا کنارہ نہیں۔

اس اقرار کے باوجود فیضی کی تفسیر سواطع الالہام کو اعجاز سمجھنا مدعی سست گواہ چست کا مصداق ہے۔

مسیلمہ کی تک بندی

فیضی کے علاوہ مسیلمۃ الکذاب کی بے معنی تک بندی جس میں ہدایت انسانی کی بُو تک موجود نہیں، اس کو نہ مسیلمہ نے قرآن کی طرح معجزہ سمجھا نہ کسی اور نے۔ بلکہ اس کو کسی بلیغ ماہر زبان نے قابل تذکرہ بھی نہ سمجھا۔ ہم ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے اس کو نقل کرتے ہیں۔

وَالْمُبْذِرَاتِ زَرْعًا وَالْحَاصِدَاتِ حَصْدًا وَالذَّارِيَاتِ قَمْحًا وَالطَّاحِنَاتِ طَحْنًا وَالْعَاجِنَاتِ عَجْنًا وَالْخَابِزَاتِ خَبْزًا وَ

یعنی قسم ہے ان عورتوں کی جو بیج ڈالتی ہیں زمین میں اور فصل کاٹنے والیوں کی اور گندم صاف کرنے والیوں کی اور روانہ پیسنے والیوں کی اور آٹا گوندھنے والیوں کی۔ اور روٹی بنانے والیوں کی

الثَّارِدَاتِ تَزْدَرِدُ اللُّقَمَاتِ لُقَمًا إِهَالَةً وَّسَمْنًا۔
اور اس کو شوربا میں ڈالنے والیوں کی اور نوالہ لینے والیوں کی چربی اور مکھن۔

لفظی خامیوں کے علاوہ اس نے ہر جگہ واو استعمال کیا ہے حالانکہ بعض فا اور بعض جگہ ثُمَّ استعمال کرنے کا تھا۔ پھر جو کام مردوں کے تھے یا مرد اور عورتوں میں مشترک تھے اس کو بھی صرف عورتوں کی طرف منسوب کیا۔ نفسِ مضمون اسقدر لغو اور بے فائدہ ہے کہ ادنیٰ درجے کے آدمی کے لیے بھی موجب عار ہے اسی طرح اس کی یہ تک بندی۔

۱۔ اَلْفِيْلُ مَا الْفِيْلُ وَمَا اَدْرَاكَ مَا الْفِيْلُ لَهٗ ذَنَبٌ وَّبِيْلٌ وَّخُرْطُوْمٌ طَوِيْلٌ
ہاتھی اور کیا ہے ہاتھی، اور تو کیا جانے کہ کیا ہے ہاتھی؟ اس کی دُم چھوٹی اور سونڈ لمبی ہے۔

جاحظ نے اس کی یہ تک بندی بھی نقل کی ہے۔

۲۔ يَا ضِفْدَعُ بِنْتَ ضِفْدَعٍ نُقِّيْ مَا تُنَقِّيْنَ نِصْفُكِ فِي الْمَاءِ وَنِصْفُكِ فِي الطِّيْنِ لَا الْمَاءَ تُكَدِّرِيْنَ وَلَا الشَّارِبَ تَمْنَعِيْنَ۔
اے وہ مینڈکوں کی بیٹی مینڈکی! تو ٹراتی ہے۔ تیرا آدھا حصہ تو پانی میں ہے اور آدھا کیچڑ میں۔ نہ تو تو پانی کو گدلا کرتی ہے اور نہ پینے والے کو منع کرتی ہے۔

یہ دونوں تک بندیاں بالترتیب ہاتھی اور مینڈک کے متعلق ہیں۔

ابن الراوندی زندیق یہودی

ابن الراوندی یہودی النسل المتوفی ۲۹۳ھ یہ یہود اور نصاریٰ سے بڑی رقمیں لے کر قرآن اور اسلام کی تردید میں کتابیں لکھتا۔ ان کتابوں کے نام یہ ہیں۔ التاج والفرید والزمردۃ وقضیب الذہب۔ کتاب لکھنے کے بعد یہود و نصاریٰ سے اور رقم طلب کرتا تھا۔ جب نہ دیتے تو ان کتابوں کی تردید کرتا تھا۔ ابو العلاء المعری نے اس کی کتاب تاج کے متعلق لکھا ہے۔

لَا يَصْلُحُ تَاجُهٗ اَنْ يَّكُوْنَ نَعْلًا
اس کی کتاب تاج جوتا بننے کے قابل نہیں۔

یہ اُس ابوالعلاء۔ المعری کا قول ہے۔ جو ابن الراوندی کی طرح ملحد تھا۔ ابو علی جبائی معتزلی سے بغداد کے پُل پر ابن الراوندی نے ملاقات کی اور کہا کہ تم میرے قرآن کو سُنو گے۔ جبائی نے کہا میں تمہارے شرمناک علوم سے واقف ہوں۔ پھر اس نے کہا۔ اے ابن الراوندی تم کو منصف ٹھہراتا ہوں کیا تمہارے اس کلام میں قرآن کی طرح بلاغت، فصاحت، شیرینی اور ہیبت ہے؟ اُس نے کہا کہ نہیں۔

متنبی کی تک بندی

متنبی نے دعوی نبوت کے وقت یہ لکھا تھا۔

اُقْسِمُ بِخَالِقِ اللَّیْلِ وَالرِّیْحِ	میں رات کے خالق اور رات کی ڈراؤنی ہوا کی قسم
الْهَابَّۃِ بِاللَّیْلِ اِنَّ الْکَافِرَ لَطَوِیْلُ	کھاتا ہوں، کافر کے لیے لمبی ہلاکت ہے اور بے شک
الْوَیْلِ وَاِنَّ الْکُفْرَ لَمَکْفُوْفُ الذَّیْلِ	کفر کی دُم لپٹی ہوئی ہے

پھر توبہ کر کے مسلمان ہوا اور مخلص مسلمان ہوا۔ ان سب کا ماخذ اعجاز القرآن مصطفی صادق الرافعی صفحہ ۲۰۸ سے صفحہ ۲۱۷ تک ہے۔ ان چیزوں کے نقل کرنے کا ایک مقصود تو قرآن کے اعجاز کو نمایاں کرنا ہے۔ دوم یہ کہ متنبی وغیرہ مسیلمہ اور ابن الراوندی سے ادبی حیثیت سے اُونچا مقام رکھتے تھے لیکن جب انہوں نے اس میدان میں قدم رکھا تو اُن کا کلام ایسا معلوم ہوا کہ خود اُن کے معتقدین نے بھی ہنسی اڑائی اور خود اُن کا دل بھی اس بے فائدہ کام پر ان کو ملامت کرتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ قرآن کے جواب میں جس نے جو کچھ کہا خود مسلمانوں نے نہایت بے تعصبی کے ساتھ اس کو نقل کیا۔ تیسری بات یہ کہ جو کچھ قرآن کا مقابلہ کیا گیا، یہ اسلامی حکومت جو عروج پر تھی اُس کے تحت رہ کر اور رعیت بن کر خود دارالسلطنت بغداد میں کیا گیا اور آزادی خیال کا یہ عالم تھا کہ حکومت نے باز پرس تک نہیں کی، غالباً یہ سمجھ کر کہ اعجاز قرآن آفتاب ہے اُن تک بندیوں سے اس کو کیا ضرر پہنچ سکتا ہے۔

اعجاز القرآن کا فہم

مشاہدات اور معنویات | ار قرآنی اعجاز اگرچہ بلاغی حیثیت سے ذوقی چیز ہے۔ جیسے کھارے

اور میٹھے پانی کی پہچان، اور بلاغت و فصاحت کے ذوق رکھنے والوں کے لیے یہ ایک بدیہی چیز ہے لیکن ہم چند چیزوں کی نشاندہی کرتے ہیں جن سے اعجازِ قرآن معمولی فہم رکھنے والے انسان کے لیے بھی واضح ہو جاتا ہے۔ کچھ مضامین مشاہدات سے تعلق رکھتے ہیں جو محسوس چیزیں ہیں۔ جیسے آسمان زمین وغیرہ اور کچھ معنویات جو مشاہدہ سے خارج ہیں۔ مثلاً اخلاق، اعمالِ قلبیہ و عقائد احکام و قوانین غیبیات۔ عرب و عجم کے شعراء کی فصاحت و بلاغت کا میدان مشاہدات تھے۔ معنویات ان کا زورِ کلام مشاہدات میں جولانیاں دکھاتا تھا، معنویات میں اُن کا زور ختم ہو جاتا تھا لیکن قرآن نے مشاہدات کو بھی بیان کیا اور غیبیات اور معنویات کو بھی۔ لیکن اُس کے زورِ بیان میں کوئی فرق نہیں آیا۔

۲۔ شعراء عرب و عجم اپنا زورِ بیان دکھانے اور فصاحت و بلاغت نمایاں کرنے میں اس کے پابند نہ تھے کہ جو مضمون وہ بیان کریں وہ صحیح اور سچا بھی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ عربی شاعری کے متعلق یہ مقولہ مشہور تھا کہ اَحْسَنُهٗ اَكْذَبُهٗ۔ بہت عمدہ شعر وہی ہے جس کا مضمون زیادہ جھوٹا ہو۔ لیکن قرآن کے مضامین صدق اور راستی کے پابند تھے۔ جس میں خلافِ واقعہ کوئی مضمون نہیں آسکتا تھا۔ اس لیے قرآن کا دائرہ بہت تنگ تھا لیکن پھر بھی قرآنی بلاغت میں فرق نہیں آیا۔ لیکن اگر کسی شاعر کو صدق کا پابند کیا جائے کہ وہ جھوٹے مبالغہ سے پرہیز کرے تو اس کا کلام پھیکا پڑ جاتا ہے اور زورِ فصاحت باقی نہیں رہتا لیکن قرآن کی بلاغت اس پابندی کے باوجود بے مثال ہے۔

۳۔ انسان اور اس کی قوتیں محدود ہیں بڑے سے بڑا بلیغ شاعر ایک خاص دائرہ میں زورِ فصاحت دکھانے پر قادر ہوتا ہے، دوسرے دائرہ میں نہیں۔ جیسے امراء القیس کی شاعری کا زورِ بیان عورتوں اور گھوڑوں کی تعریف سے مختص ہے۔ نابغہ کا جوشِ بیان خوف کے مضامین سے اعشیٰ کا شراب سے اسی طرح فردوسی و نظامی جنگ کے مضامین میں یکتا ہیں اور سعدی اخلاق میں لیکن قرآن میں ہر قسم کے مضامین آئے ہیں مگر اس کی بے مثال بلاغت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

(۴) قرآنی بلاغت کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں تھوڑے الفاظ میں ایسا مضمون بیان کیا گیا جس سے ایک کتاب بن سکتی ہے لیکن پھر بھی نہ قرآن کی شیرینی میں کوئی فرق آیا نہ مضمون پر دلالت کرنے میں پیچیدگی پیدا ہوئی۔ جیسے وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ط (سورۃ الذاریات آیۃ ۲)

(۵) ہر کتاب جس زبان کی ہوتی ہے، سو سال کے بعد چونکہ زبان بدل جاتی ہے اس لیے سو سال پہلے کے الفاظ متروک ہو جاتے ہیں اور ان سے مطلب برآری مشکل ہو جاتی ہے۔ حضرت شاہ عبد القادرؒ کا ترجمہ قرآن بے مثال ہے لیکن زمانہ گذر جانے کی وجہ سے اس کے بعض اُردو الفاظ کا استعمال ترک ہوا ہے۔ اس لیے اس کی افادیت کمزور ہوئی اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اس ترجمہ کو جدید الفاظ کے قالب میں ڈھال دیا تاکہ افادیت برقرار رہے لیکن اس عام قاعدے کے برخلاف قرآن کی عربی پر چودہ سو سال تقریباً گزر گئے لیکن قرآنی الفاظ کی افادیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں خالق کائنات نے ان الفاظ کا انتخاب کیا ہے۔ جو اس طویل زمانہ گذر جانے کے باوجود ان کا استعمال برقرار رہنے والا تھا۔

ان چار امور کو ملاحظہ کر دینے کے بعد کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ اس انداز کا کلام بلاغت کے اس مقام پر پہنچا ہوا تھا جو انسانی قوت کی رسائی سے بالاتر ہے کہ نزول قرآن کے وقت کعبہ میں سات مشہور قصیدے جو عرب میں بے مثال تھے، لٹکے ہوئے تھے۔ لیکن جب قرآن نازل ہوا تو کسی کے کہنے کے بغیر ارباب قصائد کے خویش واقارب نے ان کو کعبہ سے اُتارا صرف امراء القیس کا قصیدہ باقی رہا، جس کے اُتارنے سے اس کی بہن نے انکار کیا۔ لیکن جب اُس نے قرآن کی یہ آیت طوفان نوح کے متعلق سُنی۔

وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ وَيَا سَمَاءُ أَقْلِعِي وَغِيضَ الْمَاءُ ط (سورہ ہود آیۃ ۴۴)

اے زمین نگل جا اپنا پانی اور اے آسمان تھم جا برسنے سے اور کم ہو گیا پانی

تو امراء القیس کی بہن نے فوراً اپنے بھائی کا قصیدہ بھی اُتارا (اعجاز القرآن الرافعی)

جارج سیل لکھتا ہے کسی انسان کا قلم ایسی معجزانہ کتاب نہیں لکھ سکتا اور یہ مُردوں کو زندہ کرنے سے بڑا معجزہ ہے۔ ار میکسویل کنگ لکھتا ہے اگر وحی کوئی چیز ہے، تو بے شک قرآن ایک الہامی کتاب ہے۔ (تاریخ اسلام عبدالقیوم ندوی ج صفحہ ۳۲۷)

اعجازِ قانونی

قرآن کا بلاغی اعجاز بیان ہو چکا ہے۔ اب دوسری دلیل قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا قانونی اعجاز ہے۔ قانونِ انسانی خواہ ایک فرد کا مرتب کردہ ہو یا جماعت کا (پارلیمنٹ) اور چاہے اس قانون کے بنانے والے انتہائی مہارت رکھتے ہوں، تاہم وہ قانون مختلف اقوام اور ممالک میں با لعموم لمبے عرصے تک نہیں چل سکتا اور ضرور اس میں ایسی خامی ظاہر ہوتی ہے کہ اس میں ترمیم، تبدیلی اور تغیر کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے اور اس کو بدل دینا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی ملک اور سلطنت کے قوانین میں مجالس قانون ساز اور اسمبلیوں اور پارلیمنٹوں کے ذریعے تبدیلیاں کی جاتی ہیں، جو اس قانون کی خامی اور نقص اور کمزوری کی دلیل ہے۔ لیکن قرآن کا قانون جو زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق ہے اور اس کے ظاہر کرنے والی، صرف ایک ذات یعنی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جو لکھنا پڑھنا بھی نہیں جانتے تھے۔ اور امی اور ناخواندہ تھے اور جس ملک میں ظاہر ہوئے وہ بھی اُمیّین اور ناخواندوں کا ملک تھا، نہ اس ملک کے کسی حصہ میں تعلیم کا چرچا تھا اور نہ ان کو کسی قانون سے واقفیت تھی۔ اس کے باوجود قرآن کا قانون صرف عرب میں نہیں بلکہ ایشیا، یورپ اور افریقہ کے تین براعظموں میں ہزار سال سے زیادہ وقت تک اس پر عمل درآمد رہا اور وہ ان میں نافذ العمل رہا۔ لیکن اس طویل عرصہ میں نہ اس میں کوئی نقص پایا گیا اور نہ ترمیم اور تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی بلکہ دورِ حاضر جس میں تعلیم عام پھیل گئی اور اقوام عالم ایک خاندان کی طرح ایک دوسرے سے مربوط ہو گئے ہیں اس میں بھی صرف اہل اسلام نہیں، یورپ کے مخالفین اسلام بھی قرآن کے قانون کو ایک بے مثال

قانون تسلیم کرتے ہیں اور قانون قرآن پر چودہ سو سال گذر جانے کے بعد بھی اس کی معقولیت اور جامعیت کا اقرار کرتے ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر سموئیل لکھتے ہیں کہ قرآن کے مطالب ایسے ہمہ گیر اور ہر زمانے کے لیے موزوں ہیں کہ تمام صدائیں خواہ مخواہ اس کو قبول کرتی ہیں اور محلوں، ریگستانوں، شہروں اور سلطنتوں میں گونجتا ہے۔

۲۔ مسٹر ولف لکھتا ہے۔ "صلح، جمہوریت، رشد و ہدایت، انصاف و عدالت، فوجی تنظیم مالیات اور غرباء کی حمایت اور ترقی کے اعلیٰ آئین قرآن میں موجود ہیں۔

۳۔ ڈاکٹر موریس فرانسیسی لکھتا ہے۔ قدرت کی عنایتوں نے جو کتابیں انسان کو دیں، قرآن اُن سب سے افضل ہے۔

صرف ان تین حوالوں پر اکتفا کرتے ہیں جو تاریخ اسلام عبدالقیوم ندوی ج صفحہ ۲۲ تا ۲۲۲ میں نقل ہیں۔ اس سے آپ اندازہ لگائیں کہ کیا ایسی کتاب کسی انسانی فکر کا نتیجہ ہو سکتی ہے، بلکہ یہ کتاب خالق کائنات کے لامحدود علمی سرچشمہ سے نکلی ہوئی ہے جن کو سب اقوام اور سب زبانوں کی ضروریات کا علم تھا جن کو اُس نے اس کتاب میں سمو دیا۔

آں کتاب زندہ قرآنِ حکیم	حکمتِ اُو لایزال است و قدیم
حرفِ اُو را ریب نے تبدیل نے	معنی اش شرمندۂ تاویل نے
نسخۂ تکوین اسرارِ حیات	بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
صد جہاں تازہ در آیاتِ اُو	عصر ہا پیچیدہ در آفاتِ اُو
نوع انسان را پیامِ آخریں	حاملِ اُو رحمۃ للعالمینؐ (اقبال)

۴۔ اس کے علاوہ سر ڈامنڈ برگ لکھتا ہے۔ "قرآن کے قوانین تاجدار سے ادنیٰ افراد تک پر حاوی ہیں اور اس قدر معقول ہیں جس کی نظیر نہیں ملتی" (حوالا بالا تاریخ عبدالقیوم ندوی)

۵۔ ارنلڈ لکھتا ہے۔ قرآن نے وہ اصول پیش کئے کہ سائنس کی بڑھتی ہوئی ترقی اس کو شکست

نہیں دے سکتی :۔ (حوالہ بالا تاریخ عبدالقیوم ندوی)

اعجاز تاثیری

قرآنِ حکیم اپنی تاثیرات کے لحاظ سے بھی ایک معجزہ ہے کہ کسی انسانی کتاب میں وہ تاثیر نہیں جو قرآن میں موجود ہے اور جو اس کے ذریعے میں پھیل کر پوری دنیا کو اس نے روشن کیا تاثیر یا اثر اندازی کا اوّلین تعلق انسانی رُوح سے ہے۔ روح جب متاثر ہو کر بدل جاتی ہے تو انسانی تصوّرات، گفتار و کردار میں خود تبدیل پیدا ہو جاتی ہے کہ ان تینوں چیزوں کا مرکز دل یا روح ہے۔ حدیث نے بھی حقیقت ظاہر کی ہے کہ بدن میں ایک چیز ہے، جب وہ درست ہو جائے تو پورا بدن درست ہو جاتا ہے۔ (بخاری) مرکزِ اصلاح رُوح ہے لیکن رُوح امرِ ربّی اور آسمانی چیز ہے، زمینی نہیں۔ لہٰذا جو کتاب آسمانی ہوگی، کلام ربّی ہوگی۔ اس سے رُوح کی جو کہ امر ربّی ہے، اصلاح ہوگی۔ قرآن حکیم جس قوم اور ملک میں ظاہر ہوا وہ تمام عالمی برائیوں کا مرکز تھا یعنی ملک عرب اور قومِ عرب (اعتقادی برائیوں کا یہ حال تھا کہ خدا پرستی کا نام و نشان نہ تھا اور بُت پرستی عام تھی۔ انصاف اور عدل مٹ چکا تھا اور پورا جزیرۃ العرب ظلم کدہ بن چکا تھا اور ہر قوی کمزور کو کھائے جا رہا تھا اور دیگر ذرائع معاش نہ ہونے کی وجہ سے لوٹ کھسوٹ ہی اُن کے لیے واحد ذریعہ معاش بن چکا تھا۔ اس سنگدلانہ مظالم سے ان کی اولاد بھی محفوظ نہ تھی۔ یہاں تک کہ وہ اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کرتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے غشیاتؔ اور مسکرات کا استعمال اس قدر عام تھا کہ کوئی مجلس شراب نوشی سے خالی نہ تھی۔ اتفاقؔ و اتحاد کے نام سے بھی واقف نہ تھے اور ہر قوم اور قبیلے کے افراد دائما ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتے تھے اور یہ خانہ جنگی اور قوم کُشی اُن کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ اصلاح کے تمام اسباب، تعلیم، تربیت قانون مفقود تھے جہالت لاقانونیت اور خودسری عام تھی۔ یہ حالات ایسے تھے کہ انسانی وسائل و ذرائع سے ان کی اصلاح ہزار سال

میں بھی ممکن نہ تھی اور ان صدیوں سے پھیلے ہوئے فسادات کو دور کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ عرب کی اصلاح کیونکر تصور میں آسکتی تھی کہ ان میں تو اسبابِ اصلاح کا نام ونشان تک نہ تھا۔ جب کہ دورِ حاضر میں سب اسبابِ اصلاح موجود ہیں۔ تعلیم عام ہے نشرواشاعت کے ذرائع عام ہیں، قانون موجود ہے، اصلاح معاشرہ کی انجمنیں قائم ہیں، فلموں کے ذریعہ اصلاح کی کوشش جاری ہے۔ پھر بھی ہر قسم کے فساد میں روزافزوں اضافہ ہو رہا ہے اور جرائم کی نئی نئی شکلیں ایجاد ہو رہی ہیں اس منظر کو دیکھ کر یہ تصور کرو کہ قرآن کے لیے اصلاح عرب کا ایسا کٹھن کام بالخصوص ایسے وقت میں کہ قرآن کے تیئیس سالہ زمانِ نزول میں سے تیرہ سال جو مکی زندگی کا زمانہ ہے، قرآنی اصلاح کی بندش کا عالم ہے کہ کفارِ مکہ کی جابرانہ قوت نے قرآنی آواز کو پورے تیرہ سال دبائے رکھا اور قرآنی تبلیغ کی تمام راہیں مسدود کردی گئی تھیں۔ ہجرت کے بعد قرآن کو کسی حد تک آزادی حاصل ہوئی لیکن باقی ماندہ گیارہ سال کی مدنی زندگی میں سے آٹھ سال یعنی فتح مکہ تک قرآن کے لیے ایسے تھے کہ خود دشمنانِ قرآن مدینے پر حملے کر کے قرآنی تبلیغ اور کلام الٰہی کی آوازِ حق کو جنگ کے ذریعہ دبانے کی کوشش کرتے رہے جس کی وجہ سے اس آٹھ سال کی جنگی فضا میں بھی قرآن کو آوازِ حق پہونچانے کی آزادی نہ مل سکی۔ زمانۂ نبوت و قرآن کے تیئیس سال میں سے اکیس سال منہا کرنے کے بعد آزاد اثر اندازی کے لیے صرف دو اڑھائی سال ملے ہیں۔ اس بہت ہی کم وقت میں قرآن نے اپنی تعلیم اور آوازِ حق سے جو اصلاحی انقلاب عرب میں لایا وہ دنیا کو معلوم ہے اور صفحاتِ تاریخ میں نمایاں ہے۔ اور دوست دشمن اس کا اقرار کرتے ہیں۔ خدائی حقوق کی اقامت کا یہ حال رہا کہ بُت پرستی یک قلم ناپید ہو گئی اور گھر گھر خدا پرستی اور توحید کا ایسا چرچا پھیلا کہ وہی بُت پرست خود بُت شکن بن گئے۔ اُن کی زبانوں پر ہر وقت اللہ کی توحید جاری ہوئی سر واحد لاشریک کی عبادت میں جُھک گئے۔ دلوں میں اللہ کی عظمت بھر گئی۔ غیر اللہ کا خوف قلب سے نکل گیا۔ انسانی حقوق کا یہ حال تھا کہ جو قوم اپنے حقیقی بھائیوں کی دشمن بنی ہوئی

محق، وہ اسلامی اور قرآنی رشتے کی وجہ سے بلال حبشی، صہیب رومی، سلمان فارسی کو اپنے حقیقی بھائیوں سے زیادہ محبوب سمجھنے لگی، خانہ جنگی کا خاتمہ ہوا اور پوری عرب قوم محبت واخوت کے رشتہ میں منسلک ہو کر ایک فولادی دیوار بن گئی، جوا بازی، سود خوری، شراب نوشی چوری، ڈاکہ، قتل، ظلم نہ صرف عرب سے مٹ گئے بلکہ قرآن سے متاثر ان عربوں کا قدم جہاں پہنچا، وہاں بھی ان برائیوں کا نام نشان نہیں رہا۔ ایک یورپی اہل قلم نے لکھا ہے کہ گویا قرآن کے بعد عرب انسانی صورت میں ملائک بن کر پھر رہے تھے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ایسا اصلاحی کارنامہ جو سراپا معجزہ ہے، صرف قرآن سے وجود میں آیا۔ جو انسانی کتابوں کی مجموعی طاقت اور دنیا کی تمام حکومتوں کی مجموعی قوت سے ممکن نہ تھا۔ تو کیا یہ اس امر کی دلیل نہیں کہ قرآن کلام الٰہی ہے۔ جس نے خداداد تاثیر سے یہ اصلاحی کارنامہ انجام دیا، جو قرآن کے کلام الٰہی ہونے کی تاثیری دلیل ہے۔ جو کچھ ہم نے لکھا اس کا اقرار دور حاضر کے عیسائی دشمنانِ اسلام نے بھی کیا ہے۔

تاثیرِ قرآن یورپ کی نظر میں

ڈاکٹر مارلیں لکھتا ہے۔ قرآن نے دنیا پر وہ اثر ڈالا، جس سے بہتر ممکن نہیں۔

لیبان فرانسیسی لکھتا ہے۔ قرآن ایسا زندہ اور پرزور ایمانی جوش پیدا کرتا ہے کہ پھر کسی شک کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

سر ولیم میور لکھتا ہے کہ قرآن نے فطرت کائنات کی دلیلوں سے خدا کو سب سے اعلیٰ ہستی ثابت کر کے انسان کو اسی کی اطاعت پر جھکایا۔

مسٹر جی۔ ڈی لکھتا ہے۔ قرآن نے بے شمار انسانوں پر اثر ڈالا اور سائنس کی دنیا نے قرآن کی ضرورت کو اور واضح کر دیا۔

مسٹر عمانوئل ڈی ائش لکھتا ہے۔ قرآن کی روشنی اس وقت یورپ میں نمودار ہوئی

جب تاریکی محیط ہو رہی تھی اور اس سے یونان کے مُردہ علم وعقل کو زندگی مل گئی۔

مسٹر ایچ ایس لیڈر لکھتا ہے۔ تعلیم قرآن سے حکمت وفلسفے کا ظہور ہوا اور ایسی ترقی کی کہ اپنے وقت کے بڑے سے بڑے یوریپین حکومت سے بڑھ گیا۔

انجذابی تاثیر

قرآن کی جس اصلاحی تاثیر کو ہم نے بیان کیا کہ وہ ایک ایسا معجزہ ہے جس کا کسی انسانی کتاب سے ظہور میں آنا ممکن نہیں، لیکن اصلاحی اعجاز کے علاوہ قرآن کی انجذابی تاثیر بھی ایک معجزہ ہے جو اس کے کلام الٰہی ہونے کی دلیل ہے، وہ یہ کہ قرآن ایک اچھی خاصی بڑی کتاب جس کا حفظ کرنا ضخامت کے اعتبار سے بھی مشکل ہے۔ دوم یہ کہ غیر عرب مسلمانوں کے لیے اس کی زبان ایک اجنبی زبان ہے یہ حفظِ قرآن کی راہ میں دوسری رکاوٹ ہے کہ اپنی زبان کی کتاب کا حفظ آسان ہے لیکن اجنبی زبان زبان کی کتاب کا حفظ دشوار ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ اس میں متشابہ آیات کی کثرت ہے یعنی ایک جیسی آیت کیساتھ ایک جگہ ایک مضمون کی آیت آئی اور دوسری جگہ اسی آیت کے ساتھ اور مضمون کی آیات آگئیں۔ یہ بھی حفظ کی راہ میں رکاوٹ ہے چوتھی بات یہ ہے کہ قرآن کے حافظ کے لیے قوم یا حکومت کی طرف سے نہ کوئی تنخواہ مقرر ہے، نہ کوئی خاص اعزاز۔ یہ بھی حفظِ قرآن کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے۔ پانچویں بات یہ ہے کہ قرآن کے حفظ کے لیے بھی کافی وقت اور محنت صرف کرنے کی ضرورت ہے اور حفظِ قرآن کو باقی رکھنے کے لیے تا حین حیات زندگی بھر دور وتکرار کی ضرورت ہے اتنی محنت اگر دورِ حاضر میں وہ کسی دنیوی علوم کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے کرے تو بہت کچھ مالی مفاد و دنیوی اعزاز حاصل کر سکتا ہے۔ اس لیے وقت اور محنت اور دنیوی مفاد کی قربانی بھی حفظِ قرآن کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہے۔ لیکن ان سب موانع اور رکاوٹوں کے باوجود مسلمان قوم کے لاکھوں افراد قرآن کے حافظ موجود ہیں اور حفظِ قرآن کا سلسلہ اس کس مپرسی کی حالت میں بھی روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ جو اس امر کی دلیل ہے کہ خود قرآن کی ذات میں

معجزانہ انجذاب اور ایسی کشش کا سامان موجود ہے جو ان رکاوٹوں کے باوجود مسلمانوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے اور کوئی رکاوٹ اُن پر اثر انداز نہیں ہوتی یہ کشش اور انجذابی تاثیر قرآن کا ایک مستقل معجزہ ہے اور اس کے کلام الٰہی ہونے کی دلیل ہے کیونکہ اور کسی کتاب کے اِس قدر حافظ کرۂ ارض میں موجود نہیں اور نہ اس قسم کی کشش کسی کتاب میں پائی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ تورات و انجیل کا ایک بھی حافظ موجود نہیں

قرآن کی اعجازی تاثیر شخصیت رسول علیہ السلام پر

تاثیر اصلاحی اور انجذابی کے علاوہ یہ شخصیتی تاثیر بھی قرآن کا ایک مستقل معجزہ ہے قرآن کے متعلق ایک صحیح رائے ہے کہ یہ کلام الٰہی ہے۔ دوم غلط رائے کہ یہ کلام الٰہی نہیں۔ صحیح رائے کے اثبات، اور غلط رائے کی تردید کے لیے ہم قرآن کی شخصیتی تاثیر کا اعجاز پیش کرتے ہیں۔ شخصیتی تاثیر اعجازی کی تین صورتیں ہیں۔ پھر مزید اعجازی دلائل ذکر ہوں گے۔

۱۔ نزولی اثر ۲۔ قلبی اثر ۳۔ قالبی تاثیر

۱۔ شخصیتی نزولی اثر

یہ ظاہر ہے کہ مخالفین قرآن کی اِس غلط رائے کے پیشِ نظر کہ قرآن کلام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے کلام الٰہی نہیں۔ اگر ایسا ہے تو یہ حقیقت ہے کہ انسان پر اپنے کلام کا بالخصوص جب کہ وہ جھوٹ بول کر اس کو خدا کی طرف منسوب کرتا ہو، گہرا اور عمیق اثر نہیں پڑ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ عرب کے مشہور سات قصائد جو سات شعراء نے بنائے تھے اور فصاحت میں دیگر اشعار کے قصائد سے ممتاز تھے اُن کا کوئی خاص اثر ان شعراء پر ظاہر نہیں ہوتا تھا ورنہ تاریخ میں ان کا ذکر ضرور آتا۔ لیکن قرآن کی وحی۔

سردی میں پسینہ جب حضور علیہ السلام پر نازل ہوتی تھی اور مجمع عام میں نازل ہوتی تھی تو سرد موسم کے باوجود حضور علیہ السلام کے رخسار مبارک سے پسینے کے بڑے بڑے

قطرے بہت زور کے ساتھ ٹپک پڑنے شروع ہو جاتے تھے۔ صدیقہؓ سے اول بخاری میں منقول ہے۔

لَقَدْ رَأَيْتُهُ يَنْزِلُ عَلَيْهِ الْوَحْيُ فِي الْيَوْمِ الشَّدِيدِ الْبَرْدِ فَيَفْصِمُ عَنْهُ وَإِنَّ جَبِينَهُ لَيَتَفَصَّدُ عَرَقًا۔

میں نے حضورؐ کو دیکھا کہ سخت سردی میں آپ پر قرآنی وحی نازل ہوتی تھی اور جب ختم ہوتی تو آپ کی پیشانی سے ایسا پسینہ ٹپک پڑتا کہ جیسے کسی کی رگ نشتر سے کھول جائے اور خون زور سے ٹپکے۔

سردی میں اس مبالغہ کے ساتھ پسینے کی آمد غیر اختیاری ہے۔ تصنع اور بناوٹ کو اس میں دخل نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ یہ تاثیر کسی انسانی کلام میں ممکن نہیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ قرآن حضور علیہ السلام کا اپنا کلام نہ تھا۔ الٰہی کلام تھا۔

ثقل اور بوجھ

کلام الفاظ کا نام ہے جس میں بوجھ یا ثقل نہیں کیونکہ ثقل اجسام کا خاصہ ہے اور الفاظِ قرآن جسم نہیں۔ لیکن حضور علیہ السلام پر جب قرآن کا نزول ہوتا تھا تو اس کے نزول سے حضور علیہ السلام کی شخصیت اور ذات میں معجزانہ طور پر بوجھ اور ثقل پیدا ہوتا تھا۔ معمولی نہیں بلکہ بالکل زیادہ۔

ا۔ بخاری میں زید بن ثابتؓ نقل کرتے ہیں کہ:۔

كادت فخذي ان ترض

قریب تھی کہ میری ران کی ہڈی بوجھ کے دباؤ سے ٹوٹ جاتی۔

۲۔ مستدرک حاکم تفسیر سورۂ مزمل میں صدیقہؓ نقل کرتی ہیں کہ حضورؐ اونٹنی پر سفر میں سوار جا رہے تھے کہ وحی قرآنی نازل ہوئی۔ اونٹنی وحی قرآنی کے بوجھ سے دب کر بیٹھ گئی۔ ظاہر ہے کہ زید بن ثابت پر نہ نزولِ قرآن سے قبل یہ اثر اور اسی طرح اونٹنی پر اثر نہ نزول کے بعد ہوا۔ یہ صرف قرآنی نزول کا اثر تھا۔ یہ تاثیر قرآن میں بھی ذکر ہے۔

إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا (مزمل آیۃ ۵) ہم ڈالیں گے اے پیغمبر تجھ پر بھاری اور بوجھل قول

جب یہ چیز قرآن اور حدیث میں بیان ہوئی اور عام مشاہدے میں آئی تو اگر یہ تاثیر واقعہ کے خلاف ہوتی تو کفار مخالفینِ قرآن ضرور اعتراض و انکار کرتے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ جو اصحاب کی دلیل ہے کہ یہ تاثیر واقعی تواتر سے ثابت تھی۔ لیکن یہ تاثیر صرف قرآن سے وابستہ نہیں، بلکہ نزول بواسطہ جبرئیل سے متعلق ہے۔ گویا وقتِ نزول اور جبرئیل کے فعل و عمل کو بھی اس میں دخل ہے۔ یہ تاثیر قرآن کا معجزہ ہے جو کسی کلام انسانی کو حاصل نہیں۔

۲۔ قرآن کی تاثیر شخصیتِ قلبی

قرآن کا اثر قلب صاحب قرآن نبی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ تھا کہ عبداللہ بن مسعودؓ نے حضورؐ کی فرمائش پر آپ کے سامنے قرآن کی تلاوت کی تو جب لوگوں نے دیکھا تو آپ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری تھے۔ وَعَيْنَاهُ تَذْرِفَانِ۔

۲۔ مطرف بن عبداللہ بن شخیر سے نقل ہے کہ رات کے وقت تہجد میں تنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پڑھتے تھے جب کہ کوئی موجود نہ تھا۔ مطرف فرماتے ہیں۔ میں گذرا تو رونے سے آپ کا سینہ اس قدر جوش مارتا تھا جیسے دیگچی میں اُبلا ہوا پانی جوش مارتا ہو۔

فَلِجَوْفِهِ أَزِيزٌ كَأَزِيزِ الْمِرْجَلِ کیا کسی بناوٹی کلام کا کسی بناوٹ کرنے والے پر رات کی تاریکی اور تنہائی میں ایسا اثر وارد ہو سکتا ہے۔؟ یہ تاثیر کلام الٰہی ہونے کی دلیل ہے۔

۳۔ تاثیرِ قالبی

قول میں تو چنداں تکلیف نہیں لیکن عمل میں بڑی مشقت ہے۔ بناوٹی کلام دکھانے کے لیے ہوتا ہے۔ صاحب بناوٹ خود اس پر مسلسل اور تکلیف دہ عمل نہیں کر سکتا، تاوقتیکہ کوئی اس کو کلام الٰہی نہ سمجھے اور اس کے مضامین کو حق نہ سمجھے۔ لیکن حضور علیہ السلام کے قالب اور بدن پر قرآنی احکام کا کیا ا[illegible] ہوتا تھا۔ جب یہ آیت نازل ہوئی۔

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۙ وَ اِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ ؏ (الم نشرح آیۃ ۷)

اے پیغمبر! جب تو ضروری کام سے فارغ ہو جائے تو اپنے آپ کو خدا کی عبادت میں تھکاؤ اور اللہ کی طرف پورا جھکو

اس کے بعد صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ آپ رات بھر عبادت کرتے تھے یہاں تک کہ تَوَرَّمَتْ قَدَمَاہُ یعنی آپ کے قدم مبارک سوج گئے۔ (بخاری)

۳۔ بخاری میں ہے کہ صدیقہؓ سے حضور علیہ السلام کے اخلاق کے بارے میں سوال ہوا تو آپ نے فرمایا کہ پورا قرآن آپ کا خلق تھا۔ جیسے ایک آدمی کے لیے اپنے خلق و عادت کو چھوڑنا ممکن نہیں، اسی طرح حضور علیہ السلام کے لیے قرآنی احکام اخلاق و عادات بن گئے تھے۔ جو کچھ قرآن میں تھا وہی آپ کے عمل میں موجود تھا۔ کیا اس درجے کی قلبی و جسمانی و عملی تاثیر کسی انسان پر اس کی اپنی بناوٹی کتاب کی ممکن ہو سکتی ہے؟ اگر نہیں ہو سکتی تو یہ دلیل ہے کہ قرآن کلام الٰہی تھا اور حضور علیہ السلام خود اس پر کلام الٰہی کی حیثیت سے سب سے زیادہ عمل کرنے والے تھے۔

۴۔ قرآن کا سیاسی اعجاز

قرآن عرب میں نازل ہوا اور عرب تمام اقوام سے کمزور، بے علم اور بے ہنر تھے۔ سیاسی غلبہ حاصل کرنے کے اسباب ان میں موجود نہ تھے۔ سیاسی اقتدار اور غلبہ کے لیے پہلی چیز عددی کثرت ہے دیگر اقوامِ عالم کی نسبت عرب کی تعداد بہت کم تھی۔ اس وقت کے عرب اور اس وقت کے عرب میں بڑا فرق ہے۔ قرآن کے نزول کے وقت عرب صرف اس وقت کے سعودی عرب اور یمن کا نام تھا۔ عراق، شام، فلسطین، اردن، بیروت، مصر و شمالی افریقہ یہ غیر عرب ممالک تھے، جو اسلامی فتوحات کے بعد عرب ممالک بن گئے۔ دوسری چیز جو سیاسی اقتدار کیلئے ضروری ہے وہ تعلیم ہے لیکن عرب اُمیین یعنی ناخواندوں کا ملک تھا۔ تیسری چیز اتفاق اور وحدت۔ لیکن عرب کا ہر قبیلہ دوسرے کا دشمن تھا۔ خود انصار مدینہ کے دو مشہور قبیلے اوس و خزرج ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اتفاق و

اتحاد کا تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ چوتھی چیز صنعت۔ عرب میں نہ کوئی صنعت تھی اور نہ کارخانہ۔ تلوار تک کے لیے اور معمولی پوشاک کے لیے وہ ہندوستان اور شام کے عیسائیوں کے محتاج تھے۔ پانچویں چیز زراعت اور غذائی کفالت ہے۔ کھجور کے سوا خوراک کے لیے وہ غیر اقوام کے محتاج تھے کیونکہ ان کا اپنا ملک زراعتی ملک نہ تھا۔ قرآن نے خود اس کو وَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ فرمایا۔ چھٹی چیز معدنی دولت۔ اس وقت عرب میں کسی معدنی دولت کا وجود نہ تھا۔ جو کچھ بھی اب نظر آ رہا ہے وہ دورِ حاضر کی پیداوار ہے۔ ساتویں چیز جسمانی قوت۔ عرب گرم ملک تھا۔ ضروری غذا بھی میسر نہ تھی۔ پانی کی بھی کمی تھی۔ سردی گرمی سے بچنے کے لیے مکانات نہ تھے۔ اکثر آبادی خانہ بدوشوں اور جھاڑیوں میں گذارہ کرتی تھی۔ علاج کا بھی کوئی انتظام نہ تھا۔ آٹھویں چیز رُوحانی و اخلاقی قوت ہے جو توحید کے اعلیٰ اور پاکیزہ تصور سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن عرب آبادی پتھروں یا پتھروں سے تراشے ہوئے بتوں کی پرستش کرتی تھی۔

یہ وہ حالات تھے جس میں قرآن کا عرب میں ظہور ہوا اور عرب نے بالاتفاق اس روشنی کو مٹانے میں اپنی قوتیں صرف کیں۔ دو اڑھائی سال سے زیادہ وقت قرآن کو آزاد اشاعت کے لیے نہ مل سکا لیکن اس قلیل مدت میں قرآن نے عرب کو کہاں سے کہاں تک پہونچا دیا۔ اس کا اندازہ عرب قبل القرآن اور عرب بعد القرآن کے درمیان موازنہ کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے۔ عرب قبل القرآن وہی تھا جو ہم نے ذکر کیا۔ لیکن عرب بعد القرآن ایسی قوم بن گئی جو تنظیم، اتحاد، اخلاق، بلند خیالی، اولوالعزمی، ایثار و قربانی، خدا پرستی، شجاعت، سخاوت، عفت، پاک دامنی، رحم و شفقت، عقل و تدبیر، جہاں بانی، جہانگیری، دیانت و امانت، صدق و راستی، پابندیٔ عہد عدل و انصاف میں کوئی قوم اُن کی ہمسر نہیں تھی، بلکہ پوری تاریخ بشریت اس کی نظیر پیش کرنے سے خالی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ان آٹھ کمزوریوں کے باوجود، جو ہم نے ابھی ذکر کیں، وہ دنیائے شرق و غرب کے دو عظیم متمدن اور بے انتہا ساز و سامان رکھنے والی سلطنتوں سے بیک وقت ٹکرائی یعنی کسریٰ و قیصر کی سلطنتوں سے جو پوری دنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں لیکن انہوں نے نیست

کم وقت میں ان دونوں حکومتوں کو غبار بنا کر رکھ دیا اور ان کے باعظمت تاج و تخت کے پرچخے اڑا دیئے، اب سوال یہ ہے کہ یہ سیاسی غلبہ جو عرب کو حاصل ہوا اور رفتہ رفتہ جس کی طوفانی موجیں مشرق میں کاشغر اور دیوار چین سے ٹکرائیں اور مغرب میں مراکش اور فرانس تک۔ یہ کس چیز کا نتیجہ تھا۔ سیاسی اقتدار و غلبہ کے لیے دو قسم کے اسباب ہو سکتے ہیں۔

ایک مادی اور دوم روحانی اور غیبی۔

مادی اسباب تو عرب کو حاصل نہ تھے بلکہ عرب کے دشمنوں اور حریف قوتوں کو حاصل تھے، مادی اسباب پر سیاسی تغلب کا فیصلہ ہوتا تو یہ ضروری تھا کہ عرب صفحۂ ہستی سے مٹ جاتے اور نتیجہ بالعکس ظاہر ہونا چاہیئے تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ اس غیبی و روحانی قوت سے ہوا جو عرب کو قرآن اور صاحب قرآن علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بدولت نصیب ہوئی اور ظاہر ہے کہ اس قسم کی معجزانہ قوت بغیر الٰہی کتاب کی قوت کے ممکن نہیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ قرآن کلام الٰہی ہے اور جس ذاتِ اقدس پر اس کتاب کا نزول ہوا وہ خدا کے اکمل ترین رسول اور خاتم النبیین تھے۔ مسلمانوں کے موجودہ زوال کا سبب ترکِ عمل ہے کہ انہوں نے اسلام اور قرآن پر عمل ترک کر دیا ہے۔ ورنہ اسلام اور قرآن اس دور میں بھی مسلمانوں کی تمام کمزوریوں کا علاج ہے۔ قرآن کا نسخہ ہزار سال سے زائد عرصے کا آزمودہ اور تجربہ شدہ ہے۔ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ[1] قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ[2] لیکن کوئی مجرب سے مجرب نسخہ کاغذی اور قولی شکل میں اپنا صحت مندانہ اثر نہیں دکھلا سکتا، تاوقتیکہ اس پر عمل نہ ہو۔ یورپ کے مستشرقین اس راز کو خوب جانتے ہیں کہ اگر مسلمانوں نے اسلام اور قرآن کی طرف رجوع کیا تو ستر کروڑ مسلمان متحد ہو جائیں گے، ایک مرکز کے نیچے آجائیں گے، اُن کی منتشر قوتیں اور ذرائع ترقی یکجا ہو کر وہ دنیا کی اول نمبر طاقت بن جائیں گے اور ہمارے ہاتھ سے یہ شکار نکل جائے گا اس

---

[1] سورۃ بنی اسرائیل آیۃ ۸۱ [2] سورۃ حٰم السجدۃ آیۃ ۴۴

لیے انہوں نے مسلمانوں کو اسلام و قرآن سے ہٹانے کی کوشش ایک مدت سے شروع کی
اور یہ کہا کہ مسلمانوں کا زوال اسلام اور قرآن کی وجہ سے ہے۔ اگر وہ مغرب کی گندہ اور خدا
بیزار تہذیب اختیار کریں گے، تو ان کو ترقی نصیب ہو گی، جس کی وجہ سے اسلامی ممالک میں
قدیم و جدید جنگ جاری ہے اور روز بروز مسلمانوں میں انتشار اور مرکز گریز جذبات
پرورش پا رہے ہیں۔ ہم نے اپنی دو کتابوں "ترقی اور اسلام" اور "اشتراکیت اور اسلام"
میں اس مسئلہ کو پورا حل کیا ہے۔ جس کی روح دو چیزیں ہیں، وہ یہ کہ یورپ کی صنعت اور
ہنر اور علم۔ اور چیز ہے اور یورپ کی طرز زندگی، معاشرت اور تہذیب دوسری چیز ہے پہلی چیز
اسلام کی ہے جس پر یورپ نے قبضہ کیا ہے یعنی ان کی صنعت کاری یہ لے لو اور دوسری چیز یورپ
کی گنہگاری ہے اُس کو چھوڑ دو۔ اس پر تعلیم قدیم والوں کو کوئی اعتراض نہیں کیونکہ وہ اسلام کے
ساتھ فٹ ہے۔ فٹ کرنے کی ضرورت نہیں۔ دلائل میری دیگر کتابوں میں ہیں۔ اور یورپی
تہذیب کی گنہگاریاں چھوڑ دو، کہ وہ اسلام اور ترقی دونوں کے خلاف اور خود یورپ ان کی
وجہ سے مبتلاء انحطاط ہے اور حالت نزع میں ہے۔ اس طرح خانہ جنگی ختم ہو سکتی ہے اور
تعلیم قدیم و جدید کے دونوں بازو پروازِ ترقی کے لیے ضروری ہیں، دونوں طبقوں کو ملا دو کر ارتقاء

۵۔ دلیل غذائی

انسان دو جزء سے مرکب ہے۔ جسم اور روح۔ دونوں چونکہ اس عالم تغیر اور جہانِ کون و
فساد میں آباد ہیں اس لیے تغیر پذیر ہیں۔ اس لیے تاوقتیکہ دونوں کے لیے غذا کا انتظام نہ ہو تو
ان کا باقی رہنا ناممکن ہے۔ اس لیے قدرت نے بقاء۔ جسم و بدن کے لیے بھی غذاء کا انتظام کیا
ہے تاکہ بدن فناء سے محفوظ ہو اور بدن کی تخلیق سے جن فوائد کا تعلق ہے، ان میں خلل واقع
نہ ہو، اور رُوح کی غذا کے لیے بھی تاکہ روح کو حیات حاصل ہو اور وہ اپنے تخلیقی مقاصد
کو پورا کرے۔ قدرت نے بدن انسانی کی غذا کا ایسا وسیع پیمانہ پر انتظام کیا ہے کہ زمین سے

کہ آفتاب و مہتاب تک اس کی تیاریِ غذا میں مصروف کار ہیں مثلاً روٹی بدن کی غذا ہے۔ زمین اپنی قوتِ نامیہ سے گندم اگاتی ہے۔ پانی اور ہوا اس کو سرسبز رکھتے ہیں۔ ستاروں کی کشش سے اس کو نشوونما حاصل ہوتی ہے۔ سورج اپنی شعاعوں سے بخاراتِ سمندر اُڑا کر بادل تیار کرکے بارش کی تیاری کرتا ہے اور اپنی گرمی سے وہ گندم کے دانوں کو پختہ کرتا ہے۔ ہوائیں بھوسے اور دانے کو جُدا کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ دن رات کا تعاقب ان میں اعتدال پیدا کرتا ہے۔ گویا پورا کارخانۂ عالم گندم بنانے میں مصروف ہے تاکہ بدنِ انسانی کی خوراک مہیا ہو۔ حالانکہ روح کی نسبت بدن کی قیمت بہت کم اور نسبتاً اس کا درجہ روح سے بہت پست ہے۔ جب اس پست جزو کی غذا کی فراہمی کے لیے اس قدر عظیم اور وسیع انتظام قدرت کی طرف سے موجود ہے، تو یہ ناممکن ہے کہ رُوح کی غذا کے لیے کوئی انتظام نہ ہو۔ ایسا ہونا حکمت اور عقل دونوں کے خلاف ہے۔ بدن چونکہ زمینی ہے لہٰذا اس کی غذا کا سامان بھی زمین سے کر دیا گیا اور رُوح آسمانی اور امرِ ربی ہے اسی وجہ سے اس کی غذا کا سامان عالمِ بالا سے ہونا ضروری ہے کیونکہ رُوح خود عالمِ بالا کی چیز ہے۔

روح کی غذا آسمانی

اب وہ غذاءِ روحانی کونسی ہے جو قدرت کی طرف سے رُوح کی نشوونما اور حیات کے لیے تجویز کی گئی ہے اور قدرت کی طرف سے اس کی روحانی حیات کو اس سے وابستہ کر دیا گیا ہے۔ روح بیچونی اور بےچگونی اللہ سے مناسبت اور مشابہت رکھتی ہے۔ لہٰذا اللہ کی طرف سے ایسی چیز جو اللہ کی ذات سے مربوط ہو اور اسی کی صفت سے ہو، وہی روحانی حیات کی غذاء ہو سکتی ہے اللہ کی ذات اور صفات میں صرف اللہ کی صفتِ کلام ایک ایسی چیز ہے جو روحِ انسانی کی طرف منتقل ہو کر حیاتِ روحِ انسانی کا ذریعہ بن سکتی ہے اور کلامِ الٰہی اور وحیِ ربانی کے بغیر انسانی روح کی حقیقی حیات ناممکن ہے۔ جیسے غذاءِ جسمانی کے بغیر جسم کی حیات ممکن نہیں۔

حیاتِ رُوحانی کا معیار

روح کی حقیقی حیات کا معیار کیا ہے؟ وہی جو کسی جسمانی

عضو کی حیات کا معیار ہے اور موت روح کا معیار بھی وہی ہے جو کسی انسانی عضو کی حیات و موت کا معیار ہے اب یہ فیصلہ کہ واقعی کلامِ الٰہی یا قرآن غذاء روحانی ہے، اس کا فیصلہ بھی غذا کے مقررہ معیار سے ہوگا۔

معیارِ غذائیت

غذائیت کا معیار دو امر ہیں۔ ۱۔ میلان طبعی ۲۔ ترقی اور نشوونما۔ مثلاً روٹی گوشت جسمانی غذاء ہے اور لوہا اور لکڑی جسمانی غذا نہیں، دونوں میں معیار ممیز یہ ہے کہ روٹی اور گوشت کی طرف طبعی میلان انسان میں موجود ہے اور لوہے اور لکڑی کی طرف طبعی میلان نہیں، کوئی نہیں چاہتا کہ لکڑی اور لوہے کو گندم کی طرح پیس کر یا بُرادہ بنا کر کھائے۔

دوم معیار یہ ہے کہ اگر روٹی یا گوشت کھائے تو بدن کی ترقی اور نشوونما ہوگی، لیکن لوہے اور لکڑی سے نشوونما بدن کی نہ ہوگی بلکہ اُلٹا نقصان ہوگا۔ اسی طرح قرآن کی طرف طبعی میلان بھی موجود ہے جس کی وجہ سے لاکھوں حافظ طویل عمر صرف کر کے اس کو حفظ کرتے ہیں اور عمر بھر اس کا بغیر کسی دنیوی فائدے اور کشش کے اس کا دور و تکرار کرتے ہیں اور اس قرآن کے علم و عمل سے روح میں ایسی حقیقی زندگی پیدا ہو جاتی ہے کہ مٹھی بھر انسان ہزاروں پر غالب آجاتے ہیں، جیسے ہم نے سیاسی اعجاز میں بیان کیا۔ اگر قرآنی غذا سے روح محروم ہوگی تو حیات روحانی ختم ہوگی اور حقیقی زندگی سے محروم ہوگی۔ جس طرح بدنی غذاء کے نہ ہونے سے بدن کو موت آجاتی ہے اور حیات ختم ہو جاتی ہے۔

موت و حیاتِ رُوح

ہر چیز کی حیات اس کے مقصد تخلیق سے معلوم کی جا سکتی ہے ۱۔ آنکھ کی تخلیق دیکھنے کے لیے اور کان کی تخلیق سننے کے لیے ہے۔ آنکھ جب دیکھ نہ سکے اور کان جب سُن نہ سکے تو یہ دونوں کی موت ہے۔ روح کی تخلیق معرفت الٰہی کے لیے ہوئی، جس وقت یہ مقصد حاصل ہو تو روح زندہ ہے ورنہ مُردہ ہے

۲۔ معرفت الٰہی اور تعلق مع اللہ سے روح میں ایک عظیم قوت منتقل ہوتی ہے، جس کا مقابلہ وہ روحیں نہیں کر سکتیں جو اس قوت سے خالی ہیں۔ اسی قوت کا نام حیات رُوحانی اور

اس کے فقدان کا نام موت روحانی ہے۔ اسی حیات کو قرآن حکیم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ (الانفال آیۃ ۲۴)	اے ایمان والو! اللہ اور رسول کا کہا مانو جب وہ تم کو ایسی چیز کی طرف بلاتے ہیں جو تم کو زندگی عطا کرتی ہے۔

جس سے معلوم ہوا کہ یہ رُوحانی زندگی جسمانی زندگی سے بلند تر زندگی ہے۔ اسی رُوحانی حیات کی برکت و قوت سے صحابہ کرام نے اپنے سے چند گنا زیادہ تعداد کے لشکروں کو شکست دی اور باوجود بے سروسامانی کے وہ حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے جو صرف جسمانی زندگی رکھنے والوں کے لیے ناممکن تھے۔ یہ زندگی اُن کو قرآن اور اسلام سے حاصل ہوئی۔ ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ (آل عمران آیۃ ۱۰۳) کے تحت حضرت قتادہ نے اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کیا ہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ عرب تمام لوگوں سے زیادہ ذلیل اور تنگدست تھے اور سب سے زیادہ گمراہ تھے۔ ان کے پاس نہ پوشاک تھی نہ خوراک۔ وہ دو زبردست شیروں کے درمیان بندھے ہوئے تھے یعنی فارس و روم۔ ان کے پاس کوئی قابلِ رشک چیز نہ تھی، وہ خوراک کھانے سے محروم تھے۔ اور پڑوسی قومیں ان کو کھاتی رہیں، یہاں تک کہ اسلام آیا اور اسلام نے ان کو ایک کتاب دی (قرآن) جس نے ان کو تمام کا حاکم بنا دیا۔

قرآن غذائے روحانی ہے

غذاء کے لیے ہم نے دو معیار بیان کئے ہیں طبعی میلان اور ترقی۔ قرآن کی طرف میلان کا تو یہ حال ہے کہ روحیں اس کی طرف کھچی جا رہی ہیں اور دنیا کی کسی کتاب کو اس قدر نہیں پڑھا جاتا جس قدر اس کتاب کو۔ دنیا کی کسی کتاب کے اتنے حافظ موجود نہیں جس قدر قرآن کے حافظ دنیا میں موجود ہیں۔ حالانکہ قرآن کو حفظ کرنے پر حفاظ کو نہ مسلمانوں کی طرف سے کوئی معاوضہ ملتا ہے۔

اور ہر قوم کی طرف سے۔ اور پھر قرآن کی زبان غیر عربوں کے لیے اجنبی زبان ہے جس کی طرف بلا مجبوری کسی کو طبعاً کشش بھی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس کو پڑھنے والے اور اس کو یاد کرنے کی تعداد تمام دنیا کی کتابوں سے بڑھ کر ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ قرآن روحانی غذا ہے اسی لیے اس کی طرف یہ کشش پائی جاتی ہے۔ دوسری چیز کہ غذا سے مغتذی کو ترقی اور بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔ تو قرآن کی تاریخ بتاتی ہے کہ قرآن کی برکت سے کمزور انسان طاقت ور ہو گئے بے اخلاق با اخلاق بن گئے۔ پست، بلند اور ناپاک پاک ہو گئے۔ جس کے بعد کسی کو اس امر میں شک نہیں رہتا کہ قرآن آسمانی غذا ہے جو رُوح کے لیے آسمان سے اُتاری گئی اور اس نے قرآن پر یقین رکھنے والوں کو وہ عظمت اور شان بخشی، جس کی نظیر انسانی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ یہی شان کلام الٰہی کی ہو سکتی ہے۔

۶۔ دلیلِ نظامی

قرآن حکیم نے انسانی زندگی کے لیے وہ نظام قائم کیا ہے جس سے خود یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ یہی کتاب خالقِ انسان کی طرف سے ہے۔ انسان کا بنایا ہوا نہیں کیونکہ حیات انسانی کے اسرار و رموز صرف خالقِ حیات ہی جانتا ہے نہ کوئی اور۔ انسان نے جب بھی اس راہ سے ہٹ کر کسی انسانی لائحہ حیات پر چلنے کی کوشش کی تو اس کو امن اور چین نصیب نہیں ہوا۔ قرآن کا نظامِ حیات تو اس قدر کامل اور زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے کہ اگر اس کو تفصیل سے بیان کیا جائے تو ایک اچھی خاصی بڑی کتاب بن جائے گی۔ اس لیے ہم صداقتِ قرآن کے زاویہ نگاہ سے صرف چند بنیادی اصول پیش کرتے ہیں۔ انسانی زندگی کے بنیادی اصول حسب ذیل ہیں۔

۱۔ انسان کا خالقِ کائنات سے تعلق۔

۲۔ انسان کا خود اپنے ہم جنس انسانوں سے تعلق۔

۳۔ انسان کا کائناتِ عالم سے تعلق

۴۔ انسان کا مقصدِ حیات

۵۔ انسانی زندگی کی آخری منزل۔

پہلا اصول۔ انسان کا خالق کائنات سے تعلق۔

خالقِ کائنات انسانی زندگی کا مرکز ہے۔ انسان کی زندگی، لوازم زندگی، ظاہری و باطنی فوائدِ حیات کا آخری فیصلہ اس کی مشیّت سے وابستہ ہے۔ انسان کا اپنے مرکزِ حیات سے کٹ جانا موت ہے اور اسی سے جڑ جانا حقیقی زندگی ہے۔ اس لیے انسان کا اوّلین فرض یہ ہے کہ خالق کائنات کے آگے اپنی اس حیثیت پر یقین رکھے۔ قرآن نے پہلے انسان کی اس حیثیت کو نمایاں کرنے کے لیے ارشاد فرمایا:۔

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ ط (سورہ ملک آیۃ ۲) یعنی خالقِ کائنات انسان کی موت و حیات کا خالق ہے۔

پھر اعلان کیا:

وَمَا بِکُمْ مِّنْ نِّعْمَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ ط (سورہ النحل آیۃ ۵۳) انسان کو جس قدر نعمتیں حاصل ہیں وہ خالقِ کائنات ہی کی بخشش ہے۔

پھر ارشاد فرمایا کہ وہ اپنی سعی و عمل اور جد و جہد سے جو کچھ حاصل کرتا ہے اس کا آخری فیصلہ بھی قدرت کے ہاتھ میں ہے اس کو اپنی کوشش پر نازاں نہیں ہونا چاہیے۔

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ ط (التکویر آیۃ ۲۹) اور تم بدون خدا کے چاہے کچھ نہیں چاہ سکتے

خود سید الکائنات کی زبان سے قرآن نے یہ اعلان کرا دیا۔

قُلْ لَّآ اَمْلِکُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ ط (سورۃ اعراف آیۃ ۱۸۸) اعلان کر دو کہ میں اپنی ذات کے لیے بھی سود و زیاں کا اختیار نہیں رکھتا تا وقتیکہ قدرت کی مشیت اس کا فیصلہ نہ کر دے

ان تصورات کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ (۱) انسان کو رب العالمین سے ایک مضبوط رشتہ محبت پیدا ہو جاتا ہے۔ جو کبھی نہیں کٹتا۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ط (البقرہ آیۃ ۱۶۵) ایمان اور یقین والوں کو سب سے زیادہ محبت اللہ سے ہوتی ہے۔

اسی محبت کا اثر ہوتا ہے کہ اس کی فکری و عملی زندگی اللہ کی مرضی سے مربوط ہوتی ہے اور اس کا ظاہر و باطن اپنے خدا کے آگے سرنگوں ہوتا ہے اور ظاہر و باطن یادِ الٰہی سے معمور ہو جاتا ہے وہ اگر کائنات پر نظر ڈالتا ہے تو اس کو آئینہ جمال محبوب سمجھ کر ڈالتا ہے۔

يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُودًا وَّ عَلٰى جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ط	وہ اٹھتے بیٹھتے لیٹتے یادِ الٰہی میں مشغول ہوتے ہیں اور دل و دماغ سے مخلوقات زمین و آسمان پر اس تصور کے تحت نگاہ ڈالتے ہیں کہ اے خالقِ عالم تو نے یہ عالم بلا مقصد نہیں بنایا۔ (آل عمران آیۃ ۱۹۱)

اور وہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کے تصور کے تحت صرف رب العالمین کو دین و دنیا کی کامیابیوں کا سرچشمہ سمجھتے ہیں اور اعتقادی، قولی اور عملی عبادت بھی اسی کی کرتا ہے اور مشکلاتِ دین و دنیا کے حل کے لیے بھی جد و جہد کی تکمیل کے بعد اسی سے امداد طلب کرتا ہے۔ وہ اپنی رضا کو رضاء الٰہی میں مدغم کر دیتا ہے اور مامورات اور منہیات الٰہیہ یعنی خدا کے احکام کی تعمیل کو اپنی زندگی کا لازمی جزو بنا دیتا ہے۔ خود قرآن حکیم اپنے فیض یافتگان کی اس حالت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ط اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ط	اللہ نے محبت ڈال دی تمہارے دل میں ایمان کی اور کھپا دیا تمہارے دلوں میں اور نفرت ڈال دی تمہارے دل میں کفر، گناہ اور نافرمانی کی یہی لوگ ٹھیک راہ پر ہیں۔ (حجرات آیۃ ۷)

یہی وہ چیز ہے جس سے انسان کو اپنے خالقِ کائنات اور مرکزِ حیات سے ربط پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ ربط وہ چیز ہے جس سے انسان کے قلب اور دل و دماغ کو اطمینان اور چین نصیب ہوتا ہے اور تمام دنیاوی پریشانیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ط (الرعد آیۃ ۲۸)

دوسرا اصول۔ انسان کا دیگر انسانوں سے تعلق

انسان کی زندگی چونکہ تمدن اور اجتماعیت پر مبنی ہے اس لیے انسان تمام دیگر حیوانات کے برخلاف منفرد زندگی نہیں گذار سکتا۔ اس کو اپنی زندگی کی ضروریات کے لیے دوسرے انسانوں سے امداد لینا پڑتی ہے حجامت کے لیے حجام کا، پوشاک کے لیے کپڑے بننے والے کا برتن کے لیے برتن بنانے والے کا، مکان کے لیے معمار کا اور علاج کے لیے طبیب ڈاکٹر کا محتاج ہے علی ہذا القیاس وہ اپنی بے شمار ضرورتوں کے لیے بے شمار دیگر انسانوں کی امداد کا محتاج ہے۔ اس لیے جب تک اس کو دیگر انسانوں سے ربط اور تعلق نہ ہو، وہ اپنی زندگی قائم نہیں رکھ سکتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ انسانوں کے درمیان تعلق باہمی کے عمدہ اُصول ہوں جن پر چل کر انسان اپنی اجتماعی زندگی کے فوائد سے نفع اندوز ہو سکیں۔ قرآن حکیم نے حقوق انسانی کے متعلق ایسے واضح احکام اور جامع ہدایات دیئے ہیں کہ جن پر چل کر انسان کی اجتماعی زندگی نہایت خوشحال اور پُرامن بن سکتی ہے۔ تفصیلات کی گنجائش نہیں، اصولی رنگ میں قرآن نے انسان کی اجتماعی زندگی کے چند اُصول قائم کئے ہیں۔

ا۔ وحدتِ بشری کا اعتقاد کہ تمام انسانی اقوام باوجود اختلاف رنگ ونسل ووطن کے ایک ہی کنبہ اور ایک ہی خاندان ہے۔ لہٰذا ایک انسان کو تمام افراد انسان کے ساتھ وہی سلوک برتنا چاہیئے جو وہ اپنے خاندان کے ایک فرد سے برتتا ہے کیونکہ کُل افراد انسانیہ ایک ماں باپ آدم وحوا کی اولاد ہے۔

ب۔ نسل اور رنگ اور ملک کا اختلاف تعارف کے لیے ہے تقاتل اور لڑنے کے لیے نہیں، کسی شخص کا ایک قوم یا ملک سے منسوب ہونا اس کی شناخت اور معرفت کا ذریعہ ہے، نہ کہ اس سے نفرت کی جائے اور جنگ کی جائے۔

تیسرا اُصول۔ انسان کا کائنات عالم سے تعلق۔

انسان کا کائناتِ عالم سے تعلق مخدوم اور خادم کا ہے۔ پوری کائنات انسان کی خدمت میں مصروف ہے، سفلیات میں سب عناصر زمین، باد، آب، آگ، جزئیات میں بادل، بارش

علویات میں آفتاب و ماہتاب و سیارگان سب اپنے اپنے درجہ میں انسان کی ضروریات حیات کی فراہمی میں مصروف ہیں۔ انسان کو معلوم ہو یا نہ ہو، یہی حال حیوانات، نباتات اور معدنیات کا ہے جن میں ہر ایک کے فوائد کی تحقیق ایک مستقل علم ہے۔ اسی حقیقت کا قرآن حکیم نے ان الفاظ میں اعلان کیا ہے۔

خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ط (البقرہ آیۃ ۲۸)	زمین اور زمین کی کل چیزیں اے انسان! تمہارے فائدے کے لیے بنائی گئی ہیں۔
وَسَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط (الجاثیہ آیۃ ۱۲)	اے انسان! تمہاری خدمت اور نفع رسانی میں لگا رکھی ہے ہم نے آسمان اور زمین کی کائنات

کائنات کے اس تعلق کے معلوم کرنے سے انسان پر چند حقیقتیں روشن ہو جاتی ہیں۔

ا۔ کہ عالم کی ہر چیز علوی ہو یا سفلی، اس میں انسانی فوائد مضمر ہیں اور انسان کو چاہیئے کہ وہ ان فوائد کی جستجو کر کے حاصل کرے۔ جس سے انسان کی انا میں حاکمیت علی الکائنات اور تسخیر کائنات کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے دنیوی علوم کے دروازے اس پر کھل جاتے ہیں اور انسان اور کائنات کے درمیان افادہ اور استفادہ کا ربط پیدا ہو جاتا ہے اور انسان میں ان فوائد کی تحصیل کی جدوجہد پیدا ہو جاتی ہے اور علومِ کونیہ کے ذریعے ان فوائد پر قبضہ کر کے انسان ان فوائد کی حکمت و تخلیق کو پورا کرتا ہے۔

ب۔ دوم نتیجہ اس تعلقِ عالم کا یہ ہوتا ہے کہ انسان خود کو حاکم اور مخدوم اور کائنات کو محکوم اور خادم سمجھ لیتا ہے بنا دہ دنیاوی فوائد کو شرفِ انسانیت کا خادم، محکوم اور تابع بنا دیتا ہے اور شرفِ انسانی کو ان فوائد کا خادم یا محکوم نہیں بناتا اور وہ اس نظریہ پر عامل ہوتا ہے کہ سے

"جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے"

اس بناء پر وہ دنیا کو شرف انسان کی تکمیل کا ذریعہ بناتا ہے۔ شرف انسانی دنیا پر قربان نہیں کرتا۔ وہ زر و مال کا حاکم ہوتا ہے، زر و مال کا بندہ و غلام نہیں ہوتا۔ اس اصول سے

اس کی خودی بلند ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی روحانی شخصیت دانا کی عظمت کا معترف ہو جاتا ہے اور دنیوی خسیس اغراض کے لیے شرفِ انسانی کو داغ نہیں لگاتا۔

ج ہر کائنات عالم کی تسخیر اور خادمیت کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان شرک سے محفوظ ہو جاتا ہے وہ اپنے اشرف المخلوقاتی اصول پر یقین رکھنے کے بعد مخلوقات کو اپنا خادم سمجھ کر اس کو معبود یا لائقِ پرستش و عبادت نہیں سمجھ سکتا کیونکہ مخدوم کبھی خادم کی عبادت نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس سے مرادیں وابستہ کر سکتا ہے۔ اس لیے قرآن نے ان لوگوں کے حق میں جنہوں نے آسمانی یا زمینی معبود بنا رکھے تھے۔

ارشاد فرمایا:۔

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ	جن لوگوں نے مخلوق کی عبادت اختیار کی انہوں نے اپنے آپ کو شرفِ انسانی کے آسمان سے نیچے گرا دیا۔
(سورۃ حج آیۃ ۳۱)	

اسی تعلق کا اثر ہوتا ہے کہ انسان مخلوقات کی پرستش سے ہٹ کر صرف خالقِ کائنات ہی کا پرستار بن جاتا ہے اور یہی قرآنی تعلیم کا نتیجہ ہے۔

چوتھا اُصول۔ انسان کا مقصدِ حیات

انسانی زندگی کے بنیادی اصول میں سے چوتھا اصول یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کے مقصد متعین کرنے کا عقدہ حل کر دے۔ سارے علوم سے اہم ترین علم یہ ہے کہ انسان کو اپنی حیات کا مقصد معلوم ہو، اور مقصد بھی اعلیٰ ہونا چاہیئے۔ جیسا کہ انسان تمام مخلوقات میں سے اعلیٰ، برتر اور اشرف ہے اس لیے اُس کا مقصدِ حیات بھی ایسا ہو کہ انسان کے ساتھ اس کی کوئی مخلوق مقصدِ حیات میں ہمسر نہ ہو سکے۔ گائے، بھینس، بکری کیوں اعلیٰ اور قیمتی ہیں کیونکہ ان تینوں کا جو مقصد ہے دودھ اس میں بکری سے گائے بھینس بڑھ کر ہے۔ گدھے سے گھوڑا قیمتی ہے کیونکہ گدھا، گھوڑے کے مقاصد کو پورا نہیں کر سکتا۔ اس معیار کے تحت جب انسان غور کرتا ہے تو سب سے پہلے جو حقیقت سامنے

آتی ہے وہ یہ ہے کہ تمام وہ مخلوقات جو انسان کے ماسوا ہے یعنی غیر انسان، وہ انسان کے لیے ہے۔ یعنی ان سب کے وجود کا مقصد انسان کی خدمت اور فائدہ رسانی ہے اور بس۔ اب رہ گیا انسان کے مقصدِ حیات کا سوال جو غور طلب ہے اور اس کا حل کرنا انسان کا سب سے اولین فریضہ ہے۔ یہ تو ناممکن ہے کہ کائنات میں معمولی چیزیں بھی مقصدیت سے خالی نہیں اور انسان جیسی عظیم ہستی کی تخلیق بلا مقصد ہو ایسی صورت میں خالقِ کائنات کی حکمت پر حرف آئے گا۔ لہٰذا تخلیقِ انسان ایک مقصد کے تحت ہے اور وہ مقصد ایک عظیم مقصد ہے، جیسے کہ خود انسان ایک عظیم ہستی ہے۔ وہ مقصد مادہ پرستوں کے نزدیک لذت ہے خواہ وہ لذتِ خوراک ہو یا لذتِ جاہ وعزت یا لذتِ حکومت۔ پہلی چیز مقصدِ حیات بننے کے قابل نہیں بلکہ ان میں سے کوئی چیز بھی اس قابل نہیں کہ اس کو انسان کا مقصدِ حیات قرار دیا جاسکے۔ لذتِ خوراک میں بہت سے حیوانات انسان سے بڑھ کر ہیں۔ مثلاً ہاتھی بھینس کہ انسان ان میں سے کسی کے ساتھ مقابلہ نہیں کرسکتا نہ کماً اور نہ کیفاً۔ یعنی نہ مقدار خوراک میں اور نہ لذت میں مقدار میں ہاتھی وغیرہ کی خوراک انسان سے زیادہ ہے اور جب مقدار زیادہ ہے تو لذت بھی زیادہ ہوگی۔ مثلاً اگر ایک آدمی صرف دو آم کھائے اور دوسرا آدمی بیس آم کھائے تو دوسرے آدمی کی لذت پہلے کی نسبت زیادہ ہوگی کیونکہ اس نے زیادہ مقدار آم کی کھائی ہے۔ باقی رہا یہ معاملہ کہ ہاتھی اور انسان کی نوعیتِ طعام میں فرق ہے۔ ہاتھی گھاس کھاتا ہے اور انسان پلاؤ۔ تو یہ بھی غلط ہے کہ جو ہمارے لیے پلاؤ میں لذت ہے یا کباب میں ہاتھی کو اسی طرح کی لذت گھاس میں حاصل ہوتی ہے۔ خوراک اور اس کی لذت اضافی چیزیں ہیں۔ ہر ایک کا پلاؤ الگ ہے۔ باقی رہی دوسری چیز جاہ وعزت۔ وہ بقول امام غزالیؒ وہمی چیز ہے۔ عزت مال کے لیے مطلوب ہے اور مال خوراک کے لیے۔ تو جاہ و عزت کا مقصد بھی خوراک ہے، وہ کوئی مستقل چیز نہیں۔ علیٰ ہذا القیاس حکومت بھی بذاتِ خود مقصود نہیں، مال وجاہ کے لیے مقصود ہے اور مال وجاہ خوراک کی وجہ سے

مقصود ہے اور خوراک کی مقصدیت کی تردید ہو چکی ہے۔ مزید برآں انسانی حکومت پُر از خطرات ہے۔ زوال پذیر ہے لیکن بعض حیوانات کو مثلاً شیر و دیگر حیوانات کو قدرتی حکومت دیگر جانوروں پر بغیر سعی و کوشش کے حاصل ہے جس میں ان کو نہ ووٹ طلب کرنے کی ضرورت ہے اور نہ عدم اعتماد کے ووٹوں کا خطرہ۔ تو اس وصف میں بھی شیر انسان سے فائق ہے۔ لذتِ انسانی، مقصد حیات اس لیے بھی نہیں ہو سکتی کہ

انسان کی مادی لذت ہموم و غموم اور مصائب و آلام سے پُر ہے۔ لیکن حیوانی لذت اِن سب سے خالی ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو فطرۃً فکرِ ماضی اور اندیشۂ مستقبل عطا ہوا ہے۔ اگر اس کے اقارب میں سے کوئی پہلے مر گیا ہو، اور کافی وقت گذرا تو شعورِ ماضی کے تحت اس کو یاد کر کے مغموم ہوتا ہے اور آنے والا خطرہ اگرچہ فی الحال موجود نہ ہو تو بھی انسان اُس کے تصور میں پریشان رہتا ہے کیونکہ حیوان کی نسبت انسانی شعور میں پائیداری ہے یہی وجہ ہے کہ انسان کی ہر مادی لذت حزن و غم کے ساتھ مخلوط ہے، خالص نہیں۔ لیکن حیوان کی ہر مادی لذت فکرِ ماضی اور اندیشۂ مستقبل سے پاک ہونے کی وجہ سے خالص ہے۔ اس لیے ایک مادی نظریہ کا انسان چاہے کسی بڑے ملک کا پریذیڈنٹ ہو، اپنے مزعوم مقصدِ حیات میں حیوانات سے بہت کم ہے۔ اس لیے مقصدِ حیات کے متعلق مادی نظریہ قابلِ ترجیح نہیں بلکہ انسان کا صحیح مقصد حیات متعین کرنا خود انسان کا حق نہیں، خالقِ انسان کا حق ہے۔ ہوائی جہاز کا مقصد اُس کا بنانے والا متعین کر سکتا ہے، نہ خود ہوائی جہاز۔ اسی مقصد کو قرآن حکیم نے صاف اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝ مَا أُرِيدُ مِنْهُم مِّن رِّزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَن يُطْعِمُونِ ۝

جن و انس کی تخلیق کا مقصد عبادت الٰہی ہے ہم نہ اُن سے روزی کمانا چاہتے ہیں، نہ کھلانا (الذاریات آیۃ ۵۶،۵۷)

جیسے انسان اپنے غلاموں سے یہ دو مقصد پورے کرتا ہے۔ کیونکہ ہمیں نہ روزی کی

ضرورت ہے دکھانے کی۔ہم دونوں سے بے نیاز ہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الرَّزَّاقُ ذُوالْقُوَّۃِ الْمَتِیْنُ ط بلکہ خدا نے پہلے سے انسانی مشین کو قائم رکھنے کے لیے روزی کا انتظام فرمایا، کہ وہ بڑا قوی اور زوروالا ہے۔

اگر کسی مشین کو درست رکھنے کے لیے رنگ وروغن کی ضرورت ہے تاکہ وہ خراب نہ ہو اور درست حالت میں رہے تو وہ رنگ وروغن اس مشین کے وجود کا مقصد نہیں بلکہ مشین کے وجود کا مقصد وہ کام ہے جس کے لیے مشین ساز نے اس کو بنایا یہی حال انسان اور اس کے رزق کا ہے۔ انسان کے لیے روزی بقاء کا سامان ہے، مقصدِ تخلیق نہیں مقصدِ تخلیق وہ ہے جس کے لیے خالقِ کائنات نے انسانی مشین کو پیدا کیا ہے یعنی عبادت الٰہی روزی تیل وروغن کی طرح اس مشین کو درست رکھنے کا سامان ہے، مقصد نہیں، جس طرح دنیا کی ہر مشین کی قیمت اس کے مقصد سے متعین ہوتی ہے۔ مثلاً شوگرمل کی مشین وہی قیمتی سمجھی جاتی ہے جو کم وقت میں زیادہ چینی پیدا کرے۔ اسی طرح انسانی مشین کی قیمت بھی اپنے تخلیقی مقصد سے متعین کی جاتی ہے یعنی اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ جو عبادت الٰہی اور تقویٰ ہیں۔ جو انسانی مشین کا مقصد ہے۔ زیادہ کامیاب ہو وہی انسان سب سے زیادہ قیمتی اور صاحبِ شرافت وکرامت ہے اور خالق کی نظر میں زیادہ مقبول ہے۔

پانچواں اصول۔ انسانی زندگی کی آخری منزل

انسانی زندگی کی آخری منزل حیثیت الٰہی انسانی زندگی متحرک ہے یا ساکن؟ قرآن حکیم نے اس بات کا اعلان کیا کہ انسانی حیات متحرک ہے ساکن نہیں۔

یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ ط (الانشقاق آیۃ ۶) اے انسان! تو تکلیف اٹھا اٹھا کر خالقِ کائنات کی طرف جارہا ہے پس تو اس سے جاملے گا۔

۱۔ اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ انسانی زندگی متحرک ہے

۲۔ اور اس زندگی کو اپنی حرکت میں تکالیف کا سامنا ہے۔
۳۔ اور یہ کہ اس حرکت کی آخری منزل، منبع اور سرچشمۂ زندگی یعنی خالقِ کائنات کی معیت ہے۔

پہلی چیز کہ انسانی زندگی متحرک ہے، وہ بالکل واضح ہے۔ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو ایک بچہ ہے پھر جوانی اور بلوغ تک برابر بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ اس کی زندگی کی ارتقائی حرکت ہے۔ پھر موت تک اس کی انحطاطی حرکت کا سلسلہ جاری رہتا ہے تا آنکہ موت کے بعد اس کی برزخی حرکت شروع ہو جاتی ہے۔ اس پورے عرصہ میں انسانی زندگی کو کئی قسم کے الام و مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ حرکت اس طرح لازمی اور ضروری ہوتی ہے کہ کوئی انسانی طاقت اس کو روک نہیں سکتی اور ہر حالت میں یہ حرکت جاری رہتی ہے۔ ارتقائی حرکت میں ارتقاء کو کوئی قوت روک نہیں سکتی اور بلوغ کے بعد انحطاطی حرکت کے لیے بھی کوئی روک نہیں علیٰ ہذا القیاس۔

اس جلی حرکت کے بعد قبر و برزخ کی خفی اور مستور حرکت کو بھی کوئی نہیں روک سکتا۔ ہر حرکت کے لیے ایک منزل ہوتی ہے، جس پر جا کر حرکت ختم ہوتی اور متحرک چیز وہیں پہنچ کر ساکن ہو جاتی ہے۔ وہی منزل انسانی زندگی کی منتہائے حرکت ہے۔ وہ منزل کیا ہے۔ انسانی زندگی کے نتائج اور ثمرات کو پانا۔ دنیا میں ہر حرکت ایک عمل کا نام ہے جس وقت عمل کا نتیجہ حاصل ہو جاتا ہے تو عمل کی حرکت ختم ہو جاتی ہے۔ ایک مزارع زمین تیار کرتا ہے، بیج ڈالتا ہے، اس کی آبپاشی کرتا ہے، کھاد دیتا ہے، حفاظت و نگرانی کرتا ہے۔ پک جانے پر اس کو کاٹتا ہے، مشین یا بیلوں سے اُس کو روندتا ہے، بھوسہ اور غلہ الگ کرتا ہے۔ جب غلے کا خرمن اُٹھا لیتا ہے تو اس کی حرکت ختم ہو جاتی ہے کیونکہ وہ نتیجۂ عمل اور منزلِ حرکت کو پا لیتا ہے اور منزل کے بعد حرکت کا ختم ہو جانا ضروری ہے ورنہ پھر وہ منزل کیسی ہوئی۔ یہی حال انسان کا ہے۔ وہ اپنی متحرک زندگی میں تکلیف اٹھا اٹھا کر گزارتا ہے۔ کوئی اطاعتِ خیر اور نیکی کے لیے تکلیف اٹھاتا ہے اور کوئی معصیتِ

شر اور بدی میں جان کھپا تا ہے اور یہ تسلسل موت تک جاری رہتا ہے اور جب آگے چل کر جہانِ آخرت میں ہر دو طبقوں کو نتائج اعمال اور ثمراتِ حرکت حاصل ہو جاتے ہیں، ابرار و اخیار کے لیے جنت کی شکل میں اور اشرار و فجار کے لیے دوزخ کی شکل میں تو زندگی اپنا مقام و منزل پا کر ساکن ہو جاتی ہے، اور یہی منتہائے حرکتِ حیات ہے۔ مذکورہ آیت میں آگے ارشاد ہے جس میں نتائج اعمال کا بیان ہے۔

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ ۙ فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا ۙ وَّ یَنْقَلِبُ اِلٰۤى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ؕ وَ اَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۙ فَسَوْفَ یَدْعُوْا ثُبُوْرًا ۙ وَّ یَصْلٰى سَعِیْرًا ؕ اِنَّهٗ كَانَ فِیْۤ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ؕ

جس کو نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں ملا، سو اس سے حساب لیں گے آسان۔ اور پھر آئے گا اپنے لوگوں کے پاس خوش ہو کر اور جس کو نامۂ اعمال ملا پیٹھ کے پیچھے، وہ پڑے گا آگ میں، وہ رہا تھا گھر میں بے غم۔ (الانشقاق آیۃ ۸ تا ۱۳)

انسان کی ان حالتوں کو قرآن نے اس آیت میں بیان کیا ہے۔

وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَ یَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَ مُسْتَوْدَعَهَا ؕ (ہود آیۃ: ۶)

کوئی نہیں چلنے والا زمین پر مگر اللہ پر اس کی روزی اور جانتا ہے جہاں وہ ٹھہرتا ہے اور جہاں وہ سونپا جاتا ہے۔

اس آیت میں انسان کی تینوں حالتوں کا بیان ہے۔ دنیوی زندگی جہاں وہ زمین پر چلتا ہے اور حرکت کرتا ہے۔ آخرت کی منزل جہاں وہ ٹھہرتا ہے یعنی جنت یا دوزخ یہ مستقر ہے۔ قبر اور برزخ کی حالت جہاں اس کو سونپا جاتا ہے یہ مُستودع ہے۔ آپ نے دیکھا کہ انسانی زندگی کے پانچ بنیادی اصولوں کو قرآن حکیم نے کس خوبی سے حل کیا ہے اور نظامِ حیاتِ انسانی کو کیسی عمدگی کے ساتھ پیش کیا کہ زندگی کے ان مسائل کو بڑے سے بڑا فیلسوف اور انسانی حکیم کے دماغ نے آج تک حل نہیں کیا۔ جو دلیل ہے

کہ قرآن کلام الٰہی ہے

۷۔ دلیلِ شمولی

دلیلِ شمولی سے مراد چند ایسی چیزیں ہیں جو قرآن میں موجود ہیں اور انسانی کلام میں وہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کلام انسانی نہیں، کلامِ الٰہی ہے۔ وہ چیزیں حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ جدتِ اسلوب۔ یعنی قرآن حکیم کا طرزِ بیان تمام انسانی کلاموں سے مختلف ہے اور پورے ماحول میں اسکی نظیر نہیں اگر یہ انسان کا کلام ہوتا تو انسان جو کچھ لیتا ہے اپنے ماحول سے لیتا ہے تو قرآن کا طرزِ بیان بھی عرب کے ماحول سے ماخوذ ہوتا، لیکن ایسا نہیں عرب میں اس وقت سے لیکر اب تک بلکہ تمام زبانوں میں کلام کے تین طرز پائے جاتے ہیں۔

ا۔ کلام منظوم یعنی شاعری ب۔ کلام منثور مسجع۔ ج۔ کلام منثور غیر مسجع۔

قرآن حکیم کا طرز تینوں طرزوں میں داخل نہیں اور دوست دشمن کو اس بات کا اقرار ہے۔ قرآن سبعہ معلقات یا دیوان حماسہ کیطرح شعر بھی نہیں کیونکہ ردیف، قافیہ و بحر وغیرہ کی اس میں پابندی نہیں اور مقاماتِ حریری کی طرح منثور مسجع بھی نہیں کیونکہ سجع کی پابندی اس میں موجود نہیں اور عام مصنفین کے کلام کی طرح منثور غیر مسجع بھی نہیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ زمین پر اس کلام کے طرز کا کوئی کلام موجود نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ اس کا سرچشمہ انسانی اور زمینی نہیں بلکہ الٰہی اور آسمانی ہے۔

۲۔ انسانی کلام میں متکلم کے جذبات کو دخل ہوتا ہے۔ اسلئے انسان جب جذبہ قہر کے تحت کلام کرتا ہے تو اس میں رحم کا پہلو نہیں ہوتا اور جب جذبہ رحم کے تحت کلام کرتا ہے تو قہر کا پہلو نہیں ہوتا، کیونکہ انسانی جذبات میں اعتدال نہیں ہوتا بخلاف قرآن حکیم کے اس میں مضامین ابشار و انذار، جنت و دوزخ اور قہر و رحم ایک ساتھ مذکور ہوئے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا متکلم انسان کی طرح جذبات سے مغلوب ہستی نہیں۔

نَبِّئْ عِبَادِیْٓ اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ۝	میرے بندوں کو اطلاع دے دے کہ بے شک
وَاَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ	میں بخشنے والا مہربان ہوں اور بے شک
الْاَلِیْمُ ۝	میرا عذاب وہی دردناک عذاب ہے۔

(الحجر آیۃ ۴۹-۵۰)

میں اعلانِ مغفرت و رحمت کے ساتھ ساتھ دردناک عذاب کا بھی ذکر کیا گیا لیکن انسان غصہ کیوقت شفقت

اور شفقت کے وقت قہر و غصہ کی بات زبان پر نہیں لاتا۔

۳۔ ہر انسان کے کلام کا اگر مطالعہ کیا جائے تو اس میں ضرور ایسے الفاظ ملیں گے جو کسی بیرونی دباؤ کے اثر کا نتیجہ ہوں گے اور ان سے یہ ظاہر ہوتا ہو گا کہ اس کلام کا متکلم خوف کے تحت ان الفاظ کو ادا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ انسانی کلام میں معمولی قوۃ کا اظہار تو ہوتا ہے لیکن ایسی قوۃ کا اظہار اس میں نہیں ہو سکتا کہ جس سے آسمان و زمین پر حکومت کا ظہور ہوتا ہو۔ لیکن اگر کسی نے قرآن کا معمولی مطالعہ کیا ہو تو وہ قرآن کے ہر صفحہ میں یہ محسوس کرے گا کہ یہ ایسے متکلم کا کلام ہے جو کائنات عالم کی کسی چیز سے نہ دبتا ہے، نہ ڈرتا ہے بلکہ عظیم ترین کائنات پر حکمرانی کرتا ہے اور حکم چلاتا ہے۔ طوفانِ نوح ؑ کی بندش کے سلسلے میں قرآنی الفاظ کو دیکھو کہ ان میں کس قدر زور ہے۔

يَٰأَرْضُ ابْلَعِي مَآءَكِ وَيَٰسَمَآءُ أَقْلِعِي ط (ہود آیۃ ۴۴)

اے زمین! نگل جا پانی کو اور اے آسمان! تھم جا برسنے سے۔

کیا انسانی قوت یہ آرڈر دے سکتی ہے؟

۴۔ انسانی کلام اس کی دماغی قوت کی محدودیت کا مظہر ہوتا ہے۔ اُس کا اشہب بلاغت ہر میدان میں یکساں طور پر نہیں دوڑ سکتا، اس لیے اس کی قابلیت مضامین کی ایک خاص قسم میں زور بلاغت دکھا سکتی ہے، لیکن دوسری قسم کے مضامین کے بیان میں اس کی بلاغت کا وہ زور نہیں ہوتا۔ عربی شعراء میں ابو نواس، خمریات یعنی شراب کی تعریف میں بہترین شعر کہہ سکتا ہے جو دوسرے مضامین میں نہیں کہہ سکتا۔ ابو العتاہیہ، زہد، فنا، دنیا اور شوقِ آخرت کے مضامین کو پُر زور بلاغت کے ساتھ لکھ سکتا ہے، دوسرے مضامین کو اس انداز میں نہیں لکھ سکتا۔ فارسی شعراء فردوسی نظامی جنگی مضامین پوری بلاغت کے ساتھ لکھ سکتا ہے لیکن میدانِ رزم کے سوا دوسرے میدان میں اُن کا وہ زور نہیں جو رزم میں ہوتا ہے۔ سعدی اخلاق کا شاعر ہے رزم کا نہیں۔ اگر خوش قسمتی سے کسی شاعر کو یہ مقام حاصل ہو کہ وہ ہر نوع کے مضامین بلیغ انداز میں لکھ سکتا ہو، تو پھر بھی یہ فرق باقی رہتا ہے کہ اپنے مخصوص دائرہ کے علاوہ دوسرے دائرہ مضامین میں اسکی بلاغت یکساں نہیں رہتی اس کے علاوہ شعراء اور

بلغاء کا تمام انواع مضامین اور جملہ دوائرِ فکر مادیات کے احاطہ سے باہر نہیں۔ ان سب میں غیبیات اور ماوراء المادیات مضامین بہت کم ہوتے ہیں۔ محسوسات میں شاعرانہ تخیلات کام دے سکتے ہیں لیکن غیبیات میں تخیل کی پرواز ختم ہو جاتی ہے۔ ان سب امور کے علاوہ شعراء صدق اور واقعیت کے پابند نہیں تاکہ تخیل پر پابندی ہو بلکہ تخیل جو نقشہ تیار کرے اور جن الفاظ کا انتخاب کر دے۔ اسی کو شعر کے قالب میں رنگینی کے ساتھ ڈھال دیتا ہے۔ اس لیے شعر کے متعلق بلغاء کا مقولہ ہے احسنہ اکذبہ بہترین شاعر وہ ہے جس کا مضمون سب سے زیادہ جھوٹا اور مبالغہ آمیز ہو لیکن قرآن حکیم کے مضامین کا ایک طرف تو دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس میں عبادات، معاملات، قوانین منزلیہ، احکام معاشرت، قوانینِ مملکت، بین الاقوامی قوانین، پھر عقائد، اخلاق، تاریخ محسوسات، غیبیات، واقعاتِ دُنیا، حقائقِ آخرت سب طرح کے مضامین ہیں اور دوسری طرف اس وسیع دائرہ مضامین کے لیے بیان کا دائرہ اس قدر تنگ ہے کہ کوئی مضمون اور عبارت واقعیت اور صداقت سے ذرا برابر تجاوز نہ کرنے پائے۔ اس کے باوجود قرآن کے مختلف الانواع مضامین کا زورِ بلاغت، صدق اور واقعیت کی شدید پابندی کے ساتھ یکساں ہے ان تمام میدانوں میں نہ قرآن کے زورِ بلاغت میں فرق آیا اور نہ کہیں صداقت کا رشتہ چھوٹا۔ اسی طرف قرآن نے ان الفاظ میں توجہ دلائی۔

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ؕ (النساء۔ آیۃ ۸۲)	اگر قرآن خدا کے سوا کسی اور کا کلام ہوتا، تو اس کی شانِ بلاغت اور مضامین کی صداقت میں ضرور فرق آجاتا۔

لیکن ایسا نہیں ہوا جو اس امر کی دلیل ہے کہ اس کلام کا سرچشمہ لامحدود قوت ہے جو صرف خالقِ کائنات کی ہو سکتی ہے۔ اور یہ قرآن حکیم کی صداقت اور من جانب اللہ ہونے کی دلیل ہے۔

۸۔ دلیل غیبی

قرآن حکیم میں ایک بہت بڑا ذخیرہ غیبی علوم کا موجود ہے جس تک کسی بڑے فیلسوف اور اور عالم کی رسائی نہیں ہو سکتی، چہ جائے کہ ایک ناخواندہ قوم کی ناخواندہ ذات اس تک رسائی پا سکے۔ ایسے غیبی علوم کی کئی قسمیں ہیں۔

۱۔ گذشتہ اقوام اور انبیاء کی تاریخ اور اس کے نتائج اور ثمرات

۲۔ آنے والے واقعات یعنی امور مستقبلہ کی حقیقت سے قبل از وقت اطلاع دینا اور حقیقت بھی ایسی کہ جو نظر بر اسباب قابل یقین نہ ہو۔

۳۔ مابعد الموت اور مابعد الطبیعات امور کے متعلق ایسے حقائق بیان کرنا، جو ایک عظیم تر فلسفی اور فلاسفہ کی مجموعی قوت سے بھی بالاتر ہو۔

۴۔ گذشتہ انبیاء علیہم السلام میں سے آدم علیہ السلام، حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل واسحاق، حضرت یعقوب اور حضرت یوسف، حضرت موسیٰ وہارون، حضرت داؤد وسلیمان وعیسیٰ ویحییٰ وذکریا علیہم وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام کے تاریخی واقعات اور ان سب حضرات کے مقاصد دعوت وتبلیغ اور ان سب حضرات کی مبعوث الیہم قوموں کے واقعات اور ان انبیاء علیہم السلام کی دعوت وارشادات کے ان اقوام پر مخالف وموافق اثرات اور ان کے عواقب ونتائج اور ان نتائج کے علل واسباب وعبر ونصائح، جس تحقیق اور حیرت انگیز صداقت اور بلاغت سے قرآن نے بیان کیے۔ اس کی مثال انسانی تحریر میں دستیاب نہیں ہو سکتی۔

ان واقعات کا ایک حصہ تورات میں موجود تھا، اور کچھ حصہ علماء تورات وتاریخ کے سینوں میں محفوظ تھا لیکن صاحب قرآن علیہ السلام کی پوری زندگی میں ایک واقعہ بھی ایسا موجود نہیں کہ آپ کو کسی انسانی اُستاد سے استفادے کا موقعہ ملا ہو، یا استفادہ کیا ہو یا کم از کم

کسی اُستاد نے کہا ہو کہ مجھ سے حضور علیہ السلام نے استفادہ کیا ہے ایسے علوم کی باقاعدہ تحصیل کے لیے بالخصوص اُمّی اور ناخواندہ شخص کے لیے ایک کافی عرصہ اور ایک مسلسل تعلیم و تعلم کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے کسی سے چند گھنٹوں یا منٹوں کی ملاقات کافی نہیں ہو سکتی۔ لیکن زمانۂ نبوت میں دشمنانِ قرآن و نبوت نے نہ تو کسی وقت آپ کے اُمّی ہونے سے انکار کیا اور نہ انبیاء اور اقوامِ گذشتہ کے واقعات میں کوئی شبہ پیش کیا۔ جو اس امر کی واضح دلیل ہے کہ دوست دشمن سب اس حقیقت اور صداقت کو تسلیم کرتے تھے کہ آپ اُمّی ہیں اور کسی سے آپ نے تعلیم نہیں پائی اور یہ کہ انبیاء و اُمم کے تاریخی واقعات جو قرآن نے بیان کئے وہ سب درست ہیں ورنہ ضرور وہ اعتراض کرتے۔ اس بناء پر مستشرقین دورِ حاضر کے اعتراضات، ہر دو امور کے متعلق جو غرض استعمار کے استحکام اور سیاسی مصالح کے تحت پھیلائے جا رہے ہیں قطعاً بے اصل اور نامعقول ہیں۔ استشراق کا فتنہ علمی ادارہ نہیں، بلکہ علمی تحقیق کے نام وہ مسلمانوں کے مرکزی سرچشمۂ قوت یعنی قرآن اور نبوۃ پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں تاکہ مسلمانوں کے قلب و دماغ پر تعلیماتِ قرآن و نبوت کی گرفت کمزور ہو جائے اور اُن کی فطری وحدت کا خاتمہ ہو کر ان میں تفریق پیدا کرنے کے لیے نئی راہیں کھول جائیں۔

یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ	چاہتے ہیں کہ بجھاویں اللہ کی روشنی اپنے
بِاَفْوَاهِهِمْ ط وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ	منہ سے اور اللہ کو پوری کرنی ہے اپنی روشنی
وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ط (الصف آیۃ ۸)	پڑیں برا مانیں شرک کرنے والے۔

عام انگریزی دان طبقہ میں دین کے صحیح علم کا بھی فقدان ہے اور دینی زبان عربی کی بھی مہارت نہیں۔ اس کے علاوہ ان کو یورپ کے ہر مصنف سے عقیدت ہے جو مغربی تہذیب کا اثر اور علماء دین سے نفرت۔ یہی چار چیزیں مستشرقین کے فتنے کو فروغ دینے میں ان کے لیے نہایت کارآمد ثابت ہو رہی ہیں۔ ہم نے گولڈزیہر کی کتاب "مذاہب تفسیریہ" کا اور ولیم میور کی "لائف آف محمد" کا بخوبی آزادانہ فکر سے مطالعہ کیا ہے لیکن ہم پر اس کا وہ اثر ہوا جو ہم نے اب ذکر

کیا۔ اس نے ہماری پختگی یقین میں اور اضافہ کیا۔ ہم امور مستقبلہ میں قرآن کا برخلاف اسباب چند غیبی اعلانات قبل از وقوع بیان کرتے ہیں۔

۱۔ قرآن نے بین الاقوامی پیشگوئی قبل از وقت کا اعلان ان الفاظ میں کیا ہے۔ جو سورۂ روم میں ذکر ہے۔

غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ فِیْۤ اَدْنَی الْاَرْضِ وَهُمْ — روم مغلوب ہو گئے۔ نزدیک کے ملک میں اور

مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ۙ — وہ مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب آجائیں گے۔ (الروم آیۃ ۲-۳)

ایران کے مقابلہ میں اگر رومی مغلوب ہوئے اور مغلوب بھی ایسے ہوئے کہ کسریٰ کی فوجوں نے نے پوری رومی مملکت اور اس کے مرکز کو تباہ کر دیا اور رومی سلطنت کو ایک باجگزار ریاست بنا کر چھوڑا۔ تاریخ گواہ ہے کہ کسریٰ کی عظیم قوت کو شکست دینے اور دوبارہ اپنا کھویا ہوا عروج حاصل کرنے کی قوت رومیوں میں فنا ہو چکی تھی۔ اور اس اعلان کے لیے بِضْعِ سِنِیْنَ کہہ کر دس سال سے کم وقت بھی متعین کیا گیا۔ قرآن کے اعلان کے مطابق ویسا ہی ہوا کہ رومی غالب آگئے اور اعلان غیبی کی صداقت کو دوست دشمن سب نے تسلیم کیا۔ حالانکہ یہ اعلان وقت کے اسباب کے مقتضیٰ کے خلاف تھا۔

۲۔ قرآنِ حکیم نے عین ایسے وقت میں کہ مسلمان کمزور تھے اور قریش اور ان کے ہم مذہب عرب بہت قوی تھے بالخصوص ۶ھ میں حدیبیہ کے موقع پر کہ صحابہ کرام مدینہ سے لمبی مسافت طے کر کے مکہ کے قریب بارادہ عمرہ پہنچے۔ لیکن قریش نے قوت کے گھمنڈ میں اُن کو داخلہ مکہ سے اور عمرہ کرنے سے روکا حالانکہ ایسا کرنا عرب کے مسلّم قانون کے بھی خلاف تھا۔ یہاں تک کہ صلح حدیبیہ کی کمزور دفعات کو بھی مسلمانوں نے تسلیم کیا، جس میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ اس وقت مسلمان واپس جا کر آئندہ سال آ کر عمرہ کریں۔ اسی حالت میں سورۂ فتح نازل ہوئی۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِیْنًا ۙ (الفتح آیۃ ۱) — بے شک ہم نے آپ کو کھلم کھلا فتح دی۔

جس میں درحقیقت دو عظیم فتحوں کی پیشگوئی کی گئی۔ ایک یہود خیبر کی عظیم طاقت کو شکست دے کر خیبر کے سرسبز علاقے کو فتح کرنا۔ دوم قریش اور عرب کی مجموعی طاقت کو شکست دے کر مکہ معظمہ اور مرکزِ عرب کو فتح کرنا۔ دو سال کے اندر مسلمانوں نے قرآنی پیشگوئی کے مطابق دونوں فتحیں حاصل کیں، خیبر بھی اور مکہ معظمہ بھی۔ جس سے معلوم ہوا کہ قرآن عالم الغیب کی کتاب ہے

۳۔ قرآن حکیم نے خلفاء راشدین کی خلافت کی پیشگوئی ایسے وقت میں فرمائی کہ خود صحابہ کرام کو اپنی زندگی کا خطرہ تھا اور کوئی مسلمان اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن خلافِ اسباب اور برخلاف حالات پیشگوئی درست ثابت ہوئی اور قرآن حکیم کی پیشگوئی کے مطابق خلفاء راشدین کو زمین کی حکومت بھی حاصل ہوئی، اُن کا دین یعنی اسلام بھی سیاسی قوت حاصل کر کے مضبوط ہوا اور اسلام اطرافِ عالم میں خلفاء راشدین کے ذریعے پھیلا اور مسلمانوں کو کسی حکومت کا خوف نہ باقی رہا۔ ان تینوں باتوں کا اعلان مسلمانوں کی کمزوری کے وقت میں قرآن نے ان الفاظ میں کیا۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ط (نور آیۃ ۵۵)	اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہے۔ جو تم میں سے ایمان لائے اور نیک عمل کیے کہ انہیں ضرور ملک کی حکومت عطا کرے گا۔ جیسا کہ ان سے پہلوں کو عطا کی تھی۔ اور ان کیلئے جس دین کو پسند کیا ہے، اسے ضرور مستحکم کر دے گا اور البتہ ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا۔

اس قسم کے واقعات غیبیہ جن کا اعلان قرآن حکیم نے قبل از وقت نامساعد حالات میں کیا ہے، بہت زیادہ ہیں، لیکن اختصار کی غرض سے ہم ان کو ترک کرتے ہیں۔

۹۔ دلیلِ انجذابی

قرآن میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ اس میں خاص شانِ جاذبیت ہے۔ جو کسی انسانی

کلام میں نہیں۔

۱۔ جاذبیت کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ غیر عرب مسلمان باوجود اس کے کہ قرآن اُن کی زبان میں نہیں، بلکہ اجنبی زبان میں ہے، اس کو بڑی محنت کر کے حفظ کرتے ہیں اور موت تک دہراتے رہتے ہیں کہ فراموش نہ ہو جائے حالانکہ ان کو کوئی مادی فائدہ حفظِ قرآن سے حاصل نہیں ہوتا۔ صرف قرآن کی شانِ جاذبیت ہے جو اُن کو حفظ پر آمادہ کر رہی ہے۔

۲۔ دوسری یہ کہ جو کوئی اس کو ناظرہ پڑھتا ہے اور تلاوت کرتا ہے تو ساری عمر تلاوت کرنے کی طبیعت، معنے نہ جاننے کے باوجود اکتاتی نہیں اور نہ اس کے ذوق و شوق میں فرق پڑتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں روحِ انسانی کے لیے ایک خاص جاذبیت پائی جاتی ہے۔

۳۔ سوم یہ کہ کوئی کلام جو اجنبی زبان میں ہو اور سُننے والا اس کا مطلب نہ سمجھتا ہو، وہ اس سے متاثر نہیں ہوتا۔ لیکن قرآنِ پاک کی یہ شان کہ جب اس کو پڑھا جاتا ہے تو خواہ سُننے والا اس کو سمجھے یا نہ سمجھے، دونوں حالتوں میں اس پر اثر پڑتا ہے اور اس کا بارہا تجربہ کیا گیا ہے۔ تو کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ قرآن کی یہ کشش، جو عالمی تاریخ کی کسی دوسری کتاب کو نصیب نہیں۔ یہ اس کے کلام الٰہی ہونے کی دلیل ہے۔

۱۰۔ دلیلِ تالیفی

قرآنِ حکیم کی تالیف میں اعجازی شان موجود ہے۔ انسانی تالیفات کا ایک خاص طرز ہے کہ وہ پہلے چند مرتب مضامین کا ایک مجموعہ مفصل کے عنوان کے تحت لاتا ہے، پھر چند فصول کے مختلف مضامین کو ایک عام مشترک عنوان کے تحت باب میں ذکر کرتا ہے۔ پھر مختلف ابواب کے مضامین کو عام تر عنوان کے پیشِ نظر کتاب کے عنوان میں درج کرتا ہے۔ یہی انسانی تصنیفات کا عام رنگ ہے لیکن قرآن کا رنگِ تالیف بالکل جدید اور انسانی تالیفات کے

خلاف ہے اور مخالف ہونے کے باوجود اس قدر معقول ہے کہ بقول امام رازیؒ ربطِ آیات قرآن بھی ایک مستقل معجزہ ہے۔ قرآن میں مختلف اقسام کے مضامین ایک جگہ ذکر کیے جاتے ہیں، جن میں احکام بھی ہوتے ہیں اور واقعات انبیاءؑ سابقین بھی اور امورِ آخرت بھی اور صفاتِ باری تعالےٰ بھی جس کو سطحی نظر رکھنے والا شخص دیکھ کر بے جوڑ اور غیر مربوط سمجھتا ہے۔ لیکن وہ قرآن کے اساسی اور بنیادی مقصد سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ایسا سمجھتا ہے۔ قرآن اپنے مضامین کو دو مقاصد کے پیشِ نظر بیان کرتا ہے۔ ایک تعلیم عام یعنی کہ جو مضمون قرآن پڑھنے والے کو معلوم نہ ہو، اس کے علم میں لایا جائے۔ یعنی ایک مقصدِ تعلیم ہے لیکن اس مقصد پر اکتفا نہیں کرتا کیونکہ کسی بہتر سے بہتر مضمون کا علم کوئی کمال نہیں جب تک اس پر عمل نہ ہو۔ اگر ایک مریض کو اپنے مرض کے علاج کے لیے بہتر دوا اور نسخہ بتایا جائے اور اس کے علم میں لایا جائے تو اس سے کوئی فائدہ نہیں تاوقتیکہ اس پر عمل نہ کیا جائے اس سے قرآن تعلیم کے بعد تعمیل اور تلوین کے مقصد کو پیشِ نظر رکھتا ہے کہ جو کچھ سمجھایا گیا اس پر عمل بھی کرایا جائے۔ تاکہ اس پر علم کا پورا رنگ چڑھ جائے۔ اس دوسرے مقصد کے پیشِ نظر احکام کے ساتھ قرآن دوسری قسم کے مضامین کو بھی تحریکِ عمل کے لیے لاتا ہے۔ عمل کے محرکات یا تاریخی مسلّم واقعات ہوتے ہیں خصوصاً انبیاء علیہم السلام اور ان کی اُمتوں کے واقعات۔ یا محرک نتائج آخرت ہوتے ہیں۔ انسان اچھے عمل کو اس وقت اختیار کرتا ہے کہ اس کا اچھا نتیجہ اس کے دماغ میں نقش ہو جائے اور بُرے عمل کے ترک پر اُس وقت آمادہ ہوتا ہے کہ اس کا بُرا نتیجہ اس کے سامنے ہو، اور جہانِ آخرت، جہانِ نتائج ہے اس لیے آخرت کا بیان اس مقصد کے لیے کیا جاتا ہے۔ یا صفاتِ باری تعالےٰ انسان جب اپنے آپ کو حاکمِ اعلیٰ کے صفات کا یہ تصوّر اس کے سامنے ہو کہ عالم الکل ہے، قادر مطلق ہے، عادل ہے، تو ان تصوّرات کے بعد اس کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ یہ حیرت انگیز نظامِ تالیف دلیل ہے کہ قرآن کلام الٰہی ہے۔

۱۱۔ دلیل اعتدالی

انسان چونکہ جذباتی ہے، اس لیے اس کا کلام جذبات کا مظہر ہوتا ہے۔ جب اس کی ذات جذبہ قہر سے متاثر ہوتی ہے تو رحم و شفقت سے اس وقت خالی ہوتی ہے اور عین قہر و غضب کے وقت۔ اس کے کلام میں رحم و عفو کا پہلو نہیں ہوتا، اور جب رحم و شفقت کے جذبہ سے متاثر ہوتی ہے تو قہر سے بیگانہ ہوتی ہے اور اس کے کلام شفقت میں قہر و غضب کا کوئی پہلو نہیں ہوتا۔ اسی طرح جب خوشی کا اظہار کرتا ہے تو سراپا خوشی بن جاتا ہے اور رنجش اور ناراضگی کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔ لیکن قرآن چونکہ ایسی ذات کا کلام ہے جو جذبات سے پاک ہے، اس لیے اس کے کلام میں شان تنزیہہ جذبات نمایاں ہے۔ وہ غضب کے ساتھ مہربانی اور ناخوشی کے ساتھ خوشی کا اظہار فرماتا ہے۔ لیکن ہر ایک کا محل الگ الگ ہوتا ہے۔ غضب کا محل اہل معصیت اور مہربانی کا محل اہل طاعت ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن میں انذار کے ساتھ ابشار اور دوزخ کے ساتھ جنت کا تذکرہ ایک جگہ موجود ہے اور بے شمار مواقع میں بلکہ بعض جگہ ایک آیت میں دونوں ہی یعنی مہر و قہر موجود ہیں مثلاً:

نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ	میرے بندوں کو آگاہ کر دو کہ میں معاف کرنے والا
وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ؕ	اور مہربان ہوں اور یہ کہ میری سزا بھی دردناک
(سورۃ الحجر آیۃ ۴۹، ۵۰)	سزا ہے۔

اس اجتماع میں ایک راز تو یہ ہے کہ قرآن کا سرچشمہ انسان نہیں، جس کا کلام جذبات کے رنگ میں ہوتا ہے، بلکہ ایسی ذات اس کلام کا سرچشمہ ہے جو جذبات سے پاک ہے اور خزانۂ حکمت ہے اس لیے یہ کلام حکمت کے سرچشمہ سے نکلا ہوا ہے۔ جس کی حقیقت یہ ہے کہ الوہیت اور خدائی کے لیے از روئے حکمت دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ خوف اور محبت۔ اگر خدا سے بندوں کو خوف نہ ہو تو بھی اطاعت و عبادت خداوندی کا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ کھلی

انسانی حکومت کے لیے بھی حاکم سے خوف ضروری ہے ورنہ اس کا حکم کون مانے گا اور نظام کس طرح چل سکے گا۔ دوم محبت، خوف کے ساتھ محبت بھی ضروری ہے تاکہ اطاعت و عبادت میں اخلاص ہو۔ کیونکہ محبوب کی تعمیلِ حکم پورے اخلاص کے ساتھ کی جاتی ہے اور عاشق و محب جان کی قربانی تک کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اللہ جل جلالہ میں بھی یہ دونوں چیزیں جمع ہیں اور اس کے کلام میں بھی ان دونوں چیزوں کا جمع ہونا ضروری ہے۔ باقی اشیاء میں دونوں کا اجتماع بہت نادر بلکہ نایاب ہے۔ انسان کو شیر یا ظالم انسان سے خوف ہے لیکن محبت نہیں۔ ماں سے اس کو محبت ہے لیکن خوف نہیں۔ یہ خالقِ کائنات کی خصوصیت ہے کہ وہ خوف اور محبت دونوں کا مرکز ہے یہ قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کی دلیل ہے۔ ترغیب کے سلسلہ میں دیکھو:۔

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ؕ (الزمر آیۃ ۵۳)	اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، بے شک اللہ سب گناہوں کو معاف کر سکتا ہے تحقیق وہ معاف کرنے والا اور مہربان ہے۔
فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (السجدۃ: ۱۷)	کوئی نفس نہیں جانتا، جو جو نعمتیں میں نے آنکھ ٹھنڈی کرنے والی اُن کے لیے اعمال کے بدلے میں چھپا رکھی ہیں۔

ترہیب میں ارشاد ہے:۔

وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ۙ مِّنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ۙ يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ؕ وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ	ناکام ہوا ہر وہ شخص جس کو زور پر گھمنڈ تھا اور اور اسلام سے ضد کرتا تھا اس کے پیچھے جہنم ہے جس کا پانی جو پیپ ہے پلایا جائے گا گھونٹ بھرے گا اور حلق سے نہیں اترے گا اور ہر طرف سے موت کی تکلیف اس کو گھیر لے گی لیکن مرے گا نہیں

(سورۃ ابراہیم آیۃ ۱۵، ۱۶) اس کے بعد سخت عذاب میں مبتلا ہو گا۔

۱۲۔ دلیل ملکی

ہر انسان کا کلام چاہے وہ کتنا بڑا ہو اور شہنشاہ ہو۔ لیکن اس کے کلام میں خوف کا اثر بھی موجود ہوتا ہے اور محدود قوت کی وجہ سے بڑی مخلوق کو مثلاً آسمان یا زمین کو نہ آرڈر دے سکتا ہے اور نہ اس پر حکم جاری کر سکتا ہے لیکن قرآن نے طوفانِ نوحؑ کے موقع پر زمین و آسمان کو یوں حکم دیا:۔

يَٰٓأَرْضُ ٱبْلَعِى مَآءَكِ وَيَٰسَمَآءُ أَقْلِعِى (سورۃ ہود آیۃ ۴۴)

اے زمین! نگل جاؤ اپنا پانی اور اے آسمان! تھم جا۔

اور اس حکم کو جاری بھی کر دیا۔ بڑے بڑے بادشاہ بھی اپنی تقریر سب عوام کو خوش کرنے کے لیے کلام کرتے ہیں کہ وہ بگڑ کر مخالف نہ ہو جائے۔ بقول ایک یورپی مصنف کے کہ قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مصنف کسی مخلوق سے نہیں ڈرتا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خالق کا کلام ہے۔

باب چہارم

نبوت

نبوت کا لغوی معنی اگر نبا بمعنی خبر سے ماخوذ ہو تو نبی بمعنی شرعی و عرفی اللہ تعالے کی طرف سے خبر دینا ہے اور اگر نبوت بمعنی رفعت سے منقول ہو تو نبی تمام لوگوں سے رفیع اور بلند ہوتا ہے اور اگر نبی بمعنی طریق سے منقول ہو تو پیغمبر اور نبی بھی اللہ تک رسائی کا راستہ اور وسیلہ ہے۔ پہلی صورت میں مہموز اللام اور اخیر کی دو صورتوں معتل اللام ہے۔ نبی کی شرعی اور اصطلاحی تعریف شارح مواقف نے اشاعرہ سے یہ نقل کی ہے

من قال لہ اللہ ارسلتک الی قوم او الی الناس جمیعا۔ — یعنی جس کو اللہ حکم دے کہ میں نے تمکو فلاں قوم کی طرف بھیجا ہے یا سب لوگوں کیطرف تو وہ نبی ہے

نبی کے پہلے دو لغوی معنی امام راغب نے بھی مفردات میں لکھے ہیں۔ نبی کی چند خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے نبی غیر نبی سے ممتاز ہوتا ہے۔

خصوصیاتِ نبوت

۱۔ انتخاب الٰہی یعنی عہدۂ نبوت کے لیے انسانوں میں سے کسی فرد کو منتخب کرنا اللہ کا کام ہے اور نبوت عہدۂ وہبی ہے کسبی نہیں اور چونکہ اللہ تعالے ظاہر و باطن، حال و مستقبل کا پورا علم رکھتا ہے لہٰذا جس کو وہ نبی کا منصب عطاء کرتا ہے اُس میں اُس منصب کی کامل قابلیت اور استعداد کا ہونا ضروری ہے۔

اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ — اللہ خوب جانتا ہے کہ عہدہ رسالت کس کو دینا چاہئے

۲۔ نبی کے علوم وہبی ہوتے ہیں کسبی نہیں۔ وہ زمین کے کسی اُستاد سے تعلیم حاصل کیا ہوا نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ آسمانی علوم کا آسمانی اُستاد سے استفادہ کرتا ہے۔ اور زمینی سلسلۂ تعلیم کے لحاظ سے وہ اُمّی کہلاتے ہیں۔ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم کی پہلی جلد میں تفاوت مراتب عقل کے

ت بیان کیا کہ لوگوں کے عقلی مراتب مختلف ہیں۔ بعض بلید ہوتے ہیں جو تعلیم سے بھی علم حاصل نہیں کر سکتے اور بعض ذکی اور تیز فہم ہوتے ہیں جو تعلیم سے علم حاصل کر سکتے ہیں اور بعض وہ حضرات کہ بغیر تعلیم انسانی کے اپنے نورِ قلب سے علوم حاصل کرتے ہیں یہ انبیاء علیہم السّلام ہیں

۳۔ حسنِ صورت و سیرت۔ یعنی ظاہری خوبصورتی اور باطنی خوبصورتی یعنی اخلاق میں اوروں سے ممتاز ہوتے ہیں۔ بخاری وغیرہ میں ہے۔

کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم احسن الناس خَلقاً و خُلقاً۔ | یعنی حضور علیہ السّلام حسن صورت اور اخلاق میں سب لوگوں سے برتر تھے۔

۴۔ علمی اور عملی کمال یعنی نبی کا علم اور عمل دونوں کامل ہوتے ہیں۔ کمالِ علم یہ ہے کہ نبی کے علم میں کوئی غلطی نہیں ہوتی اور عملی کمال یہ ہے کہ نبی کا عمل کامل ہوتا ہے اور گناہ یا طاعتِ الٰہی کے دائرہ سے تجاوز ان کے عمل میں نہیں پایا جاتا۔ وہ ہر گناہ سے پاک اور معصوم ہوتے ہیں۔ وہ چونکہ اُمت کے لیے نمونہ ہوتے ہیں۔ وَلَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ انسان بھی جب کبھی درزی کو اچکن کا نمونہ دیتا ہے تو غلط نمونہ نہیں دیتا۔ تو اللہ جل جلالہٗ نے جب نبی کو نمونۂ عمل بنایا، اُس میں غلطی و گناہ کا امکان کیونکر ہو سکتا ہے۔

۵۔ نبی کی پانچویں خصوصیت تکمیل علمی و عملی ہے یعنی جو حضرات نبی پر ایمان لا کر اُس کے دائرۂ تربیت میں داخل ہو جاتے ہیں تو وہ علم اور عمل کے اعتبار سے کامل بن جاتے ہیں۔ نہ اُن کے علم میں نقص ہوتا ہے اور نہ عمل میں۔ ان کی شان علم و عمل تمام دیگر اشخاص سے ممتاز ہوتی ہے۔

۶۔ نبی کی چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی تعلیم اور عملی زندگی سے مصالح عامہ کی مقصدیت نمایاں ہو۔ فرد اور شخص سے زیادہ عمومی فائدہ اُن کے پیشِ نظر ہو۔

۷۔ نبی کی ساتویں خصوصیت یہ ہے کہ نبی کی معاشی زندگی اور اخلاقی کردار، امارت اور فقر دونوں میں یکساں ہوتی ہے۔ نبی کی پوشاک۔ خوراک، مسکن میں جو سادگی فقر کی حالت میں ہوتی ہے، بادشاہی، امارت اور حکومت حاصل ہونے پر بھی وہی حالت ہوتی ہے اور

جو تواضع، خاکساری بوقتِ فقر ہوتی ہے، سلطنت پر بھی گفتار و کردار میں وہی عجز و نیاز اور تواضع نمایاں ہوتی ہے۔ حضور علیہ السلام اور تمام انبیاء علیہم السلام کی تاریخ اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے۔ گویا انبیاء علیہم السلام کے ایثار کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ مفادِ عوام پر ذاتی مفاد کو قربان کرتے ہیں اور غلبہ اور سلطنت حاصل ہونے پر ان کے عجز و نیاز اور شانِ عبدیت اور تواضع پر کسی قسم اثر نہیں پڑتا۔ اور انبیاء علیہم السلام کے قلب و روح کی خدداد پاکیزگی کسی بھی ماحول سے متاثر نہیں ہوتی تاکہ یہ معلوم ہو کہ عام انسانوں سے اُن کی فطرت مختلف ہے۔

۸ - نبوت کی آٹھویں خصوصیت یہ ہے کہ نبی کی زندگی میں بناوٹ، تکلّف، نمائش علوِّذات، نمود شخصیت کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور اس کا حُبّ و بُغض اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ ذات رب العالمین کے لیے ہوتا ہے۔ وہ حقِ نفس کو معاف کرتا ہے۔ لیکن حقِ اللہ کو معاف نہیں کرتا۔

۹ - نبی اطاعتِ الٰہی کا عملی نمونہ ہوتا ہے اور خلوت، جلوت گھر میں، گھر سے باہر، دوستوں اور دشمنوں میں، غصّہ اور خوشی الغرض کسی حالت میں بھی رضاء الٰہی کی راہ سے سر مو تجاوز نہیں کرتا۔ مجلس احوال اور نفسانی کیفیات اس کی استقامت میں خلل انداز نہیں ہوتے گویا رضاء حق و اطاعت شرع اُس کی فطرت کا جزء ہوتے ہیں۔

۱۰ - نبی کی دسویں خصوصیت یہ ہے کہ اُس کے دعویٰ نبوّت کی تائید میں خوارق اور معجزات کا ظہور ہو۔ شرح مواقف میں معجزہ کے لیے سات شرطیں لکھی ہیں۔

۱ : خدا کا فعل ہو۔ ۲ : خارق عادت ہو۔ ۳ : اس کا معارضہ ناممکن ہو۔ ۴ : مدعی نبوّت سے ظاہر ہو۔ ۵ : دعوی کے مواقق ہو۔ ۶ : نبی کا مکذب نہ ہو۔ ۷ : دعوی پر مقدم ہو۔ (طبع نول کشور ص ۶۶۵ تا ص ۶۶۷)

معجزہ کی اصولی قسمیں دو ہیں۔ معجزہ معنویہ جو خواص کے لیے ہے اور معجزہ حسیہ جو عوام کے لیے ہے۔ حضور کا معجزہ معنویہ قرآن ہے اور حسیہ شق القمر، تکثیر طعام و میاہ و تکلم حیوانات

و جمادات

معجزہ، کرامت اور سحر میں فرق

معجزہ و کرامت دونوں فعلِ خداوندی ہیں۔ اوّل کا مظہر نبی اور دوم کا ولی ہے اور دونوں غیر اختیاری ہیں اور کسب اور اکتساب اور تعلیم و تعلم کو اس میں دخل نہیں۔ دونوں کا سبب محض ارادۂ الٰہیہ ہے۔ بخلاف سحر کے جس کا معنی ائمہ لغت اور مفسرین نے یہ بیان کیا ہے۔ مادق مأخذہ ولطف یعنی جو فعل و عمل مخفی اسباب پر مبنی ہو وہ سحر ہے۔ موجودہ بعض مصنوعات سائنس بھی سحر کی تعریف میں داخل ہو سکتے ہیں۔ جو کہ انسانی فعل ہے انسان کے اختیار میں ہے۔ تعلیم و تعلم اور کسب و اکتساب مشق اور تجربہ سے حاصل ہو سکتے ہیں جو شخص بھی حاصل کرنا چاہے۔ ان تینوں کے علاوہ امور عادیہ ہیں جن کے اسباب جلی اور ظاہر ہوتے ہیں جیسے عام صنائع و حرف کہ عام لوگ ان کے اسباب کو جانتے ہیں۔ اگر کسی متبنی سے کچھ خوارق کا ظہور ہو تو وہ معجزات نہیں بلکہ سحر و استدراج میں داخل ہیں جن کے اسباب مخفیہ موجود ہوتے ہیں خواہ مادی ہوں یا غیر مادی جن کو تعلیم یافتہ اور مشاق لوگ استعمال میں لاتے ہیں۔ عبداللہ بن المقنع یا زردشت سے اگر کچھ خوارق صادر ہوئے ہوں تو وہ اسی قسم میں داخل ہیں جیسے شیخ الاشراق اور سکاکی سے بلا دعویٰ نبوت ایسے امور ظہور میں آئے ہیں اور تاریخ میں موجود ہیں یا ابوالطیب المتنبی و دیگر متبنیوں سے ایسے افعال کا ظہور ہوا ہے یہ سب سحر و استدراج کی مشقی و تجرباتی اور تعلیمی امور ہیں مثلاً شیخ الاشراق کا گڈریے کے ہاتھ ڈالنے سے ہاتھ کا مونڈھے سے اکھڑنا اور گڈریے کے جانے کے بعد پھر مل جانا جو درحقیقت ہاتھ نہیں رومال تھا۔ سکاکی کا بغداد کی آگ بند کرنا اور کسی چولہے کا روشن نہ ہونا، طاش کبری زادہ روحی سے منقول ہے (دیکھو مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت گیلانی جلد ۱ صفحہ ۱۶۳ حاشیہ) ابن سینا نے آخر اشارات کے ایک باب میں اگرچہ خوارق کے طبعی اسباب بھی بیان کئے اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے تفہیمات میں انما المعجزات و الکرامات امور اسبابیہ غلب علیھا السبوغ فباینت سائر الاسبابیات کہہ کر ان خوارق کو ممتاز اسبابیات

کا درجہ دیا ہے لیکن ان کا مقصد خوارق کو فہم کے قریب لانا ہے اور یہ مقصد نہیں کہ ان کا درجہ عام اسبابیات کی طرح کسبی او مشتق ہے۔

حقیقت نبوّت

۱۔ حقیقتِ نبوت تو یہ اللہ ہی جانتا ہے یا خود نبی لیکن اس کی تصویر کو ذہن میں اتارنے کے لیے امام رازی نے مطالب عالیہ میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان میں دو قوتیں ہیں۔ ایک خیر و شر معلوم کرنے کی اور دوم خیر کے مطابق عمل کرنے اور شر سے بچنے کی۔ پہلی قوت کا نام قوۃِ نظری ہے اور دوم کا نام قوتِ عملی۔ ان دونوں قوتوں کے لحاظ سے انسان کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ ایک وہ لوگ جو ان اوصاف میں ناقص ہیں۔

۲۔ خود کامل ہیں لیکن ناقصوں کی تکمیل نہیں کر سکتے۔

۳۔ خود کامل ہیں اور ناقصوں کو کامل بنا سکتے ہیں۔

کمال کے پھر مختلف درجات ہیں۔ اس کی آخری حد یہ ہے کہ قوتِ نظری اس قدر کامل ہو کہ جس کا اس کو علم ہو وہ بالکل ٹھیک ہو اور اس میں غلطی کا امکان نہ ہو اور قوت عملی کے کمال کی آخری حد یہ ہے کہ اس کو ایسا قوی ملکہ حاصل ہو کہ اس سے خود بخود اچھے افعال صادر ہوں اور برائی کے صدور کا امکان نہ ہو۔ جس کو نظر و عملی کمال کے یہ انتہائی درجے حاصل ہوں وہ نبی اور پیغمبر ہے۔

۲۔ امام غزالی معارج القدس اور المنقذ من الضلال میں نبوت کو قریب الفہم کرنے کے لیے جو تقریر کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان پیدائش کے وقت جاہل ہوتا ہے۔ سب سے پہلے اس میں لمس کی قوت کی پیدا ہوتی ہے جس سے وہ گرم، سرد، سخت اور نرم کو پہچان لیتا ہے۔ پھر اس میں حاسہ، باصرہ پیدا ہوتا ہے جس سے وہ اور مقدار کو پہچان لیتا ہے۔ پھر سننے اور چکھنے کی قوت پیدا ہوتی ہے جس سے وہ آوازوں اور مزوں کو پہچان لیتا ہے اس پر محسوسات کی حد ختم ہو جاتی ہے۔ پھر ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اب اس کو تمیز دی

جاتی ہے جس سے وہ ان چیزوں کا علم حاصل کرتا ہے جو حواس کی دسترس سے باہر ہیں۔ یہ دور ساتویں برس شروع ہوتا ہے اور اس دور میں اس کو اقارب و اجانب اور جو چیزیں کھانے پینے کے قابل یا ناقابل ہوں وہ معلوم ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد عقل کا زمانہ آتا ہے۔ جس سے انسان کو ممکن اور محال اور درست اور نادرست کا علم حاصل ہو جاتا ہے۔ اب اس سے بڑھ کر ایک درجہ آگے ہے اور جس طرح حواس عقل کے مدرکات کے لیے بیکار ہیں، اسی طرح اس درجہ کے مدرکات اور معلومات کے لیے عقل بیکار ہے۔ اسی درجے کا نام نبوت ہے جس کی وجہ سے وحی کی روشنی میں وہ علوم اور ادراکات حاصل ہو جاتے ہیں جن کے ادراک سے عقل عاجز ہے۔

۳۔ اثبات نبوت کے لیے امام غزالی کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ یہ امر ظاہر ہے کہ تمام افعال قابل عمل نہیں، اور نہ سب قابلِ ترک ہیں بلکہ بعض قابلِ عمل اور بعض قابلِ ترک ہیں۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قابلِ عمل اور قابلِ ترک کی تمیز ہر شخص کر سکتا ہے یا کوئی نہیں کر سکتا، یا بعض کر سکتے ہیں اور بعض نہیں۔ پہلے دونوں احتمال بداہتہً باطل ہیں اس لیے صرف تیسرا احتمال باقی رہا یعنی بعض انسان ایسے ہیں جو ان حدود کو متعین کر سکتے ہیں کہ فلاں اعمال عمل کے قابل ہیں اور فلاں نہیں یہی حضرات پیغمبر اور صاحب شریعت ہیں۔

۴۔ احقر کے نزدیک بعض لطیف اشیاء مثلاً ایمان، کفر، طاعت و معصیت کی تاثیرات ماوراءِ عقول ہیں جیسے معقولات ماوراء حواس ہیں لہٰذا ان کی تاثیرات کا علم عقل کے ذریعہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ لیکن ان اشیاء کی تاثیرات کا علم بیحد ضروری ہے کیونکہ کثیف اشیاء کا نفع و ضرر مثلاً تریاق و زہر معمولی ہے لیکن لطیف اشیاء روح سے تعلق کی وجہ سے قوی الاثر ہیں، مادیات میں بھی جو چیز لطیف ہے مثلاً سٹیم وہ قوی الاثر ہے۔ جس سے ریل گاڑی دوڑتی ہے اس لیے انسانی فلاح کے لیے ان اشیاء کی معرفتِ نفع و ضرر کا علم صرف ذاتِ رب العالمین سے جو لطیف و خبیر ہے ممکن ہے لیکن وہ ذات انتہائی مشرف و عظیم ہے اور انسان انتہائی پست و

دلیل ہے لہٰذا دونوں میں مباین اور بُعد کامل ہے لہٰذا ایسے واسطے کی ضرورت ہے جو انسان سے بھی بعید نہ ہو اور خدا سے بھی مناسبت رکھتا ہو تاکہ اس مناسبت کی وجہ سے اس کو فیضِ الٰہی پہنچائے ایسے واسطے کا نام نبوت ہے اور یہ گروہ انبیاء علیہم السلام کے مقدس نام سے موسوم ہے مثلاً پانی اور آگ میں انتہائی بعد اور مبائنت ہے لہٰذا آگ کے فیض یعنی گرمی کو پانی میں براہ راست منتقل نہیں کیا جا سکتا بلکہ انتقال فیض کے لیے ایک درمیانی چیز کی ضرورت ہوتی ہے جو آگ کی طرح گرم و لطیف بھی نہ ہو اور پانی کی طرح سرد و سیال بھی نہ ہو وہ دیگچی ہے جس کے ذریعے پانی کو چولہے پر رکھ کر آگ کی گرمی پانی میں منتقل ہو جاتی ہے۔ یہی حال گرمیٔ محبتِ الٰہیہ و علومِ نبوت کی جو نبی کے ذریعے اُمت اور عام انسانوں کو منتقل کی جاتی ہے۔ نبی کی ذات روحانیت اور ملکیت کے اعتبار سے اللہ سے مناسبت رکھتی ہے اور بشریت اور انسانیت کے اعتبار سے انسانوں سے مناسبت رکھتی ہے لہٰذا اُس کو اپنے مفیض یعنی اللہ اور مستفیض انسان دونوں سے مناسبت ہے۔

۵۔ شاہ ولی اللہ نوراللہ مرقدہ نے حجۃ اللہ میں اثباتِ نبوت پر جو کلام کیا ہے۔ اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ نباتات میں سے ہر نوع کے جُدا خواص ہیں۔ اسی طرح حیوانات کے ہر نوع کے بھی جُدا خواص ہیں۔ یہ سب خواص اُن کے صور نوعیہ کا فطری تقاضا ہے حیوانات کو اُن کے صور نوعیہ کے تحت، اُن کی زندگی کے لیے جو علوم عطا ہوئے ہیں اُن کے اکثر وہبی اور الہامی ہیں۔ انسان کو ــــ جو بدن و روح کا مجموعہ ہے ــــ بدنی ضروریات کے لیے فطری اور طبعی علوم کے علاوہ ایک دوسری قسم کا ادراک بھی دیا گیا ہے جو علم اکتسابی اور نظری ہے جو تجربات، غور و فکر، ترتیب مقدمات سے حاصل ہوتا ہے۔ اسی کے ذریعے انسان تجارت، صنعت، حرفت اور ہر قسم کے علوم و فنون حاصل کرتا ہے۔ لیکن یہ تمام علوم انسان کی جسمانی حالت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے سوا انسان کو ایک اور قسم کا ادراک بھی دیا گیا ہے۔ جو اُس کی روحانیت کا فطری خاصہ ہے اور جس سے قوتِ ملکیہ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا

ہے اسی قوت کا اثر ہے۔ وہ کائنات میں غور کر کے یہ سوچتا ہے کہ یہ تمام کارخانہ کیوں قائم ہو گیا اور خود مجھ کو کس نے پیدا کیا، کون روزی دیتا ہے اور کس لیے پیدا کیا۔ ان سوالات کے جواب میں وہ ایک قوتِ اعظم کا قائل ہو جاتا ہے اور اس کے آگے خضوع، خشوع، اخبات اور انقیاد کے آداب بجالاتا ہے لیکن ان امور کی تکمیل ایک الٰہی قانون پر موقوف ہے۔ جو اس کی رضا کے حدود کو متعین کرے اس لیے وہ مدتوں کے بعد ایک شخص ـــــ جو اس کا منظورِ نظر ہوتا ہے ـــــ پیدا کرتا ہے جو اس فطری تقاضاء قانون اطاعت کے ظہور کا سبب بنتا ہے وہ نبی ہوتا ہے۔ اصل مضمون ہم نے کچھ تشریحی اضافے کئے تا کہ عام فہم بن سکے۔

۶۔ دلیل قانونی۔ اللہ جل جلالہ کی تین صفات سب اقوام و ملل میں تسلیم شدہ ہیں۔

۱۔ حاکمیت ۲۔ قدرت ۳۔ حکمت

تینوں صفات کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی رعیت اور مخلوقِ انسانی کو بلا قانون نہ چھوڑے۔ حکومت بلا قانون عیب ہے۔ اسی طرح قدرت اور حکمت بھی لاقانونیت کے خلاف ہے لہٰذا ضروری ہوا کہ حاکمِ اعلیٰ یا ذات العالمین کا قانون موجود ہو اور یہ ضروری ہے کہ انسان کو اس قانون سے مطلع کیا جائے۔ کیونکہ وجودِ قانون بلا علم و اطلاع عبث ہے۔ اب اطلاع قانونِ الٰہی کی دو صورتیں ہیں۔ عمومی اور انتخابی و توسطی۔ عمومی یہ کہ حاکمِ اعلیٰ یعنی اللہ رب العالمین فرداً فرداً ہر شخص کو ہر زمانہ اور ہر ملک میں اطلاع دیتا رہے۔ یہ شکل شانِ خداوند اور اس کی عظمت کے خلاف ہے جبکہ ایک حقیر انسانی امیر یا بادشاہ ایسا نہیں کرتا کہ گھر گھر جا کر اطلاع دیتا رہے تو احکم الحاکمین ایسا کیسے کر سکتا ہے لہٰذا دوسری صورت متعین ہوئی کہ اللہ بالواسطہ اطلاع دے یعنی انسانی افراد میں کسی برگزیدہ ہستی کو چن کر اس کے ذریعہ قانونِ خداوندی سے لوگوں کو اطلاع دے تاکہ لوگوں کو دین و دنیا کی سعادت نصیب ہو اور عدل و انصاف قائم ہو سکے اور نتائج اعمال خیر و شر سے ان کو واقفیت

ہو جائے۔ ایسی منتخب اور نمائندہ حاکمِ اعلیٰ ہستی کا نام شرع کی اصطلاح میں نبی اور رسول ہے۔

۷۔ دلیل حُبّی۔ انسان کی فطرت میں جس طرح جسمانی حیثیت سے ضروریات جسمانی، کھانے، پینے، نکاح کرنے کی محبت داخل ہے اسی طرح انسان کی روحانی فطرت میں اللہ تعالے کی محبت داخل ہے اور تمام اقوام و ملل میں عبادت گاہوں کا وجود اسی فطری محبت کے صحیح یا غلط مظاہر ہیں۔ صحیح عبادت گاہ دینِ حق والوں کی ہے اور غلط عبادت گاہ دینِ باطل والوں کی ہے لیکن ان دونوں صورتوں سے تمام قوموں میں اللہ سے محبت کا ثبوت مل جاتا ہے۔ جب اللہ محبوبِ اقوام و تمام افرادِ انسانی قرار پایا، تو اس فطری جذبۂ محبت کا تقاضا تحصیلِ رضاءِ الٰہی ہے کیونکہ ہر محب کو محبوب کی رضامندی فطرۃً محبوب ہوتی ہے اور رضاء ایک مخفی چیز ہے جس کا اظہار کلام کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر آپ کسی انسان کو خوش کرنا چاہیں تو اس کے لیے بھی ضروری ہے کہ کلام کے ذریعہ اپنی خوشی اور ناخوشی کی چیز بتلا دیں اور آپ اس پر عمل کریں۔ اسی طرح خداوند تعالےٰ جو وراء الوراء اور مخلوق سے ہر چیز میں ممتاز ہے، اس کی خوشی و ناخوشی قیاس سے متعین نہیں کی جا سکتی جب تک وہ خود بذریعہ کلام خود اپنی مرضیات اور لامرضیات کے حدود متعین نہ کر دے جس کو شریعت کی زبان میں عقائدِ حقہ و باطلہ، اخلاقِ محمودہ و مذمومہ، جائزہ و ناجائز سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہی کلام اللہ تعالےٰ جس کو وہ منتخب اور مقدس ہستی پر ظاہر کرتا ہے۔ اس کو نبی اور رسول کہا جاتا ہے۔ جس کا وجود اور جس کی تعلیمات و ہدایات انسان کی محبتِ فطریہ کے مظاہر ہیں۔

۸۔ دلیل عدلی۔ افرادِ انسان بقاءِ ذات کے لیے تین امور کے محتاج ہیں۔

۱۔ کھانا ۲۔ پینا ۳۔ مکان، اور نوعی بقاء کے لیے ان تین کے علاوہ نکاح اور بیوی کا محتاج۔ یہ چاروں ضروریات تمام افرادِ انسان کے مطلوب ہیں۔ جب ہر انسان قوۃ نزوعیہ یا شہویہ کے ذریعے ان ضروریات کو طلب کرے گا تو ضروری ہے کہ ان

ہیں باہمی کشمکش اور منازعت پیدا ہو اور ہر ایک قوت غضبیہ کے ذریعے دوسرے کی مدافعت پر آمادہ ہو جائے لہٰذا ضروری ہوا کہ ان ضروریات حیات کے منازعات و خصومات ختم کرنے کیلئے ایک قانون عدل موجود ہو جو ہر ایک کے حقوق کا تحفظ کرے وہ قانون یا انسان بنائے گا خواہ فرد ہو جماعت (پارلیمنٹ) یا خدا بنائے گا۔ پہلی صورت میں مقصدِ عدل کی تکمیل نہیں ہو سکتی کیونکہ قانون عدل کی تدوین کے لیے امورِ ذیل ضروری ہیں۔

۱۔ علم کامل اور حکمتِ کاملہ تاکہ خیر و شر کے حدود متعین کرنے میں غلطی واقع نہ ہو۔

۲۔ رحمت و شفقت تاکہ بغض و عناد کی وجہ سے وضع قانون میں بے انصافی نہ ہو۔

۳۔ یکسانیت اور غیر جانب داری تاکہ وضع قانون میں اپنے ہم قوم اور ہم وطن افراد کی رعایت کرکے دوسروں کا حق تلف نہ کرے۔

انسان ان تینوں صفات سے خالی ہیں نہ ان کا علم تامہ ہے نہ شفقت اور نہ غیر جانبداری کیونکہ وہ ضرور کسی قوم کا فرد ہوگا اور کسی وطن کو منسوب ہوگا لہٰذا یقیناً ان کی طرفداری کرے گا۔ لیکن خدا کی ذات میں یہ تینوں صفات جمع ہیں۔ نہ اس کے علم تامہ میں کسی غلطی کا امکان ہے اور نہ اس کی رحمت و شفقت میں اپنے بندوں پر شک و شبہ کی گنجائش ہے۔ نیز تمام اقوام اور تمام ملکوں کے رہنے والے اس کے یکساں بندے ہیں اور اللہ سے یکساں طور پر نسبت عبدیت و مخلوقیت ہے۔ اللہ کسی قوم کا فرد یا وطن کا باشندہ نہیں کہ اس کے حق میں جانب داری برتے، بلکہ اقوام و اوطان اس کے یکساں مخلوق ہیں۔ لہٰذا قانون اسی ذات کا حق ہے۔ اب اس قانون کو وہ جس اپنے معتمد اور منتخب نمائندہ کے ذریعے بھیجے گا وہ اللہ کا نبی اور رسول کہلاتا ہے۔

۹۔ دلیلِ توسطی:۔ تمام مذاہب اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ انسان کو خدا شناسی اور خدا پرستی کے لیے خدا کی رہنمائی کی ضرورت ہے لیکن عام انسان اور خدا میں بلحاظ مراتب بے حد بُعد واقع ہے۔ عام انسان انتہائی پست اور خالق عالم انتہائی بلند ہے۔ ایسی حالت

ہیں یہ ضروری ہے کہ انسانوں میں سے چند برگزیدہ ہستیوں کو بطور واسطۂ فیض انتخاب کیا جائے
تاکہ وہ اللہ جل جلالہ سے فیض حاصل کر کے عام انسانوں کو پہنچا دے۔ یہ منتخب ہستیاں جسمانی
لحاظ سے انسان اور بشر ہو کر اُن سے مناسبت رکھتی ہوں اور روحانی بلندی اور پاکیزگی کے
لحاظ سے خدائے فیاض سے مناسبت رکھتی ہوں۔ وہ درحقیقت وسائط فیضان الٰہی
ہوں، جن کے توسط سے عرفان الٰہی کا فیض خالق کائنات کی طرف سے انسان اور اولادِ
آدم کو پہنچتا ہو۔ مثلاً ہم اگر چاہیں کہ آگ کا فیض پانی کو پہنچا دیں اور اس میں گرمی پہنچ کر چاء
یا سالن کی کارآمد شکل اختیار کرے تو چونکہ پانی اور آگ میں مناسبت مفقود ہے اور گرمی
اور سردی، خشکی و تری کے اعتبار سے دونوں میں بُعد اور دوری ہے لہٰذا ہمیں ایک
ایسے واسطے کو تلاش کرنا پڑتا ہے جو آگ اور پانی کے درمیان انتقالِ فیض کے لیے ایک
واسطہ کا کام دے، اور وہ دیگچی ہے جس میں پانی ڈال کر آگ پر اس کو رکھا جاتا ہے۔ اس
کو دونوں سے مناسبت ہے یا بقول شاہ ولی اللہ نور اللہ مرقدہ روح انسانی جو کہ لطیفۂ ربانی
ہے وہ غایت لطافت میں ہے۔ اور بدن انسانی کثیف ہے لہٰذا روح طبی یعنی وہ بھاپ جو
خون سے پیدا ہو کر بدنِ انسانی میں پھیلتی ہے اس قدرت نے واسطہ بنایا کہ روح انسانی
روح طبی سے براہ راست متعلق ہو کر بدن انسانی کو اپنا فیض پہنچا دے اور اسی طرح اعضاً
انسانیہ، روح انسانی سے بواسطہ روح طبی مستفید ہو سکے۔ اسی خدا اور اس کے بندوں میں
انبیاء علیہم السّلام کے توسط کو سمجھو۔ رشد و ہدایت کی یہی شکل اللہ کی عظمت کی شایانِ
شان ہے اور اللہ تعالےٰ کا تجسّم بشکل مسیح علیہ السّلام جیسے نصاریٰ کا خیال ہے۔ یا
بشکل رام کرشن مہادیو جیسے ہندوؤں کا خیال ہے، غلط اور خلاف فطرت ہے اور

اولاً تو خدائے لامحدود کا محدود انسان میں متشکل ہونا خلافِ عقل ہے۔ انسانی شکل
میں خدا کا تشکل خدا کی خدائی کو قائم نہیں رہنے دیتا اور خدا پھر ان تمام حاجات اور لوازماتِ
بشریت سے ملوث ہو جاتا ہے جو خواص بشریت ہیں۔ سوئم اس صورت میں ہادی خود

خدا بنا گوانسانی صورت میں سہی۔ لہٰذا وہ جو فعل و عمل کرے گا وہ خدائی عمل سمجھا جائے گا جو انسانوں کے لیے نمونہ عمل نہیں بن سکتا۔ انسانوں کے لیے انسان کا عمل نمونہ بن سکتا ہے کیونکہ ایسی صورت میں انسان کہہ سکتا کہ ہم ہادی کی چال پر چلنے سے عاجز ہیں کیونکہ وہ خدا ہے اور ہم انسان لہٰذا ہم ویسا نہیں بن سکتے۔ چہارم یہ کہ خدا کا انسانی لباس میں آنا غیر مفید بھی ہے کیونکہ جس شکل میں مثلاً مسیح علیہ السلام یا نظریہ اوتار کے تحت رام چندر میں وہ آیا تو اسی شخصیت سے براہ راست خدا کا تعلق رہا، باقی انسانوں سے بالواسطہ۔ کیونکہ ہر ہر آدمی میں الوہیت کا متشکل ہونا تو کوئی بھی نہیں مانتا۔ لہٰذا بجائے اس کے کہ خدا دیگر انسانوں کی راہ نمائی کے لئے انسانی تشکل کی ذلت اٹھا کر خود واسطۂ فیض بنے اس سے زیادہ معقول ہے کہ کسی منتخب انسان کو واسطۂ فیض بنائے تاکہ اس کا عمل انسان ہونے کی وجہ سے اوروں کے لیے نمونہ عمل ہو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیوی نظام میں انسانی بادشاہ خود در در نہیں پھرتا اور نہ کسی کے بھیس میں نمودار ہوتا ہے بلکہ احکام شاہی کے لیے اپنا نمائندہ منتخب کرتا ہے۔ اسلام نے نبوت کا جو تصور پیش کیا ہے وہ سب سے زیادہ معقول ہے اور فطرتِ سلیمہ اور عالمی روش کے عین مطابق ہے۔ پنجم ۵ اگر تجسم کا معنی ظہور لیا جائے بایں معنی کہ نصاریٰ کے نزدیک حضرت مسیح علیہ السّلام اور ہندوؤں کے نزدیک رام چندر وغیرہ مظہر خدا ہے تو مظہریت ان حضرات میں مخصوص نہیں، تمام انسان بلکہ تمام مخلوقات علوی و سفلی جلوہ گاہ ظہورِ عشق ہے۔

۱۰۔ دلیلِ تقدیسی۔ احکام خداوندی کے لیے جاننا، ماننا اور کرنا تینوں ضروری ہیں۔ جاننے کے لیے معلم، ماننے کے لئے تقدس اور کرنے کے لیے مقدس نمونے کا وجود ضروری ہے تاکہ تعلیم، تسلیم اور تعمیل کے ذریعہ دین الٰہی باقی رہ سکے۔ ورنہ عدم تسلسل کی وجہ سے دین کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا اور دوام اور استمرارِ دین کے لیئے اس کا ارتباط ایک ایسی محسوس شخصیت کے ساتھ ضروری ہے جس کی عظمت، تقدس، محبوبیت القلوب میں اس قدر مستحکم ہو جو کبھی زائل نہ ہو اور ایسی شخصیت نبی کی شخصیت ہو سکتی۔ اس لیے

ں کا تصور بقاء دین کے لیے ضروری ہے تاکہ اس کی محبت اور تقدس کا تسلسل شمع دین
ی تابانی کے لیے تیل کا کام دے سکے۔

سیرت نبوی اور مستشرقین

کسی عظیم شخصیت کے متعلق تین امور ایک مصنف مزاج محقق کی نگاہ میں قابل توجہ ہیں:
(۱) تاریخی تعارف (۲) ذاتی کردار (۳) اس کے دائرہ کار سے متعلق کارنامے

پہلی چیز یعنی تاریخی تعارف

تو اقوام عالم میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے قبل جس قدر پیشوایانِ دین اور بادیانِ ملت اور انبیاء علیہم السلام گذرے ہیں، ان کے تاریخی تعارف کے متعلق ان کی وفات سے لے کر اب تک یقینی طور پر اس سے زیادہ کچھ بھی معلوم نہیں، جو بائبل میں ان کے متعلق مختصر تذکرہ درج ہے اور وہ عدم محفوظیت اور تحریفات کی وجہ سے ان کی عظمتِ شان کے خلاف ہے۔ مثلاً حضرت نوحؑ کے متعلق کتابِ پیدائش باب ۱۹ آیت ۱۱ میں ہے" نوح نے شراب پی اور ننگا ہو گیا"، اور حضرت لوط علیہ السلام کے متعلق کتابِ پیدائش باب ۱۹ آیت ۳۰ تا اختتام باب میں مذکور ہے، "لوط نے شراب پی اور اپنی صاحبزادیوں سے ہم بستر ہوا، وہ حاملہ ہوئیں اور ان سے اولاد پیدا ہوئی"، انجیل متی باب ۲۶ میں ہے کہ "یہوداحواری نے تیس روپے رشوت لے کر مسیح کو گرفتار کرایا"۔

بائبل کے ان حوالجات سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ اس میں تھوڑا بہت تذکرہ موجود ہے، وہ بھی پراز اغلاط اور ناقابلِ اعتبار ہے، جو یہود اور انصاریٰ کے مذہب کی بنیادی کتاب ہے، باقی ان حضرات کے متعلق ان کے قریب زمانے میں کوئی مستند سوانح یا لائف سند کے ساتھ تحریر نہیں کی گئی، اس کے برخلاف حضور علیہ السلام کی ذات وہ واحد شخصیت ہے

جو تاریخی تعارف کے اعتبار سے یکتا ہے، ان کی پیدائش، بچپن کے حالات اور زندگی کے کل واقعات سند کے ساتھ موجود ہیں، ان کی تعلیمات اور ملفوظات کا ایک ایک حرف مستند طریقے پر کتب حدیث و سیر میں موجود (درج) ہے۔ اور آج بھی اگر کوئی شخص آپ کی زندگی کا کوئی واقعہ معلوم کرنا چاہے تو معلوم کر سکتا ہے، گویا حضور علیہ السلام آسمانی تاریخ کے ایک آفتاب عالم تاب ہیں، جس میں آپ کی ذات کا ہر خدوخال نمایاں ہے، آپ کی زندگی کے حالات میں مختلف زبانوں میں مسلم و غیر مسلم مصنفین نے جس قدر کتابیں لکھی ہیں، آج تک کسی شخصیت کے متعلق اتنی کتابیں نہیں لکھی گئیں۔

احادیث

آپ کے ملفوظاتِ دینی یعنی احادیث دس لاکھ سے زائد تحریر میں آچکی ہیں اور ان کے حفاظ بھی موجود تھے، جن کو یہ ملفوظات زبانی یاد تھے،

امام احمد حنبلؒ دس لاکھ احادیث اور امام ابوزرعہؒ سات لاکھ احادیث کے حافظ تھے۔ قسطلانی نے فلاس سے نقل کیا ہے کہ جو حدیث امام بخاریؒ کو معلوم نہ ہو، وہ حدیث نہیں، یعنی آپ کو حضورؐ علیہ السلام کی تمام احادیث اور ملفوظاتِ دینی یاد تھے۔

صحابہؓ

جن اہلِ ایمان نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت پائی ہے، یعنی آپ کے دوست اور صحابہؓ تھے، ان میں سے تقریباً بارہ ہزار کے احوال تاریخ میں قلمبند ہیں،

کیا ایسی شخصیت دنیا اور خاص کر ایسے ملک میں جو اُمیّین اور ناخواندوں کا ملک ہو، کوئی بتا سکتا ہے کہ ان کی احادیث یعنی بائیس کروڑوں انسانوں کے لیے قانون زندگی کی حیثیت رکھتی ہوں اور دس لاکھ کی تعداد میں قلمبند ہوں اور صدیوں تک یہی تعداد مختلف محدثین کے سینوں میں محفوظ ہو اور بارہ ہزار دوستوں کے احوال بھی صحیح سند کے ساتھ اور مستند طریقے سے ضبطِ تحریر میں آچکے ہوں اس سے بڑھ کر تاریخی تعارف کسی دوسرے انسان کو تاریخی دور کے کسی حصے میں حاصل نہیں ہوا ہے

دوسری چیز یعنی ذاتی کردار حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا عمل چونکہ اُمتِ محمدیہ بلکہ کل اقوامِ بشریہ کے لیے اسوۂ حسنہ اور نمونۂ انسانیتِ کاملہ تھا۔ اس لیے دستِ قدرت نے سنّتِ نبوی کی شکل میں اور اُمتِ محمدیہ صالحہ کے اعمال کی صورت میں اس کو محفوظ رکھا، تاکہ قیامت تک اگر کوئی انسان کامل بن جانے کی کوشش کرنے کا خواہاں ہو تو اس نمونہ کو سنتِ نبویہ سے حاصل کر سکتا ہے، نبوی یا محمدی اسوہ ایک بحرِ ناپید کنار ہے کہ اس کا احاطہ ناممکن ہے۔ لیکن ہم صرف ان میں سے چند امور جن کو دوست دشمن سب تسلیم کرتے ہیں بیان کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں۔ انسان بہیمیت اور ملکیت کا مجموعہ ہے، بہیمیت تین صفات کو پیدا کرتی ہے۔ (۱) جوشِ نفس یعنی خواہشات (۲) قہر و غضب (۳) تکبر و پندار۔ یہ تینوں اگر ملکیت کے تابع ہو جاتے ہیں، تو تین کمالات بالترتیب پیدا ہو جاتے ہیں (۱) جوشِ نفس تابع ملکیت ہو کر عفت، پاکدامنی و قناعت اور پرہیزگاری میں تبدیل ہو جاتا ہے، (۲) قہر و غضب شجاعت میں بدل جاتے ہیں، (۳) تکبر و پندار تواضع کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور انسانیت کمال کو پہنچ جاتی ہے،

ملکیت کے تابع ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ یہ تینوں بہیمی طاقتیں رضائے الٰہی کے ماتحت آجاتی ہیں، خواہشِ نفس محلِ رضاءِ الٰہی میں استعمال ہوتی ہے، مثلاً نکاح۔ اور جہاں اللہ کی رضاء نہ ہو بلکہ غضب ہو، وہاں استعمال نہیں ہوتی، مثلاً زنا وغیرہ، اسی طرح خواہش حلال کھانے اور کمانے میں استعمال ہوتی ہے، حرام کھانے اور حرام کمانے، مثلاً سود، ظلم، غضب، چوری، رشوت، اور دھوکہ وغیرہ میں استعمال نہیں ہوتی،

قہر و غضب، حفاظت خود اختیاری یا حفاظتِ حقوقِ مظلومین و حفاظتِ حقوق الیہ میں استعمال ہوتا ہے، اور اس کے خلاف مثلاً انسانوں پر ظلم اور ناحق میں استعمال نہیں ہوتا، یہی بہادری و شجاعت کہلاتی ہے، باقی درندگی ہے،

ملکیت کا اثر تقویٰ خشیۃ اللہ اور خوفِ آخرت ہے، جس سے محاسبۂ نفس، علم و معرفت

وغیرہ پیدا ہوتے ہیں کہ یہ اوصاف انسان ہی کے مخصوص کمالات ہیں، ان کمالات پر چہار گانہ کے تحت سیرتِ نبویہ پر بحث کرتے ہیں۔

(۱) عفت وقناعت

یہ دو وصف حضور علیہ السلام کے ایسے ہیں کہ دوست، دشمن اقراری ہیں کہ آپؐ بچپن سے جوانی اور جوانی سے ادھیڑ عمر تک یعنی قریباً ۵۳ سال کی زندگی اپنے دشمنوں یعنی کفارِ مکہ اور قریش میں گذاری، جہاں نہ کوئی حکومت موجود تھی نہ قانون اور پورا ماحول سیاہ کارانہ تھا اور اس کو عیب بھی نہ سمجھا جاتا تھا، زنا، شراب اور سود خوری عام تھی، ان ہی لوگوں میں رہ کر آپؐ کو خلعتِ نبوّت سے نوازا گیا اور پوری سوسائٹی دشمن بن گئی اور آپؐ کے قتل کے درپے ہو گئے، لیکن ان دشمنوں کی زبان سے بھی ایک لفظ آپؐ کی ذات کے متعلق نہ نکل سکا، جو آپؐ کی پاک دامنی، عفت، قناعت اور امانت کے خلاف ہو، بلکہ آپؐ کو اپنے جھگڑوں کا حَکَم مان کر آپؐ سے فیصلہ کراتے تھے اور "امین" کے لقب سے مشہور تھے، یعنی آپؐ وہ ذات ہیں کہ آپؐ سے ہر کسی کی جان، مال اور عزت با امن اور محفوظ ہے، بلکہ بعد از ہجرت آپؐ کے اس وقت کے بدترین دشمن ابوسفیان سے ہرقلیس شاہِ روم نے پوچھا: هَل كنتم تَتَّهِمُوْنَهُ بِالْكِذْبِ قَبْلَ اَنْ يَقُوْلَ مَا قَالَ کیا تم ان پر جھوٹ کا گمان وتہمت کا خیال کرتے رہے ہو، دعوئ نبوّت سے پہلے قال لا۔ جواباً ابوسفیان نے کہا کہ "نہیں"۔ آپؐ کی کفار میں بھی سچائی کی اس شہرت کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ——— اور کفار نے جو قرآن کے دشمن تھے، سن کر اس کا انکار نہیں کیا۔ قرآن نے فرمایا ؟ فانهم لا يكذبونك کہ یہ کفار تم پر جھوٹ کا الزام نہیں دھرتے۔

پچیس سال کے جوشِ جوانی کی زندگی آپؐ نے تجرّد اور توجہ حق میں گزاری، پھر حضرت خدیجہؓ کی درخواست پر جو چالیس سال کی بوڑھی تھیں اور جو تین شوہروں سے یکے بعد دیگرے بیوہ ہو چکی تھیں اور دنیا سے ان کا دل سرد ہو چکا تھا، ایک سردار نے ہزار اونٹ کے مہر نکاح

کی پیشکش کی، لیکن نکاح سے انکار کر دیا، حضرت خدیجہ پاکدامنی کی وجہ سے طاہرہ کے نام سے مشہور تھیں، ان کے "میسرہ" غلام نے سفر شام کے جو حوال انھیں سُنائے اور اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل عالم تورات اور انجیل سے انھوں نے (حضرت خدیجہؓ نے) جو کچھ آنحضرتؐ کے متعلق سُنا، ان سے حضرت خدیجہؓ کو یقین آگیا کہ آخری نبی آپ ہی ہوں گے، اس لیے از خود نکاح کی درخواست کی اور پچیس سال سے زائد عرصہ آپؐ نے اسی ایک بوڑھی بیوی کے نکاح پر قناعت کی، اگرچہ جوان عورتوں کی کمی نہ تھی، اس کے بعد جتنے بھی قدر نکاح حضورؐ نے کیے ہیں، حضرت عائشہؓ کے سوا وہ سب بیوگان تھیں، جس پر یورپ کے مستشرقین نے اعتراض کیا اور بلا تحقیق جو جی میں آیا لکھدیا،

تعدد ازدواج

چنانچہ مستشرقین یورپ نے تعددِ نکاح نبوی کو ہدف طعن بنایا اور اس کو نفسانیت کا رنگ دیا ـــــ ان کے اس اعتراض کے تین اجزاء ہیں (۱) نفس قانونِ تعدد پر اعتراض (۲) نیت نبوی پر اعتراض کہ اس نکاح کی محرک ہوائے نفس تھی، (۳) تعداد زوجات امت کے حق میں چار تک ہے، لیکن حضور علیہ السّلام نے نو یا گیارہ تک نکاح کیے، اس فرق پر اعتراض۔

قانون تعددِ نکاح پر اعتراض

ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السّلام کا قانون یورپ کے خود ساختہ قانون کا پابند نہیں ہم اس سوال کا جواب دو طرح دیتے ہیں، (۱) نقلی (۲) عقلی

نقلی

یعنی یہود اور انصاری کی مسلم کتاب بائبل سے پہلا حوالہ ابوالانبیاء حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السّلام کے متعلق ہے، بائبل پیدائش $\frac{16}{4}$ میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی تین بیویاں بیک وقت تھیں، سارہ، ہاجرہ، قنطورا، پیدائش $\frac{29}{4}$ میں ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السّلام کی بیک وقت چار بیویاں تھیں (لیا، زلفہ، راخل، بلہہ) ـــــ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی بے تعداد زوجات تھیں (تین بیویاں تھیں۔ استثناء $\frac{21}{15-10}$

حضرت داؤد علیہ السلام کی اُنیس بیویاں تھیں (شموئیل ۱۶/۲۳)

حضرت سلیمان علیہ السلام کی ایک ہزار عورتیں تھیں۔ سلاطین ۱۱/۳

یہ سب بائبل کے مستند پانچ انبیاء علیہم السلام کی متعدد زوجات کے حوالے ہیں، اگر ان پر مستشرقین کو اعتراض نہیں ہے تو تعداد نکاح نبوی پر کس منہ سے اعتراض کرتے ہیں۔ یہ تو قانون تعدد نکاح کی دلیل عیسائیوں کی بائبل سے دی گئی، اب عقلی دلیل تعدد نکاح کی معلوم کرو اور سُن لو۔

عقلی دلائل

دلیل ۱:۔ اگر یورپ کے قانون کے مطابق ایک مرد کے لیے صرف ایک بیوی کے ساتھ نکاح مختص ہو تو پھر قدرت اور فطرت کے لئے ضروری تھا کہ ولادت میں ذکور و اناث میں مساوات رکھی جاتی یعنی لڑکے اور لڑکیاں کل عالم میں اور ہر جگہ مساوی تعداد میں پیدا ہوتے، تاکہ لڑکیوں کی تعداد بڑھنے نہ پائے، اگر لڑکیوں کی تعداد پیدائش لڑکوں سے ایک فی ہزار بھی زائد ہو جاتی، تو تین ارب انسانی آبادی میں ایک لاکھ لڑکوں کی پیدائش کے مقابلے میں ایک لاکھ ایک سو اور ایک کروڑ لڑکوں کے مقابلے میں دس ہزار لڑکیاں زائد ہوں گی۔ اور ایک ارب کے مقابلے میں دس لاکھ عورتیں فالتو ہوں گی، علیٰ ہذا القیاس۔ اب سوال ہوگا کہ یہ فالتو عورتیں جنسی فطری خواہش کی تکمیل کے لیے یا خلاف فطرت تجرّد پر مجبور کی جائیں گی، جو ہر دور میں اور بالخصوص اس دور میں ناممکن ہے، یا زنا کے ذریعے ناجائز طریقے سے اپنی خواہش پوری کریں گی، جو انسانی معاشرے کی تباہی کا موجب ہوگا، لہٰذا قانون تعدد نکاح کی صورت میں، جو بشرط عدل اسلام میں موجود ہے، ان کی فطری ضرورت کی تکمیل کی صورت پیدا ہوگی، بالخصوص آج کل جو عموماً عورتوں کی تعداد مردوں سے بہت زیادہ ہے، ان کی کھپت کے لیے اسلام کے فطری قانون تعدد نکاح کے سوا اور چارۂ نہیں۔

دلیل ۲:۔ تعداد اموات میں بھی مرد اور عورتوں کی مساوات قدرت کے لئے ضروری تھی، موت کی صورت میں اگر یک زوجگی کا یورپی قانون، قانونِ فطری اور قدرتی ہوتا تو قدرت

کا فرض تھا کہ مردوں اور عورتوں کی قبض رُوح اور موت میں یکسانیت رکھتی، تاکہ توازن پورا ہو، ورنہ اگر مرد زیادہ مر جائیں اور عورتیں کم، تو اگر دونوں کی ولادتی تعداد برابر بھی ہوا جب بھی بڑی تعداد عورتوں کی بچ رہے گی، جن کے کھپانے کے لیے یورپی قانون میں جائز صورت کوئی نہ ہوگی، بہرحال یورپی قانون یک زوجگی کے تحت کارخانۂ قدرت کا فرض تھا کہ وہ شرح پیدائش و اموات کے دفاتر بذریعہ ملائکہ پورے پورے ملک اور صوبوں اور ضلعوں تک میں قائم کرتی تاکہ یورپی قانون یک زوجگی کا توازن برقرار رہے، لیکن ایسا نہیں ہوا، جس سے معلوم ہوا کہ یہ انسانی قانون منشاءِ قدرت وفطرت کی ضد ہے اور واجب الترک ہے۔

دلیل ۳:۔ جنگ بھی فطرتِ انسانی میں داخل ہے۔ انسانی افراد و اقوام قوتِ شہویہ غروبیہ (یعنی حب الوطنی) کے تحت فوائد ملک پر قبضہ کرنے کے لیے آلاتِ حرب کے ذریعے دوسرے ملک پر حملہ کرتے ہیں اور جس ملک پر حملہ ہوتا ہے، وہ مدافعت کے لیے جنگ پر مجبور ہوتا ہے، جس کی وجہ سے دونوں قوموں کی فوجیں قوتِ غضبیہ کا مظاہرہ کرتی ہیں اور لاکھوں، کروڑوں آدمی لقمۂ اجل بن جاتے ہیں، یا بیکار ہو جاتے ہیں، جنگِ اول ایسے مقتولین و بیکار لوگوں کی تعداد چار کروڑ تھی اور جنگِ عظیم ثانی میں چھ کروڑ تعداد تھی، ایسی صورت میں اکثر مرد کام آجاتے ہیں اور عورتیں بچ جاتی ہیں، فوج میں بھرتی اکثر مرد ہیں، عورتیں نہ ہونے کے برابر۔

تو گویا گذشتہ دونوں جنگوں میں جو دس کروڑ مرد ضائع ہوئے، ان کے بالمقابل جو عورتیں کی تعداد بچ گئی۔ اس کو کہاں کھپایا جائے، جائز راستہ تعدد نکاح تو مغربی قانون میں بند ہے، یہ دقت اس صورت میں بھی باقی رہے گی، اگر قبل از جنگ مرد و زن کی تعداد برابر ہو، اگر یہ کہا جائے کہ متعدد بیویوں سے بے انصافی ہوتی ہے تو بے انصافی ایک بیوی کے ساتھ بھی کی جاتی ہے، لہٰذا ایک کی بھی بندش ہونی چاہیے۔

دلیل ۴:۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پہلی بیوی بیمار ہوتی ہے اور مرض ممتد ہوتا ہے۔ یا حیض ونفاس کی صورت ہوتی ہے یا بانجھ پن ہوتا ہے اور شوہر کو فرزند اور جانشین کی فکر ہوتی ہے، اس

صُورت میں جنسی جذبہ کی ضرورت بھی اس بیوی سے پوری نہیں ہوتی، کیا ایسی صورت میں عقل کا تقاضہ کا یہ نہیں کہ ان ضرورتوں کی تکمیل کے لیے دوسری بیوی نکاح میں لانے کی قانونی گنجائش موجود ہو، یا کہ ان ضرورتوں کو کلیۃً نظر انداز کر دیا جائے، اسلام نے جو دینِ فطرت ہے، ان سب گذشتہ حالات کو پیشِ نظر رکھ کر بشرطِ عدل چار بیویوں تک کی اجازت دی، اور سابق اقوام و ادیان کی لاتعداد زوجات کو عدل کی شرط پر چار میں محدود کر دیا۔ یورپ میں آج کل شوہروں کی سپلائی کے لیے انجمنیں قائم ہیں اور عورتیں پریشان پھرتی ہیں لیکن شوہر نایاب ہوتا جارہا ہے، یہ عقدہ حل ہو جاتا اگر محمدی قانون پر عمل ہوتا، جیسا کہ مسیحی دنیا نے حالات سے مجبور ہو کر مسیحی قانون کو ترک کر کے طلاق میں محمدی قانون پر عمل کر کے مشکلات کو حل کیا اور نبی امّی کے قانون کی صداقت ماننے پر مجبور ہوئے۔ اسی طرح امریکہ نے بھی میڈیکل بورڈ کی تحقیقی رپورٹ کے بعد شراب کی صحی نفسیاتی، حیاتیاتی مضرات پر مطلع ہو کر ۱۹۳۰ء میں تحریم و بندشِ شراب کا قانون امریکہ میں نافذ کیا، لیکن وہ بے لگام معاشرے کو پابند کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اب قانون تعدد زوجات پر اعتراض کا جواب ختم ہوا۔ اعتراض کا دوسرا جزو، "نیت پر اعتراض" اس کا جواب دیا جاتا ہے۔

تعدد زوجات میں پیغمبر علیہ السّلام کی نیت پر اعتراض اور اس کا جواب

مستشرقین سے مراد وہ یورپی مفکرین ہیں جو علوم مشرقیہ بالخصوص علوم اسلامیہ کا مطالعہ اس خیال سے کرتے ہیں کہ اپنی تصنیفات کو بنام تحقیق علمی شائع کریں، ایک بات تعصب پر پردہ ڈالنے کی غرض سے قرآن، صاحب قرآن اور اسلام کی تعریف بھی لکھ دی جاتی ہے اور بہت سے اسلامی کتابوں کے حوالے بھی درج کر دیئے جاتے ہیں تاکہ مضمون مسلمان ناظرین کی نگاہ میں مقبول ہو جائے لیکن ساتھ ساتھ ایسی باتیں اور زہر شامل کر دیئے جاتے ہیں کہ مسلمان اگر عیسائی نہ ہو تو کم از کم مسلمان بھی نہ رہے، یعنی قرآن اور صاحب قرآن علیہ السلام اور اسلام کے متعلق ان میں تشکک اور تردد پیدا ہو، اور عقیدے کی پختگی زائل ہو، یہ شعبہ اسلام کے خلاف مسیحی یورپ کا قلمی جہاد ہے،

کیونکہ تلوار کے جہاد سے وہ کامیابی نہیں ہو سکتی جو اس قلمی جہاد سے ہو سکتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود مسلمان برائے نام اسلام کا نام برقرار رکھ کر اسلام کو مٹا دینے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ یہی نسخۂ اکسیر ہے جو مشرقی پاکستان کے ہندو استادوں اور پروفیسروں نے وہاں کے سکولوں اور کالجوں میں استعمال کیا اور اظہار ہمدردی کے لیے یہ مرچ مصالحہ بھی شامل کیا کہ مغربی پاکستان والے بنگالیوں کو لوٹ رہے ہیں، بنگالیت کے جذبے کو ابھارا اور اسلامیت سے نفرت دلائی یا بدظن کیا گیا، نتیجہ وہی ہوا جو ہمارے سامنے ہے، لیکن مغربی پاکستان میں نصاب تعلیم اور اساتذۂ تعلیم پر اب تک تجربے کے بعد بھی ہماری احتسابی نظر صحیح نہیں ہوئی، ہم ان ہی لایعنی جھگڑوں کے شکار ہیں، مستشرقین کی یہ ساری دشمنی اسلام سے ہے، نہ دیگر مذاہب مشرق سے، یہی حال روسی سوشلزم کا ہے کہ اس کا نشانۂ تیر بھی صرف اسلام ہے، نہ ہندو مذہب، نہ بدھ، نہ مجوسیت، نہ مسیحیت۔

اس کی چند وجوہ ہیں (۱) اسلام کو وہ جاندار مذہب سمجھتے ہیں کہ اگر کسی وقت وہ زندہ ہوا تو بہت بڑی طاقت بن جائے گا، جس کا مقابلہ مشکل ہے (۲) اس میں عالمی مسائل کو حل کرنے کی قوت و کشش موجود ہے، دیگر مذاہب میں نہیں، وہ مذاہب مردہ ہیں، اس لیے اسلام کے تیر کو مارا تو نہیں جا سکتا، سُلا دینا ضروری ہے (۳) صلیبی جنگوں سے مسیحی اقوام کو اسلام دشمنی ورثہ میں ملی ہے، جو ان سے جدا نہیں ہو سکتی۔ ان سب باتوں کے باوجود بعض مستشرقین حضور علیہ السلام کے متعلق بعض غلط بیانیوں کے انکار اور اصل حقیقت کے اقرار پر مجبور ہیں، مثلاً یہ کہ حضور علیہ السلام نے جو متعدد شادیاں کیں، نفسانی جذبے کی وجہ کیں یا دیگر مصالح کی وجہ سے، ہم چند مورخین یورپ کے حوالوں پر اکتفا کرتے ہیں، جنہوں نے اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ یہ نکاح نفسانیت کی غرض سے نہیں ہوئے۔

(۱) ڈی۔ ایس۔ مارگولی اسمتھ:۔ یہ بڑا تنگ ظرف اور متعصب نکتہ چین ہے لیکن اپنی کتاب "محمد اینڈ دی رائز آف اسلام" میں لکھتا ہے کہ بہت سے مصنفین یورپ

کے نزدیک خدیجہؓ کے بعد محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی متعدد شادیاں نفسانی خواہشات کے تحت تھیں، مگر وہ اس قسم کی نہ تھیں، کئی شادیاں سیاسی مصلحت کی بنا پر کی گئی تھیں۔ پیغمبر اپنے معتقدین کو اپنے قریب ترین کرنا چاہتے تھے، یہ وجہ ابو بکرؓ و عمرؓ کی لڑکیوں عائشہؓ و حفصہؓ سے شادی کرنے کی تھی، سیاسی مخالفین یا مغلوب دشمنوں کی لڑکیوں سے شادیاں سیاسی مقصد کے تحت دوسری نوعیت کی تھیں۔ باقی شادیوں کی وجہ یہ تھی کہ کوئی لڑکا نہ تھا۔

(۲) آر بیاسورتھ سمتھ :- کے چار لیکچر ۱۸۷۴ء "محمد اینڈ محمڈنزم" کے عنوان سے شائع ہوئے تھے۔ کہتا ہے کہ دوسرے مقاصد کے علاوہ محمدؐ کے اکثر و بیشتر شادیوں کے مقاصد بے سہارا افراد پر ترس کھانا تھا، تقریباً سب ہی بیوائیں تھیں، جو نہ خوب صورت تھیں نہ دولتمند۔ خدیجہؓ کے وقتِ رحلت تک، خود پچاس برس کی عمر کے تھے، ظاہر ہوتا ہے کہ زینب کی کی کہانی میں رنگ آمیزی کی گئی، زینب پیغمبر کی پھوپھی کی بیٹی تھی اور بجائے آزاد غلام سے ان کی شادی کر دینے کے خود ان کے ساتھ شادی میں رکاوٹ کوئی نہ تھی، جب وہ اور یہ دونوں جوان تھے۔

(۳) "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" :- میں یورپ کا مشہور مصنف کارلائل لکھتا ہے "محمد نفس پرست نہ تھے یہ بہت بڑی گمراہی ہو گی کہ اس شخص کو ایک عام بندہ ہوس تصور کریں یہ شخص کبھی، اور خط نفس پر گرنے والے نہ تھے، ان کے گھر کا ساز و سامان بادشاہی حاصل ہونے کے باوجود غریبانہ تھا، ان کی خوراک جو کا آٹا اور پانی تھا، اکثر ایسا ہوا کہ مہینوں ان کے گھر آگ نہ جلی، وہ اپنے جوتے آپ گانٹھ لیتے تھے، اپنے کپڑوں میں آپ پیوند لگاتے ایک غریب محنتی مستغنی انسان ان تمام رجحانات سے بے نیاز جن پر عام سطح کے آدمی مرتے رہتے ہیں، اس قسم کا آدمی برا آدمی نہیں ہو سکتا، اس کے جذبات ہوس سے بلند ہوتے ہیں اگر وہ ایسے ہوتے تو وحشی عرب جو ۲۳ سال اس کے اشاروں پر جان پر کھیلتے رہے اور عمر بھر اسے قریب سے دیکھتے رہے، اس کی تعظیم نہ کرتے، وہ بات بات پر کٹ مرنے والے وحشی

تھے، ایسے لوگوں سے اپنی اطاعت کرانا کسی عام آدمی کا کام نہ تھا، وہ انہیں رسول کہتے تھے، اس لیے ان کی ساری زندگی ان کے سامنے بے نقاب تھی۔ اس میں کوئی راز نہ تھا، سیدھی سادی، کبھی وہ ان کے ساتھ جنگ میں شریک ہیں، کبھی مشاورت میں، کبھی ان میں کھڑے ان سے اطاعت کرا رہے ہیں، انہیں انہوں نے آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ وہ کس قسم کے انسان ہیں، اس لیے وہ اُن کو پیغمبر کہتے تھے، کوئی شہنشاہ اپنی خلعتِ فاخرہ میں ملبوس ہو کر لوگوں سے اس قسم کی اطاعت نہیں کرا سکتا، جس قسم کی اس انسان نے کرائی۔

(۲) ایس بولے "لائف آف محمدؐ" میں لکھتے ہیں، یہ کہنا کہ محمدؐ بندۂ ہوس تھے غلط ہے۔ ان کی روزمرہ کی زندگی، ان کا تخت بوریا جس پر سوتے تھے، ان کی معمولی غذا، کمتر سے کمتر کام اپنے ہاتھ سے انجام دینا، ظاہر کرتا ہے کہ وہ نفسانی خواہشوں سے بلند و بالا تھے، ان کی متعدد شادیاں ان بیواؤں سے ہوئیں، جن کے شوہروں نے میدانِ جنگ میں اسلام کی خاطر اپنی جانیں قربان کیں، وہ محمدؐ کی کشادہ دل سے اپنی حفاظت و پناہ کا حق رکھتی تھیں، باقی شادیاں مصلحت کی بناء پر کی گئیں، مخالفین کے سرداروں کو مسخر کرنے کے لیے سب سے بڑا سبب بیٹے کی تمنا تھی، جو ان کے قدم بقدم چلے۔ سب سے پہلا ثبوت ان کی پہلی بیوی خدیجہؓ کے ساتھ ان کی وفاشعاری ہے کہ شروع سے آخر تک اس میں ذرہ بھر فرق نہ آیا، ہلکی سی بھی لغزش نہ ہوئی۔ خدیجہ کے بعد اگرچہ انہوں نے متعدد شادیاں کیں، لیکن انہیں کبھی نہ بھولے اور آخر وقت تک یاد رکھا۔ یہ محبت بھری یاد ایک شریف الطبع انسان ہی میں ہو سکتی ہے، نہ ایک بندۂ ہوس میں۔

جدید دشمنوں کا اقرار یہ حوالجات ان مخالفینِ اسلام مورخین یورپ کے ہیں، جو پیغمبر اسلام علیہ السلام کی زندگی پر سخت سے سخت تنقید کے عادی ہیں، انہوں نے بھی تاریخی واقعات سے مجبور ہو کر حضور علیہ السلام کی ذات کو ہوا و ہوس و عام خواہشات کی دنیا سے بلند مقام عطا کیا، یہ تو جدید دشمنوں کا اقرار ہے۔

قدیم دشمنوں کا اقرار

قدیم دشمنانِ پیغمبر اسلام جن کی تمام کوششیں اور جان و مال کی ساری قربانیاں صرف اس لیے تھیں کہ آپ کو ناکام کر کے لوگوں کی نظروں میں غیر مقبول بنائیں، لیکن ان دشمنوں میں سے کسی ایک دشمن نے بھی حضور علیہ السلام کے متعلق ہوا و ہوس یا خواہش پرستی کا حرف بھی زبان سے نہیں نکالا۔ ورنہ مستشرقین کے لیے صرف وہی حرف نقل کر دینا اثباتِ مقصد کے لیے کافی تھا اور اپنی طرف سے الزام تراشنے کی ضرورت نہ تھی، اس سلسلے میں بدترین دشمن ابوسفیان اور اس کے قریشی ساتھیوں کا مجمع عام میں وہ بیان جس سے آپ کی عزت مآبی اور امانت داری کا واضح ثبوت ملتا ہے، شہادت کے لیے کافی ہے۔

واقعاتِ تاریخ

خود حضور علیہ السلام کی زندگی خواہشاتِ نفس کی ضد ہے، ہوس اور خواہش نفس ناقابل تقسیم جذبہ ہے۔ نفس کو مال کی خواہش ہوتی ہے، عمدہ لباس کی خواہش ہوتی ہے، عمدہ مکان، عمدہ خوراک کی، مجالس میں عمدہ نشست کی بھی، دشمنوں سے انتقام کی بھی اور عیش کی بھی خواہش ہوتی ہے، عمدہ سواروں، راحت و آرام اور مقام عزت کی خواہش ہوتی ہے۔

ان چیزوں پر اگر منصفانہ نگاہ ڈالی جائے تو عین اس وقت کہ آپ کو عرب کی دس لاکھ مربع میل کی سلطنت پر اقتدار حاصل تھا، کسی وقت بھی آپ کے پاس مال نہیں تھا۔ یہاں تک کہ وفات کے وقت بھی آپ نے ایک درہم نہیں چھوڑا۔ ایک بار نماز سے فارغ ہو کر جلدی سے گھر میں تشریف لے گئے۔ صحابہؓ حیران تھے کہ کیا بات ہے، واپس آ کر آپ نے بتایا کہ گھر میں کچھ مال تھا، اس کو تقسیم کرنے کا حکم فرما آئے ہیں، کیونکہ خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ موت آئے اور گھر میں مال موجود ہو۔ آپ کا لباس غریب عوام کی طرح تھا، اگر کسی وقت کوئی اچھی چادر یا کپڑا کسی نے پیش کیا اور کسی کو پسند آیا یا مانگا تو فوراً اتار کر دے دیا۔ مکان کیا تھا، مٹی کی چھوٹی چھوٹی دیواروں پر کھجور کی شاخیں ڈال کر اس کے نیچے عمر بھر سوتے رہے، گھر میں چراغ تک نہ تھا، بارش

میں چھپر کے اوپر ٹاٹ ڈالا جاتا تھا، مجالس میں آپؐ کی مخصوص نشست نہ تھی، عام آدمی جب باہر سے آتا تو پیغمبرؐ اور ان کے جانثاروں میں فرق نہیں کر سکتا تھا۔ خوراک کا یہ عالم تھا کہ گھر کی واقفِ حال بیوی حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ تین تین ماہ تک اس شاہ دو جہاںؐ کے گھر میں آگ نہیں سلگتی تھی، پانی اور چند دانے خرما پر گزارہ تھا، بعض اوقات بھوک سے بے تاب ہو کر پیٹ پر پتھر باندھ لیتے تھے کہ بھوک کا احساس نہ ہو۔ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ کے کنبے کو دو دن مسلسل کبھی پیٹ بھر کر جو کی روٹی میسر نہیں آئی یہاں تک کہ حضورؐ وصال فرما گئے۔ دشمنوں سے انتقام کا یہ حال تھا کہ اہل مکہ جیسے بدترین دشمنوں کے تیرہ سال کے مظالم سے تنگ آکر آپؐ نے مکہ جیسے مقدس وطن کو چھوڑا تھا، فتح مکہ کے موقع پر وہ پابہ زنجیر قیدیوں کی صورت میں جب آپؐ کے سامنے پیش کیے گیے، تو آپؐ نے فرمایا، تم سب آزاد ہو۔ اور میں تم کو ملامت تک بھی نہیں کرتا۔ کیا اس سے بڑھ کر نفس کشی اور خواہش کو پامال کرنے کی کوئی نظیر انسانی تاریخ میں مل سکتی ہے، سواری کا یہ حال تھا کہ جب اُونٹ کم ہوتے تھے اور دو دو تین تین باری باری سے ایک اونٹ پر سوار ہوتے تھے تو آپؐ خود بھی ان میں شامل ہوتے تھے، جب آپؐ کی نوبت میں رفیقِ سواری عرض کرتا کہ آپؐ سوار ہو جائیں، میں آپؐ کے بدلے میں پیدل چلوں گا تو آپؐ یہ فرما کر سواری سے اتر کر پیادہ چلتے کہ تم مجھ سے قوی نہیں، اور میں تم سے اجر و ثواب کی خواہش کم نہیں رکھتا، راحت طلبی نہ تھی، چنانچہ یہ حال تھا کہ اکثر اوقات مشغولیت کے باوجود مکان پر دربان نہ تھا، ہر وقت ہر کوئی مل سکتا تھا دن کو اکثر روزے، رات کو خدا کی عبادت، فوجی سپہ سالاری بھی خود، چیف جسٹس بھی خود معلم اور استاد بھی خود، عزت اور وقار پرستی نہ تھی چنانچہ یہ کیفیت تھی کہ صحابہؓ کے ہمراہ جب چلتے تھے تو سب سے پیچھے چلتے تھے، اور جب مجلس میں آتے تھے تو کوئی صحابیؓ تعظیم کے لیے نہیں اٹھتا تھا کیونکہ آپؐ نے منع فرمایا تھا کہ میرے لیے کوئی کھڑا نہ ہو لہٰذا جان نثار صحابہؓ تعمیلِ حکم سے مجبور تھے، یہ سب اُمور ایسے ہیں کہ جس ذات میں رائی کے دانے کے برابر خواہشِ نفس ہو، وہ قطعاً ایسا نہیں کر سکتا۔

اب صرف متعدد بیویوں کا مسئلہ رہ گیا۔ اس کو جدا عنوان سے بیان کرتے ہیں،

تعدّدِ زوجات

اس پر ہم دو طرح سے بحث کرتے ہیں، ایک بحیثیت مجموعی، دوم انفرادی حیثیت سے۔ مجموعی حیثیت سے یہ تحقیق کرنی ہے کہ جب دلائل سے یہ ثابت ہوگیا کہ حضور علیہ السّلام کے تعدّدِ زوجات میں قطعاً شائبہ نفسانیت شامل نہ تھا، کیونکہ آپؐ کی پوری زندگی نفسانی خواہش کے خلاف جہاد کا نمونہ تھی، اور اس وجہ سے بھی اگر تعدّدِ زوجات میں نفسانی خواہش کا دخل ہوتا تو آپؐ نوجوان حسیناؤں کا انتخاب کرتے، لیکن آپؐ کی جملہ زوجات بجز ایک کے سن رسیدہ اور بیوائیں تھیں، اس کے علاوہ نفسانی جوش کا زمانہ جوانی کا ہوتا ہے، لیکن جوانی سے لے کر ۵۳ سال کی عمر تک آپ نے ایک بوڑھی بیوہ عورت کے نکاح پر اکتفا کیا، اس کے بعد کے بڑھاپے اور قریب الوصال وقت میں تعدد کی نوبت آئی تو اس تعدد زوجات کا منشاء

تعدد زوجات کا اصل سبب تعلیم دین تھا

سببِ اوّل

لازماً کوئی اور تھا اور وہ یہ تھا کہ حضور علیہ السّلام کا قول و عمل امت کے لیے ہدایت کا سامان اور نمونہ عمل تھا، بلکہ تمام عالم انسانی کے لیے، کیونکہ آپؐ کی نبوت، لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا وَرَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ کی حیثیت سے بین الاقوامی تھا اور دروازہ نبوت کی بندش کی وجہ سے آپؐ کے ایک ایک قول و عمل اور اندرونِ خانہ زندگی کا کردار اور ازواج مطہرات سے آپؐ کا طرز معاش، ادائے حقوق اور اخلاقی زندگی کا پورا نقشہ امت کے مرد اور عورتوں شوہروں اور بیویوں دونوں کے لیے واجب العمل نمونہ تھا اور اسی نمونہ کے قالب میں اپنی زندگی کو ڈھالنا لازمی تھا۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ یقیناً تمہارے لیے حضور علیہ السّلام کے قول و عمل اور طرزِ زندگی میں انسانیت کاملہ کا بہتر نمونہ ہے، اس وجہ سے ایک ایسے ادارے کا قیام ضروری تھا، جو اس داخلی زندگی کی تعلیم کے لیے ازواج کے ذریعے وجود میں آتے، کیونکہ اسلام کے قانون حجاب کے تحت پیغمبر اسلام

علیہ السلام سے امت کی اجنبی عورت نہ بے حجابانہ مل سکتی تھی اور نہ پابندی قانون پردہ کے تحت حضرت علیہ السلام اجنبی عورتوں سے مل سکتے تھے اور نہ ہی اندرونِ خانہ زندگی رسالت کے مشاہدہ کی صورت ہو سکتی تھی، اس لیے تکمیل تعلیم دین کے لیے منشاءِ الٰہی نے یہ انتظام کیا کہ ایسی عورتوں کا مختلف طبقات میں سے انتخاب ہو کر وہ طہارتِ نفس، پاکیزگی قلب اور فہم دین میں امتیازی شان رکھتی ہوں، تاکہ وہ حضور علیہ السلام سے علوم دینیہ اور اسوۂ نبویہ بالخصوص مستورات سے متعلقہ مسائل کو حاصل کر سکیں اور صحیح سمجھ سکیں اور امت کو عموماً اور مستوراتِ امت کو خصوصاً ان کی تعلیم دے سکیں، تاکہ حضور علیہ السلام کی تعلیم کو مردوں اور عورتوں دونوں کو یکساں طور پر پہنچانے اور ابلاغ میں آسانی ہو اور گھر کے اندر کے احوال اور بالخصوص زوجات کے حقوق اور حسن معاشرہ کا صحیح نمونہ امت کو معلوم ہو سکے، یہی وجہ ہے کہ خدیجہؓ کے بعد ازواجِ مطہرات کا انتخاب بھی حضور اکرم نے خود نہیں کیا، بلکہ وحی الٰہی سے ہوا، کہ اس کام کی صحیح اہمیت کا علم صرف خدا ہی کو ہو سکتا تھا۔ حضرت خدیجہؓ اور زینبؓ بنت خزیمہ نے حضور علیہ السلام کی زندگی میں وفات پائی اور نو بیویاں حضور علیہ السلام کی وفات کے وقت زندہ تھیں، یہ حدیث ملاحظہ ہو، عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماتزوجت شیأً من نسائی ولا زوجت شیأً من بناتی الا بوحی جاء نی بہ جبریل عن ربی عزوجل۔

اخرجہ عبدالمالک بن محمد بسندہ عیون الاثر ج ۲ صـ ۳۰۰ وزرقانی ج ۳ صـ ۲۱۹۔ اس حدیث سے صاف معلوم ہوا کہ زمانہ نبوت کی ازواج مطہرات کا انتخاب اللہ تعالیٰ نے فرمایا، آپ کی خواہش نفس کو اس میں دخل نہیں تھا، اس لیے بجز ایک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سب عمر رسیدہ اور بیوہ منتخب ہوئیں کہ کار تبلیغ و تعلیم دین کی پوری اہمیت کا علم صرف خدا ہی کو ہو سکتا تھا، جیسے نبی کا انتخاب خدا کرتا ہے، زوجیتِ نبی کا انتخاب بھی خدا نے کیا، کیونکہ مقصدِ نبوت کی اہمیت اور مقصدِ زوجیتِ نبوت کا صحیح علم صرف خدا کو ہے۔ اس ادارۂ ازواج کا فائدہ یہ ہوا کہ نبوتِ محمدی

کے بہت سے علوم ازواج مطہرات کے ذریعے اُمت کو پہنچے، ورنہ امت ان علوم سے محروم ہوتی۔

سببِ دوم

پھر ان ازواج مطہرات کی ذواتِ قدسیہ میں شدتِ تعلق کی وجہ سے جو اخلاقِ زکیہ و فضائل محامد حضور علیہ السّلام سے منتقل ہوئے، وہ پوری اُمت اور اُمت کی مستورات کے لیے نمونۂ عمل ہیں۔

کتب سیر و رجال میں ان ازواج مطہرات کی عبادت، روزے، تلاوتِ قرآن، ذکر اللہ، سخاوت، ترکِ محبتِ مال، قناعت، فکرِ آخرت، اتباعِ شریعت کے جو احوال درج ہیں، ان کو دیکھ کر ایمان قوی ہو جاتا ہے، اس لیے قرآن پاک نے فرمایا۔ وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ ۔ کہ حضور علیہ السّلام کی بیویاں اُمّت کی مائیں ہیں، جیسے حضور علیہ السّلام امت کے باپ ہیں، یعنی جیسے ایمان کی تازگی و حیات میں احوالِ نبی کو دخل ہے۔ احوالِ زوجاتِ نبی کو بھی دخل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ۔ تم (زوجاتِ پیغمبرؐ) دیگر عورتوں کی طرح نہیں ہو، بلکہ تمہارا مقام بہت بلند ہے۔

سببِ سوم

دینِ حق و وصلِ الٰہی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ کینہ پرور عربوں کے انتقامی جذبات کا فطری جوش تھا اس کا تقاضہ یہ تھا کہ تعلیم امت کے لیے دائرہ زوجیت میں جن مستورات کا انتخاب ہو ان سے مقصدِ تعلیمِ اُمت کے علاوہ ان زخموں کی بھی مرہم پٹی کی جائے جو مقابلہ دینِ حق میں ان کے خاندانوں کو پہنچ چکے ہیں، اور ان کا سبب اگرچہ ان کے اپنے کئے ہوئے جرائم و اعمال ہی تھے۔ مگر ان با اثر و قوی خاندانوں کی وجہ سے جو اشاعتِ حق کی راہ میں ایک تاریخی عداوت اور انتقام کیشی کی فضا پیدا ہو چلی تھی، جس کو دور کرنا ضروری تھا۔

جویریہؓ

اس سلسلہ انتخاب میں حضرت جویریہؓ بنت حارث آتی ہیں، جن کا پہلا نکاح مسافع بن صفوان سے ہوا تھا، جو غزوہ مریسیع میں مارا گیا تھا، یہ ایک طاقت ور قبیلہ بنی المصطلق کے سردار حارث کی بیٹی تھیں، قید ہو کر آئیں اور ثابت بن قیس کے حصے

غنیمت میں آگئیں، انہوں نے ان سے مکاتبت کرلی، یعنی یہ کہ آپ اتنی رقم ادا کردیں تو آپ آزاد ہوجائیں گی، یہ رقم کی ادائیگی کے سلسلے میں حضور کے پاس حاضر ہوئیں، آپ نے فرمایا، اگر میں رقم ادا کردوں اور آزاد کردوں اور پھر میں خود تم سے نکاح کرلوں تو نکاح پر تم راضی ہو۔ انہوں نے عرض کیا کہ میں راضی ہوں۔ (ابوداؤد کتاب الاعتاق) اتفاق سے ان کے باپ حارث آئے، انہوں نے کہا میری بیٹی کنیز نہیں رہ سکتی، آزاد کردیں، آپ نے فرمایا، میں اس کو جویریہ کی مرضی پر چھوڑتا ہوں، جویریہؓ نے فرمایا، میں اللہ اور رسول کو اختیار کرتی ہوں (رواہ ابن المنذر بسند صحیح جلد ۴ صفحہ ۲۶۵)

اُم حبیبہ رض تیسری زوجہ مطہرہ ام المومنین اُم حبیبہؓ ہیں، جو اسلام کے خلاف اکثر لڑائیوں کے کمانڈنگ آفیسر اور قریش کے سردار ابوسفیان کی بیٹی تھیں، ان کی ماں حضرت عثمان کی پھوپھی صفیہ بنت ابی العاص تھیں، ان کا پہلا نکاح عبیداللہ بن جحش سے ہوا تھا، حضرت اُم حبیبہ خود بھی مسلمان ہوئیں اور ان کی تبلیغ سے ان کے شوہر بھی مسلمان ہوئے، اس وقت ان کے باپ ابوسفیان اور بھائی معاویہ جو اسلام کے دشمن تھے، دونوں ان کو اسلام لانے پر ستاتے رہے، تنگ آکر دونوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی، وہاں کچھ مدت کے بعد شوہر عبیداللہ بن جحش نصرانی ہوگیا، لیکن اُم حبیبہ اسلام پر قائم رہیں، حضور کو اطلاع ہوئی، آپ نے متاثر ہوکر سوچا تو آپ کو ان کی اس استقامت کا خیال آیا کہ انہوں نے اپنے سردار باپ کی دشمنی مول لے کر افریقہ کے ملک میں پناہ لی، پھر شوہر اس عیسائی ملک میں مرتد ہوکر مرگیا، لیکن اُم حبیبہ کی ایمانی استقامت میں فرق نہ آیا، یہ دونوں امور ایسے ہیں کہ اس صورت میں بے سہارا مستورہ کو سہارا ملنا چاہیئے، دوم یہ کہ اس طرح ان کے باپ اور خاندان کی اسلام دشمنی میں کمی بھی آجائے گی، یہ دو اہم سبب ہوئے کہ آپ نے اُم حبیبہؓ کو شرف زوجیت نبوی سے نوزا۔ حبشہ کے بادشاہ کو جو مسلمان ہوچکے تھے، حضور نے اپنے قاصد کے ذریعے پیغام بھیجا کہ اُم حبیبہ کو میری طرف سے پیغام نکاح پہنچادو، چنانچہ یہ پیغام پہنچادیا گیا۔ یہ بشارت سُن کر

بادشاہ کی اس باندی ابرہہ کو جس نے یہ پیغام پہنچایا تھا، اس کو امّ حبیبہؓ نے اپنے چاندی کے دو کنگن اور پاؤں کے پازیب اور انگلیوں کے چھلے انعام میں دیئے اور نکاح کے وقت چار سو پونڈ بادشاہ نے حضور علیہ السلام کی طرف سے مہر میں دیئے اور خود خطبہ نکاح پڑھا۔

صفیہؓ چوتھی بیوی صفیہؓ بنت حیی بن اخطب ہیں، جو بنی نضیر کے یہودی سردار حیی بن اخطب کی بیٹی تھیں، جن کا پہلا نکاح سلام بن مشکم سے ہوا تھا، اس نے طلاق دی اس کے بعد آپ کا نکاح کنانہ بن ابی العقیق سے ہوا، وہ غزوہ خیبر میں مقتول ہوا، صفیہؓ قید ہو کر آئیں، حضور نے انکو آزاد کر کے اپنی زوجیت میں لے لیا، صفیہؓ حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد سے تھیں، اس نکاح سے بے سہارا صفیہؓ کی دلجوئی بھی ہوئی اور اس کا اظہار بھی مقصود تھا کہ حضورؐ کو یہود سے ذاتی عداوت نہیں تاکہ عداوت یہود میں کمی آجائے۔

زینبؓ پانچویں بیوی زینب بن جحش تھیں، یہ حضورؐ کی پھوپھی امیمہ بنت عبدالمطلب کی بیٹی تھیں، عرب کا دستور تھا کہ متبنیٰ یعنی لے پالک بیٹے کو اصل بیٹے کی طرح سمجھتے تھے اور اس کی بیوی سے بصورتِ موت یا طلاق بعد از عدت بھی نکاح حرام سمجھتے تھے، اس کے علاوہ اگر کسی پر غاصبانہ وظالمانہ طریق پر غلامی کا داغ لگ جاتا تھا تو آزادی کے بعد بھی کسی شریف عورت کو اس کے نکاح میں دینے کو عار سمجھا جاتا تھا، ان دو رسموں کو عملی طور توڑنے کے لیے منشاء الٰہی کے تحت حضور علیہ السلام نے اپنے متبنیٰ لے پالک زید بن حارثہ سے کرنا چاہا، چونکہ ایسا کرنا رواجِ عرب کے خلاف تھا، زینبؓ شریف خاندان سے اور حضورؐ کی پھوپھی زاد تھیں، زینب اور ان کے بھائی عبداللہ بن جحش، جو دونوں مسلمان تھے، ان سے جب حضورؐ نے تذکرہ کیا تو انہوں نے زید بن حارثہ آزاد کردہ غلام سے نکاح زینبؓ کو گوارا نہ کیا، جس پر یہ آیت نازل ہوئی، وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔

اس آیت میں مومن زیدؓ اور مومنہ زینبؓ اور ان کے بھائی مراد ہیں، یعنی مومن مرد یا عورت کے لئے کوئی اختیار نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کوئی فیصلہ کریں تو وہ اس پر راضی نہ ہو، اور جو شخص حکم وجوبی کے بعد نافرمانی کرے تو وہ کھلی گمراہی میں جا پڑا۔ اس آیت کے نزول پر زینب زید بن حارثہؓ سے نکاح پر راضی ہو گئیں اور نکاح ہو گیا، لیکن خاندانی برتری کا تصور چونکہ باقی رہا اس لئے باہم موافقت نہ ہو سکی، حضرت زید جب شکایت لے کے جاتے اور طلاق کا ذکر دہراتے تو حضورؐ اس خفگی پر صبر کی تلقین کرتے اور طلاق دینے سے منع فرماتے، یہ خیال تھا کہ ایک تو آزاد کردہ غلام سے نکاح کے عار کو برداشت کیا، اب اگر طلاق دی گئی تو طلاق کا عار بھی لگ جائے گا تو زیادہ ناراضگی ہو گی۔ پھر جب موافقت ناممکن ہو گئی تو زید نے طلاق دے دی۔ طلاق کی جب عدت گزری تو اللہ کا منشاء ایک دوسری رسم جاہلیت کے ازالے کا ہوا کہ خود حضورؐ کے عمل سے اس رسم جاہلیت کو منہدم کیا جائے، تو حضورؐ کو اگرچہ منشاء الٰہی کی تکمیل سے عذر نہ تھا، لیکن یہ خیال رہا کہ عرب میں بدنامی ہو گی کہ وہ لوگ منہ بولے بیٹے کی جورو کو حرام کہتے تھے اور حضورؐ خود منہ بولے بیٹے کی جورو کو گھر میں رکھ لیں، پھر حضور کے دل میں یہ خیال آیا کہ حضرت زینب اور ان کے خاندان کو رواج عرب کے مطابق دو قسم کی رسوائی ہوئی۔ ایک آزاد کردہ غلام سے نکاح کی، دوم طلاق کی، لیکن منشاء الٰہی تھا کہ اس زخم رسوائی کا مداوا ہو، جس کے بہترین مرہم صرف یہ ہو سکتا تھا کہ حضور علیہ السّلام خود زینب کو اپنی زوجیت کا شرف بخشیں، لیکن ساتھ ہی عرب کی اس رسوائی کا بھی ڈر تھا کہ یہ طعن دیا جائے کہ آپ نے لے پالک بیٹے کی جورو سے نکاح کیا، کیونکہ عرب کے لوگ متبنیٰ کو بیٹا ہی سمجھتے تھے، لیکن منشاء الٰہی کے تحت آپ نے عمل فرمایا اور اس جاہلانہ قدیم رسم کا انقلاع فرما دیا، حضورؐ کے اس نکاح سے معاشرتی نظاموں کی اصلاح ہوئی اور مساواتِ بشری کی ایک عمدہ نظیر بھی قائم کی گئی، لیکن عجیب بات ہے کہ مستشرقین نے صلیبی

جنگوں کی موروثی عداوت سے جھوٹے اور بے سند اضافے کر کے اس کو عشقیہ داستان بنایا، گویا آپؐ اس نکاح کے لیے بے تاب تھے، اس متعصبانہ غلط الزام تراشی کے تردید کے لیے صرف یہ کافی ہے کہ حضرت زینب حضورؐ کی پھوپھی زاد بہن تھیں، بچپن کے زمانے سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے تھے، حضور علیہ السلام نے خود ہی ان کا نکاح اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ سے کرایا۔ جو ان کو ناگوار بھی گزرا لیکن پھر خدا اور رسول کے حکم کی مجبوری سے نکاح پر راضی ہو گئیں، میں کہتا ہوں کہ اگر حضور علیہ السلام اس نکاح کے لئے بے قرار تھے تو مکہ معظمہ میں حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد خود ان سے نکاح کر لیتے۔ یا بعد از ہجرت جب آپؐ نے ان کا ۴ھ میں زید سے نکاح کرانا چاہا تو زید کی بجائے خود ان سے نکاح کر لیتے، وہ کم نبی کی وجہ سے زید کے نکاح سے راضی نہیں تھیں تو خود ان سے نکاح کر لینے میں کیا رکاوٹ تھی اور اب بیوہ ہونے کے بعد نکاح میں کیا کشش تھی، معلوم ہوا کہ یہ مسیحی استشراق کی غلط داستان ہے، جو سراسر عقل کے خلاف ہے۔

وحی پر اعتراض مستشرقین کا یہ کہنا کہ کیفیت وحی مرگی کی بیماری تھی قطعاً نامعقول ہے۔ بوجوہات ذیل۔

۱۔ صرع یا مرگی کی بیماری میں مرض کے دورے کے وقت جو واردات ہوتی ہیں، مریض کو افاقہ کی حالت میں اس کا قطعاً علم نہیں ہوتا کہ اس پر کیا وارد ہوا اور کس طرح وارد ہوا اس حقیقت پر قدیم اطباء اور جدید ڈاکٹرز متفق ہیں۔ جس کو محمد حسین ہیکل مصری نے "حیاۃ محمد" میں نقل کیا ہے، لیکن وحی نبوی کی حالت اس کے خلاف تھی۔ وحی کے دوران کے تمام الفاظ وحی زوال کیفیت وحی کے بعد آپ کو یاد رہتے تھے اور وحی کی پوری کیفیت آپ کے حافظے میں ہوتی تھی۔ لہٰذا مرگی کا تخیل صرف الزام تراشی ہے۔

۲۔ دوم یہ کہ مرگی کے ساتھ زمین پر گر پڑنا، منہ کو جھاگ آنا، انگلیوں کا سکڑ جانا لازمی ہے لیکن یہاں ان میں سے کوئی چیز نہیں۔

۳۔ سوم یہ کہ وحی کی حالت میں جو پیغام آپ کو دیا گیا ہے جس کا نام قرآن ہے اور جس کی لفظی و معنوی حیرت انگیز معجزانہ خوبیوں سے دُنیا بھر کے حکماء اور عاجز ہیں اور جس کی اصلاحی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ بہت کم عرصہ میں اُس نے عرب اور ماوَرائے عرب کے انسانوں کو جن کی زندگی سیاہ اور پراز معاصی تھی اور ناقابلِ اصلاح تھی ایسے درندہ صفت انسانوں کو حضرت نے ایسی پاکیزہ زندگی عطاء کی کہ تاریخ انسانیت میں اس کی نظیر نہیں۔ وہ عبادت الٰہی، خشیۃ اللہ اور اخلاق میں بے مثال، حسنِ معاملات، جہاں بانی، جہاں داری اور عدل و انصاف میں یکتا بن گئے۔ کیا کسی مرگی والے کی بات میں بھی اس قسم کا اثر ممکن ہے؟

۴۔ چہارم یہ کہ نبوت کا زمانہ تیئیس سال سے زیادہ ہے اگر اتنی طویل مدت تک کوئی موذی مرض کا شکار ہو تو ضرور اس کی صحت خراب اور تباہ ہو جاتی ہے، لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی صحت کا یہ حال تھا کہ تریسٹھ سال کی عمر تک جسمانی اور دماغی قوت آپکی بے نظیر تھی اور سر اور ڈاڑھی مبارک میں بہ مشکل بیس بال سفید ہوں گے جو انتہائی عمدگی صحت کی دلیل ہے۔

۵۔ پنجم یہ کہ تیرہ سو سال بعد کے دشمنوں نے آپ کے متعلق یہ فرضی جھوٹ تراشا۔ لیکن جو دشمن آپ کے زمانے میں موجود تھے اور آپ کی حالت کا دن رات مشاہدہ کرتے تھے۔ جن میں مشرکین، اور نصاریٰ شامل تھے۔ ان میں سے کسی ایک فرد نے بھی آپ کی ذات کی نسبت مرض مرگی کا الزام نہیں لگایا۔ حالانکہ ان دشمنوں کو اس الزام تراشی کی زیادہ ضرورت تھی فرق صرف اتنا تھا کہ وہ باحیا اور کسی قدر انسانی شرافت اور راست گوئی کی اہمیت کے قائل تھے اور اہلِ استشراق اس سے محروم ہیں۔

جہاد پر مستشرقین کا اعتراض

مستشرقین چونکہ مسیحی استعماری قوتوں کے ہراول دستہ ہیں جو مشنریوں کی طرح اسلامی ملکوں میں سامراجیت کے لیے راہ صاف کرتے ہیں اس راہ کی بڑی رکاوٹ ان کے نزدیک مسلمانوں کا جذبۂ جہاد ہے لہذا انہوں نے سارا زورِ قلم جہاد پر صرف کیا اور جہاد کو اسلام کی جبری اشاعت کا ذریعہ

ٹھہرایا اور اس کو فساد اور وحشیانہ عمل قرار دیا۔ حالانکہ یہ دونوں الزام مسلمانوں کی مذہبی مقدس کتاب قرآن حکیم کے خلاف ہیں کہ خود قرآن کا حکم ہے۔

لَاۤ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ دین اسلام کے لیے جبر و اکراہ منع ہے اور اس صریح اور واضح حکم کی موجودگی میں قرآن اور صاحبِ قرآن پر دینی جبر کا الزام قطعاً غلط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید استعماری مستشرقین کے علاوہ گذشتہ دور میں یہ الزام یہود و نصاریٰ و مشرکین میں سے کسی نے بھی قرآن اور صاحبِ قرآن پر نہیں لگایا۔ اگر کسی مسلمان بادشاہ کا شاذ و نادر کوئی واقعہ ایسا گذرا ہو تو وہ قرآن و سنت کے خلاف ہے۔ اور اس کے خلاف کوئی عمل سند نہیں۔ ابن جریر نے ابن عباس سے اس آیت کا سبب نزول یہ نقل کیا ہے کہ حصین نامی انصاری کے دو بیٹے نصرانی تھے اور باپ خود مسلمان تھا۔ باپ نے حضور علیہ السلام سے پوچھا کہ میں بیٹوں کو اسلام پر مجبور کر سکتا ہوں، جس پر یہ آیت اتری۔ جس میں اسلام پہ مجبور کرنے کی ممانعت کی گئی۔ کیونکہ ایمان وہ معتبر ہے جو دل کے اختیار سے ہو اور اخلاص پر مبنی ہو۔ جیسے لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا۔ وَمَاۤ اُمِرُوۡۤا اِلَّا لِیَعۡبُدُوا اللّٰہَ مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ پہلی آیت میں امتحان مقصود ہے کہ اللہ لوگوں پر یہ ظاہر کر دے کہ دل اور بدن کے عمل میں اپنے اختیار سے کون اچھا ہے اور دوسری آیت میں ہے کہ عبادت وہ مطلوب ہے جس میں اخلاص ہو اور اخلاص دل سے قبول کرنے سے حاصل ہوتا ہے اس کے علاوہ کافر اسلامی جہاد میں فوجی خدمات کے عوض معمولی جزیہ ادا کرتے ہوئے اپنے دین پر رہ کر اسلامی مملکت کے تمام حقوقِ شہریت حاصل کر سکتا ہے حَتّٰی یُعۡطُوا الۡجِزۡیَۃَ عَنۡ یَّدٍ وَّہُمۡ صٰغِرُوۡنَ یعنی اس وقت جنگ ختم ہوگی، جب جزیہ دے کر تابعداری مملکت اسلامی اسلامی اختیار کریں۔ تفسیر مظہری (ج ۱، ص ۳۳۶ مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی) میں ہے کہ یہ آیت منع اکراہ اور قبول جزیہ اہلِ کتاب سے خاص نہیں، بلکہ مشرکین کو بھی شامل ہے۔ اگرچہ نزول کا سبب واقعہ اہل الکتاب ہے، فرماتے ہیں تخصیص المورد لا یقتضی تخصیص النص وھو عام ترجمہ سبب نزول و مورد کے خاص ہونے سے نص کی تخصیص نہیں ہوگی۔ بلکہ نص عام

ہے۔ اسی طرح لا اکراہ کی آیت منسوخ بھی نہیں۔ جیسے بعض کا خیال ہے کہ یہ اقتلوا المشرکین کافۃ سے منسوخ ہے۔ صاحبِ مظہری کہتے ہیں نسخ کے لیے تعارض ضروری ہے اور یہاں تعارض نہیں، کیونکہ قتال، دین پر جبر کے لیے نہیں بلکہ رفع فساد کے لیے ہے۔

مقصد جہاد دین پر جبر نہیں رفع فساد ہے

جہاد کا مقصد خود قرآن نے بیان کیا اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ۔

(ترجمہ) اگر تم جہاد نہ کروگے تو خدا کی زمین پر بڑے فتنہ اور فساد برپا ہوں گے یعنی جہاد کا مقصد فتنہ اور فساد کو مٹانا ہے۔ لہٰذا مستشرقین کا خود جہاد کو فساد کہنا کس قدر غلط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کفار کے جن افراد سے فتنے اور فساد کا قوی اندیشہ نہ ہو۔ عین جنگ میں بھی اسلام نے ان کے قتل سے منع فرمایا ہے۔ مثلاً نابالغ بچے، عورتیں، مشائخ یعنی بوڑھے اور رہبان یعنی عبادت گذار درویش، اندھے، لنگڑے (مظہری ج ۱ ص ۳۳۶)، یہ تحقیقی جواب ہے کہ مذہب اسلام خود دین میں جبر کے خلاف ہے اور جہاد فساد نہیں بلکہ فساد کش عمل ہے جیسے ایک مملکت کے باغی افراد بھی قتل و خونریزی کرتے ہیں اور قانونِ عدل کی خلاف ورزی کرتے ہیں لیکن قانونِ عدل کی محافظ فوج جو ان باغیوں سے لڑتی ہے۔ اس کی شکل بھی قتل کی ہے، لیکن باغیوں کا قتل فساد اور وحشیانہ عمل ہے اور قانونِ عدل کی محافظ فوج کا قتل ایک مقدس فعل ہے، جو رفعِ فساد، اقامت عدل اور رفع ظلم کے لیے ہے۔

قرآن نے صاف صاف اعلان کیا کہ دین میں جبر نہیں اور سنتِ نبوی میں بھی یہ حکم دیا گیا ہے، جیسے ذکر ہوا۔ اس کے علاوہ قرآن نے مستشرقین کی غلط الزام تراشی کی تردید کے لیے بار بار اس کا اعلان کیا کہ شبہ نہ رہے۔ سورہ کہف میں فرمایا قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ کہہ دے کہ یہ حق ہے تمہارے پروردگار کی طرف سے تو جو چاہے قبول کرے اور جو چاہے انکار کرے۔ سورۃ یونس میں فرمایا۔ وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (ترجمہ) اگر تیرا پروردگار چاہتا کہ لوگوں کو

زبردستی مومن بنا دے تو زمین کے سب لوگ ایمان لے آتے ۔ اے پیغمبر! کیا تو لوگوں پر اس لیے زبردستی کرے گا کہ وہ ایمان لے آئیں۔ سورہ توبہ میں قرآن کا ارشاد ہے ۔ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ۔ اگر ان میں کوئی مشرک تجھ سے پناہ کا طالب ہو تو اس کو پناہ دے ۔ یہاں تک کہ کلام اللہ سن لے پھر اس کو وہاں اس جگہ پہنچا دے جہاں وہ بے خوف ہو ۔ یہ اس لیے کہ یہ بے علم لوگ ہیں۔ اس میں یہ نہیں فرمایا کہ "اسلام یا تلوار" تاکہ جو کلام الٰہی اس نے سنا ہے اس پر غور کر کے صحیح رائے قائم کرے ۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ خدائے قرآن کا منشا یہ ہے کہ ایمان کا محرک تلوار نہ ہو بلکہ پر امن حالت میں غور و خوض ہو ۔ ایسی بہت سی باتیں ہیں ، لیکن منصف کے لیے اتنا بھی کافی ہے اس ضروری اسلحہ بندی سے مستشرقین نے جبری تبلیغ کا پہلو نکالا اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان واضح تصریحات کے باوجود مستشرقین کو یہ غلط فہمی کہاں سے پیدا ہوئی کہ انہوں نے یہ الزام لگایا کہ اسلام بزور شمشیر پھیلایا گیا ۔ اس کا جواب تو یہ ہے کہ اکثر مستشرقین نے قصداً دیدہ دانستہ سیاسی مقصد براری کے لیے ایسا کیا اور کچھ نے صاف اقرار کیا کہ اسلام صرف تبلیغ سے پھیلا ہے نہ جبر سے اور جبر کا ایک واقعہ بھی خیر القرون میں نہیں مل سکتا ۔ جیسے اس مقصد کے لیے مسٹر آرنلڈ نے "دی پریچنگ آف اسلام" کتاب لکھی ہے اور یہ دعویٰ اس نے پوری کتاب میں ثابت کیا کہ اسلام جہاں جہاں پھیلا تبلیغ کے اثر سے پھیلا ، لیکن ایک گروہ غلط فہمی کا شکار ہوا جس کے اسباب غلطی حسب ذیل امور ہیں ۔

۱۔ دورِ اول میں عرب میں تبلیغی جماعتیں جہاں جاتی تھیں مسلح ہو کر جاتی تھیں ۔ اس مسلح جانے سے ان خود غرض مستشرقین نے یہ سمجھا کہ یہ مسلح مبلغین تلوار کے زور سے تبلیغ اسلام کرتے تھے حالانکہ ایسا قطعاً نہ تھا بلکہ ایسے واقعات عرب کے ملک میں اس لیے پیش آتے کہ وہاں کوئی منظم حکومت نہ تھی ۔ مختلف قبائل عرب نے اپنے اپنے سرداروں کی قیادت میں الگ الگ ریاستیں قائم کر رکھی تھیں ۔ لوٹ کھسوٹ ان کا ذریعہ معاش تھا ۔ راستے میں بھی ڈاکو

کا خطرہ رہتا ہے۔ اس کے علاوہ مبلغین حضرات مختلف قبائل کے افراد ہوتے تھے وہ جن قبائل سے گذرتے تھے یہ احتمال ہو سکتا تھا کہ مبلغین کے قبائل کے ساتھ اِن کی عداوت ہو اور وہ ان سے انتقام لینے کا قصد کریں ان سب کے علاوہ عرب کی عام عادت یہ تھی کہ حفاظت خود اختیاری کے لیے مسلح سفر کرتے تھے۔ لہٰذا اس اسلحہ بندی کو جبرِ دین سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اکثر اوقات مبلغین کی تعداد بہت کم ہوتی تھی اور جس قبیلے میں مبلغین جاتے تھے اُن کی تعداد بہت زیادہ ہوتی تھی۔ اگر مقصود اسلام پر جبر کرنا ہوتا تو اُس کے لیے مبلغین کی یہ قلیل تعداد کیونکر کافی ہو سکتی تھی۔

۲۔ غلط فہمی کی دوسری بڑی وجہ میدان جنگ کا وہ پیغام امن ہے جس سے خونریزی مل جاتے اور امن و مصلحت قائم ہو حضور علیہ السلام سرداران فوج کو یہ حکم دیتے تھے جب تم مشرکوں اور دشمنوں کے مقابل ہو تو ان کو تین باتوں میں سے کسی ایک بات کے قبول کرنے کی دعوت دو ان میں جو بات بھی وہ مان لیں تو اُن کے ساتھ لڑائی کرنے سے رُک جاؤ اوّل اسلام کی دعوت دو اگر وہ قبول کریں تو پھر رُک جاؤ اور ان سے خواہش کرو کہ مسلمانوں کے ملک میں آجائیں تو اُن کا وہی حق ہو گا جو مسلمانوں کا ہے۔ اگر وہ نہ مانیں تو ان کی حالت بدو مسلمانوں کی سی ہوگی۔ قانون اِن پر مسلمانوں کا جاری ہو گا لیکن غنیمت اور فے میں ان کا حصہ نہ ہو گا جب تک وہ جہاد میں شرکت نہ کریں اگر اسلام قبول نہ کریں تو ان کو جزیہ دے کر ذمی بننے کو کہہ دیا جائے۔ اگر اس کو وہ مان لیں تو ان سے بھی رُک جاؤ اگر وہ اس کو نہ مانیں تو پھر خدا کی مدد مانگ کر لڑائی شروع کرو (مسلم کتاب الجہاد و السیر) اس سے اہل یورپ نے یہ سمجھا کہ میدان جنگ کے بغیر بھی مسلمان ہر غیر مسلم کو جبراً مسلمان کرتا تھا خواہ ذمی ہو یا معاہد ہو یا تارکِ جنگ۔

۳۔ غلط فہمی اس حدیث کے عدم فہم سے واقع ہوئی جس میں ارشاد ہے امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ فاذا قالوھا عصموا منی دماءھم واموالھم (ترجمہ) میں مامور ہوں کہ

لوگوں سے لڑوں اس وقت تک کہ توحید کا اعتراف کریں۔ جب یہ اعتراف کریں تو میری طرف سے ان کی جان و مال محفوظ ہو وے۔ اس سے مستشرقین نے یہ غلط نظریہ بنایا کہ مسلمان تلوار ہاتھ میں لے کر گھومتا ہے اور کافر سے یہ کہتا ہے کہ اسلام لاؤ ورنہ تمہارے لیے تلوار ہے ہم آیات واحادیث سے اس کی تردید کر چکے ہیں حدیث مذکور کا تعلق میدان جنگ سے ہے کہ جب عین دوران جنگ میں کوئی کافر لا الہ الا اللہ کہہ دے تو رک جاؤ اگرچہ جان بچانے کے لیے کہے اور دل سے نہ کہے۔ اسامہؓ نے جب ایک شخص کے متعلق یہ عذر پیش کیا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ کیا تو نے اس کا دل چیرا تھا۔ ہم پوچھتے ہیں کہ اگر مستشرقین کا یہ متعصبانہ بلکہ مجنونانہ الزام درست ہوتا تو بدر کے قیدی جب گرفتار ہو کر آئے تو ان سے یہ کیوں نہ کہا گیا کہ اسلام یا تلوار اور قرآن نے یہ حکم کیوں نازل کیا۔

فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً "یعنی قیدیوں پر احسان رکھ کر مفت چھوڑ دو یا فدیہ لیکر چھوڑ دو۔"

فتح مکہ میں جو تقریباً دس ہزار کفار قیدی پیش ہوئے تو یہ فرمایا گیا لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ "میں تمہارے اعمال پر تم کو ملامت نہیں کرتا۔ بلکہ تم آزاد ہو" اور یہ کیوں نہ کہا گیا کہ اسلام یا تلوار۔ ثمامہ رئیس یمامہ جب قید ہو کر آیا تو اس کو کچھ نہ کہا گیا۔ اس نے خود غسل کیا اور اسلام لایا اور حضور علیہ السلام نے اسے یہ کیوں نہ فرمایا کہ "اسلام یا تلوار" خداوند تعالیٰ کا یہ ارشاد وَاِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (انفال) اگر کفار کا محارب فریق صلح کے لیے جھک جائے تو تم بھی جھک جاؤ اور یہ کیوں نہ فرمایا گیا کہ اسلام یا تلوار لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ

تم کو اللہ ان کفار کے متعلق جو تم سے دین کی وجہ سے نہیں لڑے اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالا اس سے نہیں روکتا کہ ان کفار سے تم احسان کرو اور ان کافروں سے منصفانہ سلوک کرو۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ ان کافروں سے ایسا کیوں نہ کہا گیا کہ

کہ اسلام لاؤ ورنہ تلوار ہے۔ سورۃ نساء میں خدا کا حکم قرآنی ہے۔ فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا (اگر وہ کفار تم سے کنارہ کریں۔ پھر نہ لڑیں تمہارے سامنے صلح کا پیغام ڈالیں تو اللہ تعالیٰ نے تم کو ان پر حملہ کرنے کی راہ نہیں دی ہے۔ قرآن حکیم اسی قسم کے مضامین سے پُر ہے۔ جس سے یورپ کے اس مجنونانہ و متعصبانہ غلط الزام کی تردید ہوتی ہے۔ عاقل کے لیے اسی قدر کافی ہے۔ مناسب تو یہ تھا کہ یورپ والے اسلام کے ان احکام کو دیکھ کر اسلام کا احسان مانتے کہ اسلام کے رحیمانہ اور مہذبانہ قانون میں عین جنگ کے شعلوں کے دوران دشمنوں کو وہ رعاتیں دی ہیں جنکی کسی مذہب اور خاص کر بائبل میں نظیر نہیں ملتی مثلاً دورانِ جنگ میں سول آبادی میں بوڑھے، عورتیں، تارک الدنیا اور درویش افراد پر ہاتھ اٹھانا اور ان سے لڑنا منع ہے۔ عین جنگ میں صلح کی پیش کش اگر دشمن کرے تو جنگ رک جائے گی آتشیں آلات سے مارنا منع ہے (لاتعذبوا بعذاب النار) آگ کے عذاب سے کسی کو عذاب نہ دو۔

۴۔ چہارم سبب، جہاد اسلامی کے حقیقی مفہوم کے سمجھنے میں مسیحی یورپ کی غلط فہمی ہے۔ جہاد عربی لفظ ہے۔ جس کے لغوی معنی کسی مقصد کے لیے جدوجہد کرنے ہیں اور اسلام اور قرآن وسنت کی اصطلاح میں اس مالی وجانی وقولی جدوجہد کا نام ہے جو فی سبیل اللہ ہو۔ سبیل النفس یا سبیل القوم یا سبیل الوطن کی آمیزش سے پاک ہو، وہ جہاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن وسنت نے جہاد کو اکثر مواضع میں جو ذکر کیا تو ذات خداوندی کی طرف نسبت کر کے ذکر کیا ہے وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ "پوری کوشش کرو اللہ کی راہ میں جیسے اس کا تقاضا ہے" ابوداؤد کی حدیث ہے وَجَاهِدُوا بِأَنْفُسِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ وَأَلْسِنَتِكُمْ خدا کی راہ میں اپنے نفسوں، مال اور زبان سے کوشش کرو اب یہ معلوم کرنا چاہیے کہ سبیل اللہ کیا چیز ہے۔ سبیل اللہ، اللہ تعالیٰ کے اس بین الاقوامی اور انسانی قانونِ عادلانہ کا نام ہے جو خالص انصاف پر مبنی ہے اور جس میں کسی قوم اور ملک اور خاص نسل اور رنگ والے لوگوں کی طرف داری نہیں اور ہر جانبداری

سے پاک ہے اور سب عالم کے لیے یکساں مفید ہے وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (الانبیاء)
ہم نے آپ کو وہ قانون دے کر بھیجا جو کل عالم کے لیے رحمت ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ
عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ساری تعریف ایک خدا کو ہے جس نے قرآن اتارا اپنے خاص بندے
حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر، تاکہ تمام عالم کو ظلم کے نتائج سے ڈرائے"۔ یہی انسانی عموی
مفاد مقصد جہاد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاد کا مقصد یہ بتلایا ہے وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى
وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا جہاد کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے کافرانہ قانون کو پست کر دیا اور اللہ کا قانون عادلانہ بلند ہی
کے لائق ہے حضور علیہ السلام نے جہاد کرنے والی کی تعریف یہ کی ہے۔ من قاتل لتکون
کلمۃ اللّٰہ ھی العلیا جو اس لیے لڑے کہ اللہ کا قانون و انصاف بلند و بالا رہے۔

ظاہر ہے کہ ایسے عالمگیر قانون و انصاف جس میں اللہ، انسان اور حیوانات کے حقوق محفوظ ہوں، جب اس کی آزادی کے ساتھ اشاعت کی راہ میں ظالمانہ قوتیں حائل ہو جاتی ہیں اور اشاعت حق کی آزادی سلب کرتی ہیں۔ ان کو دور کرنے کی صورت میں حق و باطل، عدل و ظلم کا معرکہ کارزار بھی شروع ہو جاتا ہے اور قتال تک نوبت پہنچتی ہے ایسی صورت میں کبھی اہلِ باطل حق کو کچلنے کے لیے حملہ کرتے ہیں اور عہدِ نبوی کے غزوات میں اکثر ایسا ہوا۔ بدر۔ اُحد، خندق اور حنین اس کی روشن مثالیں ہیں۔ کبھی اہل باطل حق کی تباہی کے لیے تیاری کرتے ہیں تو اہل حق کو قبل از وقت مدافعت کرنی پڑتی ہے، چنانچہ غزوہ موتہ تبوک میں ایسا ہوا اور کبھی راہ حق کی اشاعت کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرنیوالی طاقتوں کو راہ سے ہٹا دیا جاتا ہے تاکہ حق کو آزادی نصیب ہو۔ ایسی صورت میں ابتدائی سرکوبی زیادہ موثر ہوتی ہے۔ عہد نبوت کے سرایا میں اکثر ایسا بھی ہوا ہے۔ اس کو آپ ابتدائی اقدام سے موسوم کر سکتے ہیں۔ لیکن مقصد وہی ہے جو عرض کیا گیا ہے سورہ انفال کے آخر میں ہے (وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ)

(ترجمہ) سب کفار قریں اللہ کے قانون عدل کے خلاف متحدہ محاذ کی صورت میں ایک

دوسرے کے دوست ہیں، اگر تم حق و عدل الٰہی کے لیے جہاد نہ کرو گے تو ساری زمین الٰہی حقوق کی بربادی یعنی فتنہ کی صورت میں پُر ہو جائیگی اور عقیدہ و عمل کی شخصی آزادی ختم ہو جائے گی۔ انسانی حقوق ظلم کے ہاتھوں پامال ہوں گے اور بڑا فساد برپا ہوگا" یہ فرق ہے دنیوی جنگوں میں اور جہاد میں، دنیوی جنگ تخریبی عمل ہے۔ جیسے ڈاکو کسی کا ہاتھ کاٹ دیتا ہے اور جہاد اصلاحی عمل ہے جیسے سرجن زہریلے پھوڑے کی وجہ سے مریض کا ہاتھ کاٹتا ہے کہ باقی بدن محفوظ ہو جائے۔ افسوس کہ مستشرقین نے مسیحی اقوام کے تباہ کن آلات جنگ اور ایٹمی آلات سے گذشتہ دو عظیم جنگوں میں اور موجودہ وقت میں ویٹ کانگ میں جو بم برسائے اور انسان حیوانات، نباتات اور عمارات تک کو تباہ کر دیا اور وہ بھی صرف شیطانی مقصد کے لیے قومی مفاد پر برتری ثابت ہو اس پر اعتراض سے خاموش ہیں۔ اگر اعتراض ہے تو اسلام کے اصلاحی معمولی عمل پر جس میں انسانیت کا عظیم تر مقصود پنہاں ہے۔ اگر اسلام میں دینی جبریت ہوتی تو ہزار سال یا اس سے زیادہ عرصہ تک عراق، مصر، شام اور ہندوستان میں اسلام نے حکومت کی، لیکن چاروں ملکوں میں بدستور عیسائی یہودی اور ہندو موجود رہے اور بڑے عہدوں پر فائز رہے اور ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا کہ کوئی مسلمان تلوار لے کر اٹھا ہو اور اس نے کسی یہودی عیسائی یا ہندو سے کہا ہو کہ "اسلام یا تلوار" برخلاف عیسائیوں کے کہ سپین اور سسلی میں مسلمانوں کی آٹھ سو سال حکومت رہی لیکن جب مسیحی اقتدار آیا تو انہوں نے مسلمانوں کا نام و نشان بلکہ قبروں تک کو مٹا دیا۔ یہی حال موجودہ ہندوؤں کا ہے کہ انہوں نے چند برسوں میں بیس لاکھ مسلمان قتل کئے، ایک کروڑ کو جلا وطن کیا اور ہر روز ان کے فنا کرنے میں مصروف ہیں، لیکن پاکستان، افغانستان اور ایران میں کسی ہندو یا سکھ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ یہ اس دورِ انحطاط میں اسلامی تعلیم کا اثر ہے جو مشاہدہ کیا جا رہا ہے کہ دین کی وجہ سے کسی پر جبر نہیں کیا جاتا نہ کسی کی حق تلفی کی جاتی ہے۔

اب ہم بائبل سے جبر و اکراہ اور مذہبی جنگوں کے متعلق مختصر حوالجات پیش کرتے ہیں

تاکہ معلوم ہو کہ جہاد اسلام سے مختص نہیں۔ بلکہ بائبل کا جہاد اسلام کے جہاد سے سخت ہے۔ (۱) تورات کتاب استثناء باب ۲۰ میں حضرت موسیٰ کو خطاب ہے کہ جب تم کسی شہر میں داخل ہوں اس کے قریب ہو تو ان کو صلح کی طرف بلاؤ۔ اگر قبول کرے تو اس کے سب رہنے والے تمہارے غلام ہوں گے۔ تم کو جزیہ دیں گے اور اگر صلح قبول نہ کرے تو تمام مردوں کو قتل کرو۔ اور عورتوں، بچوں، مویشیوں اور جو کچھ شہر میں ہے۔ خاص اپنے لئے مال غنیمت بناؤ۔ ۲۔ تورات کی کتاب عدد باب ۳۳ میں بنی اسرائیل کو خطاب ہے کہ جب تم اُردن سے گذرو اور تم کنعان میں داخل ہو تو وہاں کے تمام باشندوں کو ہلاک کرو اور تباہ کرو ان کی مسجدوں کو (۳) تورات کتاب استثنا باب نمبر ۷ میں ہے جس شہر پر جہاد کرو تو مارو ان کو یہاں تک کہ ان میں سے کوئی نہ بچے اور ان کے ساتھ کوئی معاہدہ نہ کرو اور نہ ان پر رحم کرو اسی طرح جہاد یوشع باب ۸ صفر سموئیل باب ۱۲ و جہاد داؤد باب مذکور میں ہے کہ ان کو قینچی اور چھریوں سے کاٹو ۴، ۳، ۱ رسائل کا مجموعہ ۱۸۳۹ء میں بیروت میں چھپا ہے اس میں لکھا ہے کہ رومانیکھر کلیسا نے تیس ہزار دو سو پروٹسٹنٹ عیسائیوں کو پوپ کو اپنا پیشوا نہ ماننے پر زندہ آگ میں جلایا۔

ماخوذ الجواب الفضیح اسیخ

اسراء و معراج

حضور علیہ السلام کے ایک مخصوص سفر و سیر کا نام اسراء معراج ہے۔ اس سفر کا پہلا زمینی و سفلی حصہ جو مکہ معظمہ سے بیت المقدس تک ہے۔ اُس کا نام اسراء ہے اور مسجد اقصیٰ سے عالم بالا کے آخری منزل تک کے سفر کا نام معراج ہے۔ پہلا حصہ سورہ بنی اسرائیل

کے اول میں اور دوسرا حصہ معراج کا سورہ نجم کے اوّل میں مذکور ہے۔ اس واقعہ کی تفصیلات احادیث میں مذکور ہیں زرقانی نے شرح مواہب لدنیہ میں لکھا ہے کہ واقعہ معراج کو ۴۵ صحابہؓ نے حضور علیہ السلام سے نقل کیا ہے۔

آرا مختلفہ دربارۂ معراج

اس واقعہ میں مندرجہ ذیل امور میں اختلاف رائے موجود ہے۔

(۱) معراج کا آغاز کس مکان سے ہوا۔

(۲) یہ واقعہ کس تاریخ کو پیش آیا۔

(۳) اس واقعہ کی کیفیت کیا تھی روحانی یا جسمانی منامی یا استیقاظی۔

(۴) اس سفر کی آخری حد کہاں تک تھی۔

(۱) قرآن حکیم کا بیان یہ ہے کہ سفر معراج مسجد الحرام سے شروع ہوا۔ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا وہ خدا جو ہر نقص سے پاک ہے۔ جو رات کو لے گیا اپنے خاص بندے کو مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک۔ صحیحین میں انس بن مالکؓ نے مالک بن ابی صعصعہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ آغاز سفر حطیم اور حجر سے شروع ہوا۔ حطیم اور حجر چونکہ ایک چیز ہے اور یہ مسجد الحرام میں واقع ہے لہٰذا یہ روایت قرآن کے خلاف نہیں نسائی میں ابن عباس کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آغاز سفر اُمّ ہانیؓ کے گھر سے شروع ہوا۔ بخاری میں ابوذر کی روایت فرج سقف بیتی و انا بمکہ کہ میرے گھر کی چھت پھٹ گئی اور میں مکہ میں تھا سے معلوم ہوتا ہے کہ خود حضور کے گھر سے اس سفر کا آغاز ہوا۔ واقدی کی روایت ہے کہ یہ سفر شعب ابی طالب سے شروع ہوا۔ یعنی اس درہ سے جس میں ابی طالب کا گھر تھا۔ ان تمام روایات میں کوئی اختلاف نہیں سفر کی تیاری اُمّ ہانیؓ کے گھر سے ہوئی جو شعب ابی طالب میں واقع تھا اور چونکہ حضور اس گھر میں سکونت کرتے تھے تو بہ لحاظ سکونت گویا سفر کا آغاز حضور کے مسکن یعنی گھر سے ہوا۔ اور باقاعدہ سفر مسجد الحرام سے شروع ہوا۔ اور مسجد حرام میں

بالخصوص اُس جگہ سے جو حجر اور حطیم کہلاتا ہے۔

۲۔ تعیین سال یا زمانِ معراج یہ سفر کس سال پیش آیا۔ مختار قول یہ ہے کہ معراج کا واقعہ ہجرت سے ایک سال پہلے پیش آیا یعنی نبوت کے بارہویں سال۔ نوویؒ نے فتاوی میں اس کو مختار کہا۔ اور ابن حزم کا اس پر اجماع نقل ہے۔

تعیین ماہ معراج کس مہینے میں ہوا، اس میں اگرچہ ربیع الاول۔ ربیع الآخر۔ رمضان اور شوال کے اقوال بھی موجود ہیں لیکن امام نے کتاب الروضہ میں ماہِ رجب کو ترجیح دی ہے رجب میں ستائیس رجب کی تاریخ کو ابن عبدالبر نووی۔ عبدالغنی المقدسی نے ترجیح دی ہے۔

تعیین رات اگرچہ اس میں سینچر اور جمعہ کی شب کی روایتِ ضعیفہ بھی مذکور ہے لیکن خود مختار قول یہ ہے کہ معراج کا واقعہ پیر کی رات کو پیش آیا۔ ابن اثیر اور ابن منیر نے اس کو مختار کہا ہے۔

کیفیت سفر معراج یہ سفر جسم اور روح دونوں کے ساتھ بیداری میں ہوا۔ یہی قول جمہور اہلِ اسلام، علماء اور محققین صحابہ اور تابعین کا ہے۔ اس کے خلاف بعض اہلِ الحاد نے اُس کو خواب یا روحانی واقعہ قرار دیا۔ اور اس کو حسن بصریؒ، حضرت عائشہؓ اور حضرت معاویہؓ کی طرف منسوب کیا۔ حسن بصری کی طرف انتساب کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں، البتہ حضرت عائشہ اور حضرت معاویہؓ کی روایت صحاح ستہ میں نہیں۔ سیرت ابن اسحاق میں مذکور ہے دونوں کے متعلق صحیح روایت یہ ہے کہ ثابت نہیں۔ حضرت عائشہؓ کی روایت کے متعلق روح المعانی میں مذکور ہے فانہ لم یصح عنہا کما فی البحر شاید یہ روایت درست نہیں جیسے کہ تفسیر بحر المحیط میں ہے میں کہتا ہوں کہ حضرت عائشہؓ کی روایت کی سند ان الفاظ میں مذکور ہے حدثنی بعض آلِ ابی بکر یعنی یہ روایت مجھ کو ابوبکر کے خاندان والوں سے پہنچی ہے۔ وہ شخص

جو ابو بکرؓ کے خاندان سے تھا۔ وہ مذکور نہیں تاکہ اس کو جانچا جاتے۔ راوی نے یہ روایت خود حضرت عائشہ سے نہیں سنی۔ لہذا اصول الحدیث کے قواعد کے تحت یہ روایت منقطع مجہول اور مردود ہے۔

حضرت معاویہؓ کی روایت :۔ حضرت معاویہؓ کی روایت کی سند سیرۃ ابن اسحاق عن یعقوب بن عتبہ بن المغیرہ بن الاخنس یعنی امیر معاویہ سے روایت کرنیوالا راوی یعقوب بن عتبہ ہے جس کو امیر معاویہ سے نہ ملاقات ہے۔ اور نہ ہی اُس نے اُس کا زمانہ پایا ہے۔ ائمہ رجال نے لکھا ہے هُوَ لَمْ يدرك زمن معاويةؓ اس راوی نے حضرت معاویہؓ کا زمانہ نہیں پایا لہذا یہ روایت منقطع مجہول اور مردود ہوئی۔ اس لیے نہ حضرت عائشہ سے یہ ثابت ہے کہ یہ واقع خواب کا ہے اور نہ حضرت معاویہؓ سے لہذا ان حضرات کی طرف بیداری میں معراج کے سفر کا انکار غلط ہے۔

درایت :۔ درایت اور عقل کے لحاظ سے بھی حضرت عائشہؓ اور حضرت معاویہؓ کے واقعہ معراج کی بیداری کا انکار غلط ہے واقعہ معراج بالاتفاق ہجرت سے قبل کا ہے۔ اور کم از کم ایک سال ہجرت سے پیشتر کا ہے۔ اس وقت حضرت عائشہؓ صغیرۃ السن اور بچی تھی اور حضورؐ کی زوجیت میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ حضرت معاویہؓ معراج کے وقت مشرف بہ اسلام نہ ہوئے بلکہ واقع معراج سے آٹھ نو سال بعد مشرف بہ اسلام ہوتے۔ لہذا معراج کے واقعہ میں ان صحابہ کی روایت ہی صحیح ہے جو اس واقعہ کے وقت بڑی عمر کے تھے اور مشرف بہ اسلام تھے اور خود حضور علیہ السلام سے جو صاحب واقعہ تھے انہوں نے واقعہ کی حقیقت سنی تھی وہ سب روایت صاف دلالت کرتی ہیں کہ واقع بیداری اور جسمانی کی شکل میں پیش آیا۔ نیز رویت باری کے متعلق حضرت عائشہؓ کا انکار و استدلال جو صحیحین میں مذکور ہے اس امر کی دلیل ہے کہ حضرت عائشہ اس سفر کا بیداری اور جسمانی صورت میں ہونے کے قائل تھی صرف آنکھ کے ذریعے اللہ کو دیکھنے میں متردد تھی ورنہ خواب میں خدا کے دیکھنے کا

کون انکار کر سکتا ہے۔

اہل الحاد کے استدلال رویا پر بحث :۔ حدیث شریف اناہین النائم والیقظان یا بروایۃ فاستیقظ، کہ میں نیند اور بیداری کی حالت میں تھا یا کہ پھر حضور جاگے اس کا جواب اوّلاً یہ ہے کہ شریک راوی کثیر الغلط ہے۔ اور محدثین نے اس روایت میں اس کی غلطی کی تصریح کی ہے کہ اس نے اپنے بیان میں بے ترتیبی کی ہے دوم یہ ہے کہ امام قرطبیؒ نے اسی حالت کو ابتداء پر محمول کیا کہ جب سفر معراج کے لیے تشریف لے جانے لگے تو آپ نیند اور بیداری کی درمیانی حالت میں تھے پھر بیدار ہوتے۔ یا محدثین کے نزدیک انتہائے سفر پر محمول ہے جب حضور علیہ السلام نے سفر معراج طے کیا اور واپس مسجد حرام تشریف لائے تو تھکان کی وجہ سے سو گئے۔ پھر بیدار ہوتے۔ اس تطبیق کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ عام مشہور روایات جو اس سفر کی بحالت بیداری جسمانی طور پر ہونے پر دال ہیں۔ یہ روایت ان کے مطابق ہو جائے۔ ورنہ شریک راوی کی روایت کو غلطی پر محمول کرنا پڑے گا کہ اس نے ابتدا سفر یا انتہا سفر کی حالت کو درمیانی واقعہ میں بیان کیا ہے اسی طرح قرآن پاک کی آیت وماجعلنا الرؤیا التی اریناک الا فتنۃ للناس والشجرۃ الملعونۃ فی القرآن کہ ہم نے نہیں کیا اس دکھاوے کو جو آپ کو دکھایا اور برا درخت مگر لوگوں کے ایمان کے امتحان کے لیے اہل زیغ والحاد نے جس طرح شریک کی مخلوط روایت سے استدلال کیا۔ اسی طرح اس آیت سے بھی استدلال کیا کہ قصہ معراج منامی واقعہ ہے کیونکہ معراج کے واقعے کے لیے آیت مذکور میں لفظ رویا استعمال کیا گیا ہے جو خواب کے معنی میں آتا ہے۔ یہ استدلال بھی غلط ہے اس وجہ سے کہ یہ لفظ دکھاوے کے معنی میں عربی زبان میں استعمال ہوتا ہے۔ خواہ خواب میں دیکھا ہو یا بیداری میں۔ امام لغت صاحب قاموس نے تصریح کی ہے کہ لفظ رویا جسم کی آنکھ سے دیکھنے کے معنی میں آتا ہے۔ نیز شعراء قدیم میں سے روعی نے رویا کو آنکھ سے دیکھنے کے معنی میں استعمال کیا ہے وہ شکاری کی تعریف کر کے لکھتا ہے۔

وكَبَّرَ لِلرُّؤْيَا وَهَشَّ فُؤَادُهُ — وَبَشَّرَ قَلْباً كَانَ جَمّاً بَلَابِلُهُ

شکاری نے شکار کو دیکھ کر اللہ اکبر کہا اور اس کا دل خوش ہوا اور ایسے دل کو خوشخبری سنائی جس کی پریشانیاں بہت تھیں۔ اس شعر میں جسمانی طور پر دیکھنے کے لیے لفظ رویا کو استعمال کیا گیا ہے متنبی شاعر نے بھی اسی معنی میں رویا کو استعمال کیا وہ اپنی ممدوح بدر کی تعریف میں کہتے ہیں سہ

مَضَى اللَّيْلُ وَالْفَضْلُ الَّذِي لَكَ لَا يَمْضِي — وَرُؤْيَاكَ أَحْلَى فِي الْعُيُونِ مِنَ الْغَمْضِ

رات ختم ہوتی اور تیری خوبی ختم نہیں ہوتی تیرا دیکھنا آنکھوں میں نیند سے زیادہ شیریں ہے یہاں لفظ رویا بیداری کے معنی میں استعمال ہوا۔ ان دلائل سے قطع نظر اگر رویا خواب اور بیداری دونوں حالتوں کے دیکھنے کے لیے مشترک ہے۔ تو خود قرآن نے اس کا بیداری کی حالت میں دیکھنے کا معنی متعین کر دیا کہ قرآن نے اس دکھاوے کو جو حضور علیہ السلام نے معراج میں دیکھا فتنۃ للناس کہہ کر ایمان کا امتحان قرار دیا اور بموجب روایات اہل مکہ امتحاناً حضورؐ سے بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کے احوال دریافت کیے اگر یہ خواب کا واقعہ ہوتا۔ تو اس میں نہ فتنہ تھا اور نہ ایمان کا امتحان اور نہ دریافت کی ضرورت۔ خواب میں تو اس سے بڑے واقعات بھی قابل تعجب نہیں۔ معلوم ہوا یہ واقعہ بیداری کا تھا۔

قرآن سے جسمانی معراج کا ثبوت

قرآن کریم نے سورہ بنی اسرائیل میں واقعہ معراج کو اس انداز میں بیان کیا ہے کہ جس سے معراج کا جسمانی ہونا خود بخود واضح ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ابتدا سفر سے لے کر انتہائے سفر تک ایک جیسی حالت تھی۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس واقعہ کا کچھ حصہ جسمانی طور پر بیداری میں ہو کچھ روحانی ہوا اور خواب ہو۔

سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى الَّذِي بَارَكْنَا حَوْلَهُ لِنُرِيَهُ مِنْ آيَاتِنَا إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ

اس قرآنی آیات میں جسمانی معراج کے ثبوت حسب ذیل ہیں واقعہ کا آغاز لفظ سبحانُ سے ہوا جو تعجب کے لیے اور اظہارِ قدرت کے لیے استعمال ہوتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ معراج تعجب انگیز بھی ہے اور ظہورِ قدرت خداوندی کی نشانی بھی ہے اور یہ اس صورت میں ممکن ہے کہ واقعہ معراج جسمانی ہو خواب نہ ہو کیونکہ خواب کیسا بھی ہو اس میں اللہ کے اعتبار سے تعجب انگیزی ہے اور نہ اسکی عظیم قدرت کا ظہور ہے

بعبدہٖ کے لفظ میں ظاہر کیا گیا ہے کہ واقعے کا تعلق جسم اور روح دونوں سے ہے کیونکہ عبد روح وجسد دونوں کے مجموعے کا نام ہے۔ نہ صرف روح کا ورنہ خدا یوں فرماتا اَسْرٰی بِرُوْحِہٖ لفظ عبد عبادت سے ماخوذ ہے اور عبادت جسم اور روح کے مجموعے سے متعلق ہے جیسے سورہ جن میں حضور علیہ السلام کے بارے میں آیا ہے وَاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ یا سورہ اقرأ میں اَرَاَیْتَ الَّذِیْ یَنْهٰى عَبْدًا اِذَا صَلّٰى عبد میں حضور علیہ السلام کا مجموعہ روح وجسد مراد ہے اسی طرح تمام قرآن میں جہاں کہیں لفظ عبد آیا ہے۔ روح وجسم کے مجموعے کے لیے استعمال ہوا تو واقعہ معراج میں بھی وہی معنی مراد ہے۔

تیسری وجہ لفظ اسرا ہے جو قرآن اور لغت روح وجسم کے مجموعے کو رات کے وقت لے جانے کا نام ہے۔ جیسے حضرت لوط علیہ السلام کو قرآن کا ارشاد ہے فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ آپ اپنے اہل کو رات کے وقت لے چلو نہ یہ کہ اُن کی روح کو لے چلو اسی طرح حضرت موسٰی علیہ السلام کو خدا کا حکم ہوا اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْۤ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ اے موسٰی میرے بندوں کو رات کے وقت لے چلو۔ یقیناً تمہارا تعاقب کیا جائے گا۔ اِن دونوں آیتوں میں وہی لفظ آیا ہے جو واقعہ معراج کے بیان میں آیا ہے یعنی اسریٰ کا لفظ لیکن دونوں جگہ جسمانی سیر مراد ہے نہ کہ خواب یا روحانی سیر۔ اسی طرح واقعہ معراج کو بھی سمجھنا چاہیے "واقعہ معراج پر عقلی بحث" اس واقعہ پر عقلاً چند شبہات پیش کیے جا سکتے ہیں۔

۱۔ کہ اس واقعہ کا مقصد اگر خدا کو دیکھنا تھا۔ تو اس سفر کے بغیر بھی ممکن تھا۔ سفر کرنے کی

کیا ضرورت تھی۔ جواب اولاً یہ ہے کہ قرآن نے خود مقصد سفر بیان کیا ہے لِنُرِيَهُ مِنْ آيَاتِنَا
کہ اس سفر کا مقصد عالم بالا کی اشیاء کو دکھانا ہے۔ جن کے دیکھنے سے اللہ کی عظیم قدرت
کا ظہور ہوتا ہے۔ مثلاً عرش، قلم، لوح محفوظ۔ سدرۃ المنتہیٰ جنت وغیرہ۔
۲۔ یہ کہ عالم بالا جو گناہوں سے پاک ہے اور عجائبات قدرت کا محل ہے۔ وہاں لے جانے
میں خاتم الانبیاء علیہ السلام کے اعزاز و اکرام کا ظہور ہے۔

دوسرا شبہ یہ ہے کہ اس سفر میں حرو قر یعنی گرمی و سردی سے حفاظت کا کیا انتظام
تھا اس کا جواب یہ ہے کہ بے بس انسان نے جب ایئر کنڈیشن کے ذریعے گرمی سردی کا انتظام
کیا تو قادر المطلق اور خالق کائنات کے لیے یہ کیوں ناممکن ہے جس کے ارادے کے آگے
تمام قوانین طبعیہ زیر فرمان اور مسخر ہیں۔ محققین یورپ نے تصریح کی ہے کہ جس ذات
نے قوانین طبعیہ بنائے ہیں اُن میں اس کو مداخلت اور تبدیلی کا بھی حق حاصل ہے۔
ہم نے ان کے مکمل حوالہ جات اپنی دوسری تصنیفات میں لکھے ہیں اور کسی قدر میری
کتاب علوم قرآن میں بھی موجود ہیں۔

تیسرا شبہ یہ ہے کہ ایسا طویل سفر تھوڑے وقت میں کیونکر ممکن ہو سکتا ہے اس
شبہ کے جوابات حسب ذیل ہیں۔
۱۔ فلسفہ قدیم و جدید اس بات پر متفق ہیں کہ حرکت کی تیزی اور سرعت کے لیے عقلاً کوئی
حد مقرر نہیں کی جا سکتی۔ جس زمانے میں جس قدر حرکت ممکن ہے اس زمانے کے کروڑویں
حصے میں بھی وہ حرکت ممکن ہے۔ اسی بنا پر سرعت حرکت معراجیہ پر شبہ کرنا اور اس
کو ناممکن قرار دینا دونوں فلسفوں کے خلاف ہے۔ البتہ مشاہدہ میں ایسی تیز حرکت نہ آنے
کی وجہ سے تعجب انگیز ضرور ہے۔ جیسے جدید تیز رفتار میزائل قبل از مشاہدہ پہلے زمانہ میں محل
تعجب تھے۔

۲۔ اس سفر میں جو سواری استعمال ہوئی جس کو براق کہا جاتا ہے۔ اور برق اور بجلی کی تیز

رفتار ضرب المثل ہے پھر براقیت کے بھی مختلف درجات ہیں اگرچہ عالم سفلی کی بجلی ہو لیکن اگر یہ براقیت عالم علوی کی ہو جنکی قوت ماورائے عقل ہے تو اس کی سرعتِ رفتار بے نظیر ہوگی بالخصوص جب کہ حدیث کے مطابق حد نگاہ کی دوری اس کے لیے ایک قدم تھا۔

۳۔ اس سواری کا اولاً شوخی کرنا اور پھر جبرائیل کے بتلانے پر شرم وحیا کی وجہ سے پسینہ پسینہ ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ یہ سواری صاحب عقل تھی۔ اگرچہ عقل کو خدا ہر ایک چیز میں پیدا کر سکتا ہے بلکہ ہر چیز میں کسی قدر عقل ہے، جیسے كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ کائنات کی ہر چیز اپنی دعا و تسبیح کو جانتی ہے بجائے معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ ملکی قوت کو اس سواری کی شکل میں متشکل کر دیا گیا ہو۔ اور یہ سواری ملکی قوت کا مجسمہ ہو اور ملائکہ کے لیے یہ مسافت طے کرنا ایک لمحے کا کام ہے۔

۴۔ شاہ ولی اللہ اور دیگر محققین صوفیہ کے بیان کے مطابق جسم پر بعض وقت روح کے احکام غالب آجاتے ہیں۔ جب کہ روح زیادہ پاک اور لطیف ہو ایسی صورت میں جسم اپنا ثقل چھوڑ کر تابع روح بن جاتا ہے خود اس احقر کا ایک فاضل متقی مرید کو دوران ذکر یہ حالت پیش آئی۔ یہاں تک کہ جسم کا ثقل اور دباؤ ختم ہوا اور وہ چارپائی جو پہلے بیٹھنے سے دبتی تھی اس حالت کے بعد چارپائی نہیں دبتی تھی۔ اس مضمون کو صدر شیرازی نے اسفار اربعہ میں مدلل بیان کیا ہے تو حضور علیہ السلام کی روح جو افضل الارواح ہے اس کے بھی احکام بدن حضور علیہ السلام پر غالب آئے اور جس طرح روح کے لیے ملائکہ کی طرح تھوڑے وقت میں عالم بالا کو پہنچنا آسان ہے۔ حضور علیہ السلام کے لیے بھی واقعہ معراج میں ایسا ہوا۔

۵۔ قدیم فلسفہ میں پتھر کا اوپر سے زمین پر جلد پہنچنا میلان مرکز کا نتیجہ ہے اور جدید فلسفہ میں کشش زمین کا نتیجہ ہے۔ تو یہ بھی ممکن ہے کہ واقعہ معراج میں روح محمدی کی بوجہ

کشش عرش یا کشش الٰہی کے دفعتہً عالم بالا میں پہنچنے کی نوبت آتی ہو۔ اور سواری صرف اعزاز واکرام کے لیے ہو یا دونوں چیزوں کو دخل ہو۔

۶۔ احادیث صحیحہ میں روانگی سفر معراج سے قبل حضور علیہ السلام کا شق صدر کیا گیا۔ اور سینہ آپ کا چیر کر اس میں عالم علوی کی کوئی چیز ڈالدی جس سے آپ کی روحانی قوت میں اضافہ مقصود تھا۔ اور آپ کی ذات میں اس عجیب سفر کے لیے قابلیت اور استعداد پیدا کرکے وہ قوت عطا کرنی بھی مقصود تھی جو ملائکہ کو حاصل ہے تاکہ تھوڑے وقت میں ملائکہ کی طرح یہ سفر آسانی طے ہو سکے۔ اگرچہ یہ قوت ملکی آپ کے لیے وقتی ضرورت کے تحت ہو اور ملائکہ کے لیے دائمی۔ کیونکہ ان کی آمدورفت کی ضرورت عالم بالا کو دائمی ہو۔

۷۔ روح محمدی جو الطف الاشیاء ہے۔ اس کا ایک رات میں جسم پر اثر ڈال کر ایک رات میں طویل سفر کرنا اسکی نظیر لطیف اشیاء میں موجود ہے۔ سورج کی شعاع نو کروڑ ۳۰ لاکھ میل چند سیکنڈ میں طے کرکے زمین پر پہنچتی ہے۔ ہماری آنکھ کی شعاع رات کے وقت ایک لمحہ میں کھربوں میل مسافت طے کر بعید ترین ستاروں تک پہنچتی ہے۔

باب پنجم

اسلام کی عالمگیری اور جامعیت

انسانی فطرت تمام اقوام میں بلاتخصیص نسل و وطن عالمگیر ہے کوئی قوم اور کسی ملک کا انسان خواہ
ـپ کا ہو یا ایشیا کا ، افریقہ کا ہو یا امریکہ کا ایسا نہیں جس میں انسانی فطرت اور اس کے
ـوازمات موجود نہ ہوں ۔ مذہب چونکہ فطرت انسانی کی تکمیل اور سعادت کے لیے آیا ہے. لہذا
ـروری ہوا کہ انسانی دین بھی انسانی فطرت کی طرح عالمگیر ہو ۔ اور یہی دین کے عالمگیر ہونے
ـمطلب ہے۔

دینی عالمگیری کی دو قسمیں ہیں

عالمگیر دین کی دو قسمیں ہیں حقیقی اور مصنوعی
حقیقی عالمگیری اس کا نام ہے کہ دین عالمگیر
ـود مدعی عالمگیری کا ہو اور اس دین کے اصول بھی عالمگیر ہوں یعنی خود دین میں بھی یہ دعویٰ
ـور اعلان موجود ہو کہ وہ عالمگیر ہے اور کسی قوم سے مختص نہیں اور اس دین کے اصول بھی
ـیسے ہوں کہ فطرتِ انسانی بلاتخصیص وطن و قوم اس کو قبول کرتی ہو اور انسانی عقل میں
اس کی طرف انجذاب اور کشش موجود ہو۔ بشرطیکہ عقل و فطرت انسانی کسی بیرونی ناپاکی
ـسے آلودہ نہ ہو۔ اس معنی میں حقیقی عالمگیری ادیانِ عالم میں صرف اسلام کو حاصل ہے. باقی
ـمذاہب بدھ مت ، کنفیوشس ـ تاؤ مت ، شنٹو مت ہندو مت کسی معنی میں بھی عالمگیر نہیں
ـکنفیوشس مت چین کی اکثریت کا مذہب ہے اور شنٹو مت ، جاپان کی اکثریت کا ۔ اور ہندو مت
ـبھارت کی اکثریت کا ، اور بدھ مت اور تاؤ مت چین و جاپان کی اقلیت کے مذاہب

ہیں۔ اس میدان میں اگر اسلام کا کوئی مدِمقابل مذہب ہے تو وہ صرف مسیحیت ہے یہودیت بھی صرف خاندان اسرائیل کا مخصوص مذہب ہے لیکن اسلام اور مسیحیت میں آگے چل کر یہ فرق واضح ہو جائے گا کہ اسلام حقیقی عالمگیر مذہب ہے اور مسیحیت کی عالمگیری مصنوعی ہے اور جو فرق اصل و نقل میں ہوتا ہے وہی فرق اسلام اور مسیحیت میں ہے اصلی گھوڑا اور مصنوعی گھوڑا دونوں برابر نہیں ہوسکتے اور نہ ہی مصنوعی گھوڑے پر وہ آثار و نتائج مرتب ہوسکتے ہیں جو اصلی گھوڑے پر مرتب ہوتے ہیں لہٰذا تکمیل انسانی اور سعادت و فلاح بشریت کے بہترین نتائج سے مسیحیت محروم ہے۔ اس کے برخلاف تاریخ کے ہر دور میں اسلام ان عمدہ اور بہترین نتائج کا حامل رہا ہے جن کا خود غیر مسلم مؤرخین نے بھی بادل ناخواستہ اعتراف کیا ہے ہم صرف چند حوالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔

انگلستان کا مشہور مؤرخ گبن تاریخ سلطنت روما کی پانچویں جلد کے پچاسویں باب میں لکھتا ہے۔ کہ "شریعت اسلام ایسے دانشمندانہ اصول اور اس قسم کے عظیم الشان قانونی انداز پر مرتب ہوئی ہے کہ سارے جہاں میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔" ——— مسٹر کارلائل لکھتے ہیں "شریعت اسلام کے قوانین و ضوابط کا لوہا آج بھی بایں ہمہ ترقی و حکمت دنیا ماننے پر مجبور ہے۔"

——— مسٹر ڈی رائٹ مشہور نامہ نگار انگلستان لکھتے ہیں: "تاریخ انسانی میں کسی ایسے شخص کی مثال موجود نہیں کہ جس نے احکام خداوندی کی اس مستحسن طریقہ سے انجام دیا ہو جس میں پیغمبر اسلام نے دیا ہے۔"

حقیقی عالمگیری دین کی شناخت کا صحیح معیار

دین عالمگیر کی معرفت کے لیے عقلاً حسب ذیل معیار ہو سکتے ہیں۔

پہلا معیار یہ ہے کہ خود اس دین میں عالمگیر ہونے کا دعویٰ موجود ہو۔ یعنی خود دین یہ اعلان کر دے کہ وہ عالمگیر ہے ایسا نہ ہو کہ دین خود کسی خاص قوم کے لیے مختص ہونے کا اقرار کرے۔ یا کم از کم بین الاقوامی اور عالمگیر ہونے سے خاموش ہو اور اس دین کے ماننے والے کسی مصلحت کے تحت اس کے عالمگیر ہونے کا دعویٰ کر دیں اس صورت میں مدعی سست گواہ چست والا معاملہ ہو جائے گا جو کسی عدالت میں قابل پذیرائی نہیں۔

۲۔ دوسرا معیار یہ ہے کہ اس میں خالق کائنات کا خالص توحیدی تصوّر موجود ہو جو فطرتِ کائنات کے مطابق ہے کیونکہ نظم کائنات اور قوانینِ فطرت میں یکسانیت و وحدت موجود ہے جو سائنس کے قوانین کی بنیاد ہے اگر اشیاء کے خواص میں یگانگت نہ ہوتی اور وہ روز بدلتے یا کسی وقت میں کچھ اور دوسرے وقت میں کچھ اور ہوتے تو سائنس کی ترقی ختم ہو جاتی اور قوانین قدرت میں سے کسی قانون پر اعتماد باقی نہ رہتا اور نہ اس سے استفادہ ممکن ہوتا۔ نظم کائنات کی یہ وحدت ناظم کائنات کی وحدت کی دلیل ہے۔ اسی بنا پر کوئی ایسا دین عالمگیر کہلانے کا مستحق نہیں جس میں خالق کائنات کا خالص توحیدی تصور موجود نہ ہو بلکہ اس میں شرک کی آمیزش ہو۔ جیسے مسیحی دین ہے۔

۳۔ انسان فطرتاً دین و دنیا روح و جسم دونوں کے ساز و سامان کا محتاج ہے۔ اس لیے وہ دین عالمگیر ہوگا جس نے دین و دنیا، روح و مادہ دونوں کے فوائد کو جمع کیا ہو اور دونوں کو حاصل کرنے کی ترغیب دی ہو۔

۴۔ وحدتِ حق، حق فطرتاً ناقابل تقسیم نہیں اور نہ کسی زمان و مکان یا قوم سے مختص ہے مثلاً دو دونی چار حق ہے ہر ملک اور ہر زمانے میں یہی حق رہے گا۔ آسمانی حق جو انسانوں تک بذریعہ انبیا علیہم السّلام پہنچا ہے وہ اصولی طور پر ایک ہے اور اس کے لانے والے رسل و انبیا سب کے سب حق پر تھے لہٰذا فطرت انسانی کا تقاضا

یہ ہے کہ دینِ عالمگیر میں اس امر کی قطعاً گنجائش نہیں کہ بعض انبیاء کو تسلیم کیا جائے اور بعض کا انکار کیا جائے اگر کوئی دین ایسا ہے جس میں تفریق بین الرسل ہو وہ فطری اور عالمگیر دین نہیں ہو سکتا۔

۵۔ وحدت نسبت و مساوات انسانی : انسان کو خالق کائنات کے ساتھ عمومی نسبت ایک ہے اور وہ نسبت ہے خالق اور مخلوق کی اور عبد اور معبود کی یعنی خالق کائنات سے کسی خاندان یا قوم کا بجز عبدیت کے اور کوئی رشتہ نہیں سب یکساں طور پر اس کے بندے اور مخلوق ہیں لہٰذا جو کچھ فرق مراتب ہوگا وہ عبدیت کی بنیاد پر ہوگا۔ اطاعت کی اساس پر ہوگا نسل اور قوم کی بنیاد پر نہ ہوگا اور قانونِ عدل کی نگاہ میں سب مساوی ہوں گے۔

۶۔ قوۃ اصلاح : بدن کے علاج کے لیے وہی دوا استعمال کی جاتی ہے جس میں اصلاح مرض کی تاثیر موجود ہو اور جس قدر وہ تاثیر قوی ہوتی ہے وہ مقبول عام بن جاتی ہے اور عالمگیر صورت اختیار کر لیتی ہے پھر جس طرح انسان کو جسمانی امراض کے لیے دوا کی ضرورت ہے اس سے زیادہ روحانی امراض کے ازالہ کے لیے اس کو روحانی دوا کی ضرورت ہے کیونکہ روح بدن کی حکمران ہے حکمران کی درستی رعیت کی درستی ہے بدن کا خمیر چونکہ زمین سے بنا ہے اس لیے اس کی دوا بھی آسمانی ہوگی جو دین الٰہی ہے دین الٰہی اور اس کی عالمگیری اس کی اصلاحی قوت سے معلوم کی جاتی ہے۔

۷۔ شانِ جامعیت : امراض جسم و روح کی قسمیں چونکہ مختلف اور متعدد ہیں اس لیے عالمگیر دین وہ ہوگا جس میں انسانی زندگی کے ہر شعبہ کی دوا موجود ہو۔ خواہ اعتقادی شعبہ ہو یا اخلاقی، معاشرتی ہو یا سیاسی۔ معاشی ہو یا معادی۔ دنیاوی ہو یا اُخروی ایسا نہ ہو کہ اس دین میں صرف چند مذہبی رسوم پر اکتفاء کیا گیا ہو۔

۸۔ معقولیت : فطرت انسانی میں ایک امتیازی وصف عقل ہے اگر کوئی دین ایسا ہو جس کے اصول عقل کے لیے قابل تسلیم ہوں تو وہ دین عالمگیر ہے ورنہ نہیں۔

۹۔ دنیا و آخرت کے درمیان صحیح ربط اور دونوں میں اعتدال

۱۰۔ دوام دین اور محفوظیت۔

معیارِ اوّل دعوائے عالمگیری:۔ آج کل مسیحی پادری اس امر پر زور دے رہے ہیں کہ مسیحیت عالمگیر ہے لیکن یہ مصنوعی عالمگیری ہے کیونکہ وہ خود اقرار کرتے ہیں کہ مسیحی دین اس لیے عالمگیر ہے کہ مسیحیوں نے انجیل اور بائیبل کی دنیا کے مختلف زبانوں میں تراجم کیے ہیں دنیا کے گوشے گوشے میں مشنری بھیجے گئے ہیں مسیحیوں کی بڑی بڑی سلطنتیں موجود ہیں جو دین مسیحی کے عالمگیر ہونے کی دلیل ہیں لیکن یہ سب امور مسیحیوں کے فعل و عمل سے وجود میں آتے ہیں جس سے مصنوعی عالمگیری تو ثابت ہو سکتی ہے لیکن حقیقی عالمگیری ثابت نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ خود دین مسیحی میں ایسا ثبوت موجود نہ ہو کہ وہ تمام انسانوں کے لیے ہے نہ صرف کسی خاندان کے لیے لیکن انجیل اس دعوے کے ثبوت سے خالی ہے بلکہ قرآن اور انجیل دونوں کی متفقہ تصریحات بتا رہی ہیں کہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام دونوں کی شریعت کا تعلق صرف خاندان اسرائیل سے تھا لیکن اس کے خلاف قرآن کا صاف اعلان ہے کہ

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ اور وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ اور يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا کہ قرآن و اسلام کسی قوم یا خاندان سے مختص نہیں۔ بلکہ وہ عالمی اور بین الاقوامی دین ہے جو ہر قوم اور ہر زمانے کے لیے ہے انسانی فطرت جس طرح عالمگیر ہے اسلام بھی اسی طرح عالمگیر ہے اسلام درحقیقت فطرت کی اصلی تصویر ہے۔

دین عالمگیر کا معیار دوم توحید خالص:۔ دین کا مرکزی نقطہ خالق کائنات کا صحیح تصور ہے اسلام نے خالق کائنات کی عظمت اور اس کی ذات وصفات وافعال کی وحدانیت کا جو اعلیٰ اور معقول تصور پیش کیا ہے اس کی نظیر کسی دین میں موجود نہیں عقل انسانی اور

فطرت بشری کے لیے خداوند تعالیٰ کے متعلق اگر کوئی تصوّر قابل قبول ہو سکتا ہے تو وہ صرف اسلامی تصوّر توحید ہے کائنات میں جو قوانین قدرت و ضوابط عمل غیر محدود زمانے سے جاری اور ساری ہیں ان میں پوری یکانگت اور کامل یکسانیت موجود ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نظام کائنات میں پوری وحدت ہے اور اس وجہ سے عقل اس یقین پر مجبور ہے کہ جس ذات کے ہاتھ میں نظام کائنات کی باگ ڈور ہے وہ ایک ہی ہے اور یہی توحید خالص انسانی عقل کا فطری و مرکزی نقطہ ہے جو صرف اسلام میں موجود ہے نہ مسیحیت وغیرہ ادیان میں۔ خالق کائنات کا یہ تصور توحید انسانیت کا عالمگیر بین الاقوامی اور بین الانبیائی عقیدہ ہے۔ وما ارسلنا قبلک من رسول الا نوحی الیہ انہ لا الٰہ الا انا فاعبدون

خدا کے متعلق مسیحی تصوّر

خدا کے متعلق مسیحی تصور یہ ہے کہ خدا تین شخصوں کا مجموعہ ہے باپ بیٹا اور روح القدس کا اور پھر جب سوال کیا جاتا ہے کہ ایک خدا میں تین شخص کس طرح ہوئے تو جواب ملتا ہے کہ تم ٹھیک نہیں سمجھ سکتے کیونکہ ایمان کا یہ ایک بھید ہے (مسیحی تعلیم ص ۳۰) کیا اس توحید در تثلیث اور تین مل کر تین ہونے کی بجائے ایک ہونے کو کوئی ایک عقلمند شخص بھی مان سکتا ہے چہ جائیکہ اس کو عالمگیر طور پر تسلیم کیا جائے۔

دوسرا عیسائی فرقہ حضرت عیسیٰؑ کو پورا خدا مانتا ہے قرآن نے اس کی تردید کی اور توحید خالص کا اعلان کیا جو تمام انبیاء علیہم السلام کا اصلی دین ہے اور تثلیث خود ساختہ اور من گھڑت دین ہے جس کو غلط طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کیا گیا ہے باوجود تحریف در تحریف کے دین فطرت کی یہ حق آواز آج تک بھی انجیل و تورات میں موجود ہے

انجیل مرقس باب ۱۲ - آیت ۲۸ - ۲۹ میں ہے یسوع نے فرمایا! اے اسرائیل سن خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے۔"

تورات، سفر استثنا باب ۶ آیت ۴ میں ہے۔ سن لے اے اسرائیل خداوند ہی ہمارا ایک خدا ہے۔

عالمگیر دین کا تیسرا معیار

"ہمہ جہتی ترقی" انسان چونکہ بدن اور روح دونوں کا مجموعہ ہے اور دونوں کی ترقی انسان کا فطری مطلوب ہے یعنی مادی اور روحانی ترقیاں یکساں مقصود ہیں کسی ایک جزو کی ترقی کامل اور صحیح ترقی نہیں بلکہ بدن سے زیادہ روح کی ترقی ضروری ہے کہ وہ بدن پر حکمران ہے اور بدن کو استعمال کرتی ہے اگر بدن ترقی یافتہ ہو اور روح غیر ترقی یافتہ تو یورپ اور امریکہ کی طرح وہ روح مادی ترقی کو اپنی ناجائز خواہشات میں استعمال کرے گی اور جوشِ تعصب نسلی و قومی کی وجہ سے انسانی کشت و خون کی وہ قیامتیں برپا کرے گی جس سے انسانیت کے لیے دنیا جہنم کدہ بن کر رہ جائے گی۔ اور دنیا سے راحت، اطمینان، چین رخصت ہو جائے گا جیسا کہ گزشتہ دو عظیم جنگوں میں دنیا نے دیکھ لیا، مسیحی دین، بدھ ازم، اور ہندومت میں سارا زور بدن کے جائز تقاضوں کو کچلنے پر صرف کر دیا گیا ہے اور دنیا سے بے تعلقی، تجرد اور ریاضات شاقہ کو دین سمجھ لیا گیا ہے جو فطرت کے خلاف جنگ ہے فطرتِ انسانی کا تقاضا نہیں کہ انسانی خواہشات کا ازالہ ہو۔ بلکہ ان کا امالہ مقصود ہے کہ ان کو صحیح محل میں استعمال کیا جائے اور غلط محل میں ان کے استعمال کو روکا جائے یہی فطری تعلیم ہے جو صرف اسلام میں ہے۔

اسلام دین و دنیا بدنی اور روحی ترقی کا جامع ہے

اسلام نے بدنی منافع و فوائد اور مادی ترقی سے گریز کو رہبانیت سے تعبیر کر کے اس کی تردید کا اعلان کیا ہے "لا رهبانية في الاسلام" اس خالص رہبانی تصور کے خلاف زندگی کا خالص مادی تصور ہے جو یورپ، امریکہ اور ان کے مقلدین کا عملی دین ہے جس میں سارا زور اس پر صرف کیا جاتا ہے کہ مادی اور بدنی خوشحالی حاصل ہو اور بس۔ روح کی بلندی اور پاکیزگی کو انہوں نے نظرانداز کر دیا ہے حالانکہ غم اور خوشی کا اصلی میدان دل اور روح ہے نہ مادہ اور بدن جس کی

سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ جدید انسان کے پاس اگرچہ مالی فوائد کا بے انتہا سامان موجود ہے لیکن خوشی اطمینان دل کا چین موجود نہیں یہی وجہ ہے کہ اس دورِ ترقی وخوش حالی میں خودکشی کے جس قدر واقعات پیش آتے ہیں انسانی دورِ غربت وافلاس کی پوری تاریخ میں اس کا دسواں حصہ بھی پیش نہیں آیا۔

اسلام نے ایک طرف، عقائد، اخلاق اور عبادات کا وہ بہترین نظام انسان کو دیا جس کی وجہ سے انسانی روح اور انسانی حیات خالق ارواح اور خالق حیات سے مکمل طور پر مربوط ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے عالم تغیر کی کوئی آفت اور بدلتی دنیا کا کوئی واقعہ اس کے اطمینان کو ڈگمگا نہیں سکتا حقیقی مسلمان درویشی میں بھی امیر سے زیادہ خوش حال ہوتا ہے کیونکہ تعلق باللہ قناعت پیدا کرتا ہے جو حقیقی غنا ہے اور تعلق بالمال سے حرص پیدا ہوتی ہے جو غربت اور محتاجی ہے غنا اور حاجت کا مرکز قلب ہے نہ مال۔

قناعت سے مراد بقول امام ربانی مجدد الف ثانی رحہ حرص دنیا کی کمی ہے کہ نہ کسی چیز کے آنے کی خوشی ہو اور نہ جانے کا غم۔ امام غزالیؒ نے فرمایا ہے خواہشات پر غالب آنا فرشتوں کی صفت ہے اور خواہش سے مغلوب ہونا حیوانیت ہے جو چوپایوں کی صفت ہے معروف کرخیؒ نے فرمایا کہ دولت کے بھوکے کو کبھی راحت نصیب نہیں ہوتی، مفلسی بھی خطرناک ہے لیکن وہ دولت مندی جس کے ساتھ ضبطِ نفس نہ ہو وہ غریبی سے بھی زیادہ خطرناک ہے امام حسن بصری کا قول ہے کہ خالی پیٹ شیطان کا قید خانہ ہے اور بھرا پیٹ شیطان کا اکھاڑہ ہے۔

شقیق بلخی نے فرمایا کہ لوگ چار باتوں میں اللہ کی موافقت کرتے ہیں اور عمل میں خلاف کرتے ہیں ۱۔ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بندے ہیں اور عمل آزادوں جیسے کرتے ہیں ۲۔ کہتے ہیں کہ اللہ ہمارے رزق کا کفیل ہے اور دل ان کے مطمئن نہیں مگر دنیا کی چیز سے ۔ ۳۔ کہتے ہیں کہ آخرت دنیا سے بہتر ہے لیکن دنیا کے لیے مال جمع کرتے ہیں

اور آخرت کے لیے گناہوں کو ۴۔ کہتے ہیں کہ ہم ضرور مرنے والے ہیں لیکن عمل ایسا کرتے ہیں کہ گویا کبھی مرنا ہی نہیں۔

دین و دنیا کے کاموں میں راہ اعتدال وہ ہے جو حدیث میں آیا ہے کہ جائز دنیا کے لیے ایسا کام کرو کہ گویا اس دنیا میں ہمیشہ رہنا ہے اور آخرت کے لیے ایسا کام کرو کہ گویا کل مرنا ہے۔ اِعْمَلْ لِدُنْیَاکَ کَاَنَّکَ تَعِیْشُ اَبَدًا وَاعْمَلْ لِاٰخِرَتِکَ کَاَنَّکَ تَمُوْتُ غَدًا۔

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً حضرت فاروق اعظمؓ کا قول ہے کہ کسی مسلمان کو زیبا نہیں کہ تلاش رزق سے بیٹھ جائے اور دعا کرے کہ اے خدا! مجھ کو رزق دے کیونکہ تم کو معلوم ہے کہ آسمان سے سونا، چاندی نہیں برستا۔ (المخزن الاخلاق)

عالمگیر دین کا چوتھا معیار "قوت اصلاح"

اصلاح ضبط نفس اور خود غرضی کے مٹانے کا نام ہے

جو مذہب اصولاً ان دو امروں کو پورا کرے وہ مذہب عالمگیر ہو سکتا ہے کیونکہ تمام فساوت کی جڑ یہی دو امر ہیں مسیحی مذہب کا یہ فلسفہ کہ جو آدمی حضرت مسیح کی الوہیت اور ان کے مصلوب ہونے پر ایمان لائے تو اس کا صرف یہی اعتقاد اس کے تمام اگلے پچھلے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے ایسا فلسفہ ہے جس سے نہ صرف اصلاح عمل اور نیک کرداری کی جڑ کٹ جاتی ہے بلکہ نفس انسانی گناہوں پہ دلیر ہو جاتا ہے چنانچہ اس کفارے پر یقین کی وجہ سے بڑے سے بڑے گناہ کے ارتکاب میں وہ کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا۔ آج کل بھی اگرچہ مسیحی دنیا پوری تعلیم یافتہ ہو چکی ہے لیکن تمام دنیا کی خونریزیوں کی ذمہ داری ان پر ہی ہے اور اقوام و ملل کی کل خانہ جنگیوں اور کشت و خون کا اصلی سبب ان ہی کی شر انگیز اور فساد خیز سیاست ہے۔

مسلمانوں کی عراق، مصر و شام پر ہزار سال سے زیادہ حکومت رہی لیکن وہاں اب

تک عیسائی موجود ہیں مسلمانوں نے چھ سو سال اسپین پر حکومت کی لیکن مسیحیوں کو جب اسپین پر غلبہ حاصل ہوا تو ایک مسلمان کو بھی وہاں زندہ نہ چھوڑا بلکہ مسلمان کی قبروں تک کا بھی باقی رکھنا گوارہ نہ کیا یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ ضبط نفس کے لیے ان کو قانون مجازاۃ اعمال پر یقین نہیں تھا بلکہ عقیدہ کفارہ نے ان کو ہر گناہ کے بدانجام سے بشرطیکہ سیاسی اور دنیوی مصلحت اس کے خلاف نہ ہو بالکل بے پروا کر دیا .... اس کے برخلاف اسلام کا یہ پختہ تصور ہے کہ ہر مجرم یہ یقین کرلے کہ وہ جب بھی کوئی جرم کرتا ہے۔ کائنات عالم کا حاکم اعلیٰ اس کو دیکھتا رہتا ہے اور اس کی حکومت کے غیر محسوس کارندے اس کے اعمال کو ریکارڈ کرتے رہتے ہیں جو حاکم اعلیٰ کی بارگاہ میں وقت مقررہ پر پیش کیے جائیں گے اور ذرہ ذرہ کا حساب دینا ہو گا جس پر عدل الٰہی کے تحت مجرم کو سزا دی جائے گی اور وہ سزا ایسی ہوگی جس کی دردناکی کے آگے پوری دنیا کی ساری سزائیں پر کاہ کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اسلام کی یہی قوت اصلاح تھی جس نے عرب جیسی جرائم پیشہ بے تعلیم قوم کو دس پندرہ سال کے مختصر عرصہ میں ایسا پاکیزہ با اخلاق، خدا ترس، عدل پرور قوم بنا یا کہ بقول مستشرقین یورپ کے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا آسمان سے فرشتے اتر کر زمین پر پھر رہے ہیں اسلام کی اسی قوت اصلاح اور حیرت انگیز موثریت کو غیر مسلموں کو سمجھنے اس دور فساد کا صحیح علاج بتاتا ہے اور درحقیقت عالمگیر دین بھی وہی ہو سکتا ہے جو نوع انسانی کی اس عالمگیر اصلاحی ضرورت کو پورا کرتا ہو اور تخریبی قوتوں کو کنٹرول کر سکتا ہو اصولاً ایسا مذہب صرف اسلام اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدا سے لائی ہوئی ہدایات ہیں

لارڈ برنارڈ شا مشہور ادیب انگلستان کو اقرار ہے کہ " اس دور حاضر کی اصلاح قطعاً ناممکن ہے جب تک پیغمبر اسلامؑ جیسی شخصیت کو موجودہ دنیا کا ڈکٹیٹر نہ بنایا جائے۔"

مسٹر گاردین لکھتے ہیں کہ قدرت کی قوتوں پر فتح پانا نہیں بلکہ انسان کے اندر جو شیطانی قوتیں ہیں ان پر فتح پانا حقیقی کامیابی ہے۔

دینِ عالمگیر کی جانچ کا پانچواں معیار

حق جس نبی کو ملا ہو جس زمانے میں ملا ہو اس کو اصولاً تسلیم کرنا

دین کے عالمگیر ہونے کی بڑی دلیل ہے غیر سماوی ادیان نے تو سرے سے نبوت کو تسلیم ہی نہیں کیا اور نہ صرف یہ کہ تمام مسلّم رسل وانبیاء علیہم السلام کی صداقت کا انکار کیا بلکہ اس کی جگہ خدا کو انسانی صورت میں متشکل کرنے کا من گھڑت مسئلہ ایجاد کیا جس کو اوتار کہا جاتا ہے مسیحی اور یہودی ادیان پر بھی جو کہ بنیادی طور پر سماوی دین تھے اس ضمنی تصور کا اثر پڑا چنانچہ انہوں نے بھی حضرت مسیحؑ اور حضرت عزیر کو خدائی شکل دے دی یہودنے حضرت مسیحؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کی نبوت ورسالت کا انکار کیا اور عیسائیوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا جس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں گروہوں نے حق کو تقسیم کیا اور صداقت کو اپنے گروہ کے ساتھ مختص کر دیا اور اس لیے حق کا دائرہ بجائے عالمگیر ہونے کے محدود ہو کر رہ گیا۔ اس کے برخلاف قرآن حکیم نے حق و صداقت کی وحدت کا اعلان کیا اور مسلمانوں کے لیے تمام انبیاء اور رسل خداوندی پر ایمان لانا ضروری قرار دیا چنانچہ فرمایا گیا اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (الآیۃ) اس آیت میں تفریق بین الرسل یعنی بعض رسولوں کے ماننے اور بعض کا انکار کرنے کو منافی ایمان قرار دیا گیا ہے جو اسلام کے عالمگیر ہونے کی واضح دلیل ہے اور جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام ان تمام صداقتوں کا جو مختلف زمانوں میں مختلف انبیاء کے ذریعے انسانوں کو دی گئی تھیں ایک آخری اور جامع مجموعہ اور کل ہے جو کسی خاص زمانے اور ملک ونسل سے مختص نہیں بلکہ کل اقوامِ عالم کی ایک مشترکہ صداقت ہے۔

دینِ عالمگیر کا چھٹا معیار

دین انسانوں کے لیے اللہ جل جلالہٗ کی طرف سے ایک ضابطۂ حیات ہے اللہ کا انسانوں کے ساتھ

صرف ایک ہی تعلق ہے اور وہ تعلق عبدیت ہے اس رشتہ عبدیت کے سوا خدا کا انسانوں کے ساتھ کوئی اور رشتہ نہیں لہٰذا خدا کی بارگاہ میں جو فرق مراتب ہوگا رشتہ عبدیت کی بنیاد پر ہوگا نہ قوم و نسل کی بنیاد پر۔

الٰہی دین میں یہود و نصاریٰ کی طرح نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ اور ہندو مذہب کی برہمنیت کا کوئی نسلی تصور ممکن نہیں ورنہ وہ دین الٰہی اور دین عالمگیر نہ ہوگا بلکہ نسلی برتری کو قائم رکھنے کے لیے ایک علاقائی اور نسلی نظریہ حیات ہوگا۔ اسلام کے سوا اکثر ادیان میں یہی تصور پایا جاتا ہے ہندوستان میں برہمن اور شودر کا فرق اور یورپ و امریکہ میں کالے گورے کا امتیاز اس نسلی تصور کا اثر ہے جو اس دور تعلیم و دعویٰ مساوات میں بھی اب تک ان مذاہب کے ماننے والوں میں عملاً موجود ہے یہاں تک کہ ان کے کنوئیں اور مندر اسی طرح سکول اور گرجے الگ الگ ہیں جو سب اس امر کی دلیل ہیں کہ ان مذاہب میں عالمگیر ہونے کی روح موجود نہیں بلکہ محدودیت اور نسلیت ہے اس کے برخلاف اسلام نے اعلان کیا ہے کہ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ کہ نسل و قومیت محض شناخت کے لیے ہے اور شرف انسانی کا مدار کمال عبدیت اور تقویٰ پر ہے پیغمبر اسلام نے اعلان فرمایا لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاسود علی الاحمر ولا لاحمر علی الاسود الا بالعلم والتقوی یعنی کسی عرب کو عجمی پر اور عجمی کو عرب پر کالے کو گورے پر اور گورے کالے پر برتری نہیں بجز علم و تقویٰ کے:

نے افغانیم نے ترک و تتاریم	چمن زادیم از یک شاخساریم
تمیز رنگ و بو بر ما حرام است	کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

دین عالمگیر کا ساتواں معیار شان جامعیت

انسانی امراض کی بے شمار قسمیں ہیں۔ اور زندگی کے ہر شعبہ میں امراض لاحق ہوتے ہیں لہٰذا دین عالمگیر وہی ہوگا جس میں تمام امراض انسانی کا

علاج موجود ہو اور اعتقادی، اخلاقی، معاشرتی، معاشی عباداتی اور سیاسی، بین الاقوامی تمام شعبہ ہائے حیات انسانی کے لیے اس دین میں کامل ہدایات موجود ہوں تاکہ زندگی کا ہر شعبہ تمام امراض وخامیوں سے پاک ہوکر صحیح توانائی کا حامل ہو سکے ___ اور فرد جماعت کی زندگی حقیقی و اصلی مسرتوں سے ہم آغوش ہو سکے۔ نہ یہ کہ اس میں صرف چند مختصر مذہبی رسومات ہوں یہی وہ شانِ جامعیت ہے جو فطرتِ انسانی کی طرح ہمہ گیر ہے اور جس سے دین عالمگیر کی معرفت حاصل ہوتی ہے اس معیار پر عالمگیر دین صرف اسلام ہے جس میں زندگی کے تمام شعبوں کے لیے مکمل حکیمانہ قوانین موجود ہیں اور وہ فطرتِ انسانی پر ایسے فٹ ہیں کہ دشمنانِ اسلام نے بھی آج تک چودہ سو سال گزر جانے کے باوجود کوئی نقص ان میں نہیں نکالا۔ بلکہ غیر مسلم اقوام انسان کے فطری تقاضوں سے مجبور ہوکر اسلامی قوانین کو برابر اپنائے چلی جارہی ہیں۔

جیسے کہ تحریم شراب اور ضرورت طلاق وغیرہ ہیں پہلی جنگِ عظیم کے بعد انگلستان میں تکثیر جرائم کو دیکھ کر وہاں کے ماہرین نے اس کا علاج سزا تازیانہ ہی کو قرار دیا اور اس پر عمل بھی شروع کر دیا گیا جس سے جرائم بند ہوئے طلاق کے مسئلہ پر یورپ اور امریکہ نے عمل کیا۔ اور شراب کی مضرتوں کی تحقیق کے بعد بندش شراب کی تحریک امریکہ میں چلائی گئی اگرچہ تمام ذرائع کے استعمال کرنے کے باوجود اس تحریک میں وہ اس لیے کامیاب نہ ہو سکے کہ دینی گرفت سے جن طبائع کو ایک بار آزاد کر کے ان کو خالص حیوانی راہ پر ڈال دیا جائے اور ایک لمبی مدت تک وہ اس راہ پر چلنے کے خوگر ہوجائیں تو ایسے طبائع کو دینی اور روحانی قوت کے بغیر محض قانونی قوت سے راہ پر لانا دشوار ہے۔

آٹھواں معیار۔ "معقولیت"

فطرتِ انسانی کا امتیازی وصف عقل ہے جس کے ذریعہ سے انسان صحیح اور غلط میں فرق کرتا ہے اور حق کو باطل سے ممتاز کرتا ہے عقل فطرت انسانی کی طرح

عالمگیر ہے اس لیے خالقِ فطرت انسانی نے انسان کے لیے جو دین عالمگیر متعین کیا ہے، یہ ضروری ہے کہ اس دین کے اصول معقول اور موافقِ عقلِ انسانی ہوں تاکہ انسان اس کو قبول کر سکے لیکن اسلام کے سوا جس قدر مذاہب و ادیان ہیں ان میں یا تو عاجز اور مخلوق انسان کو خدا بنا دیا گیا ہے یا خدائی میں ان کو شریک کر دیا گیا ہے بدھ مذہب میں مہاتما بدھ اور ہندو مذہب میں برہما، وشنو اور مہادیو کا بھی تصور ہے بلکہ ان کے سوا لاکھوں اور کروڑوں دیوتاؤں کو بھی خدائی درجہ پر فائز کر دیا گیا ہے حالانکہ ان کے پاس ان ہستیوں کو خدا کے اس عظیم منصب پر فائز کرنے کا نہ صرف یہ کہ کوئی عقلی ثبوت نہیں بلکہ ان کے خلاف عقلی دلائل موجود ہیں تقریباً یہی یہودیت اور مسیحیت میں بھی موجود ہے چنانچہ یہودیت نے حضرت عزیر علیہ السلام کے بارے میں اور مسیحیت نے حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق یہی تصور پیش کیا ہے یہودیت میں خدائی اس قدر دور از عقل ہے کہ ادنیٰ سمجھ بوجھ کا انسان بھی اس کے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ مثلاً یہ کہ یعقوب سے صبح صادق تک تمام رات خدا کشتی لڑتا رہا اور صبح کو جب جانا چاہا تو یعقوب نے بغیر برکت لیے جانے نہ دیا (تورات پیدائش باب ۳۲ آیت ۲۴) یا مثلاً یہ کہ خداوند زمین پر انسان کے پیدا کرنے سے پچھتایا اور نہایت دلگیر ہوا (تورات پیدائش درس ۶:۵) کیا خدا کے متعلق یہ تصور کوئی معقول تصور ہو سکتا ہے یا عقل کبھی اس کو تسلیم کر سکتی ہے مسیحی الٰہیات کا یہ تصور کہ حضرت مسیح خدا بھی تھے اور پھر بھی یہودیوں کے ہاتھوں سولی پر چڑھائے گئے۔ اور ایلی ایلی لما سبقتنی" کہہ کر زار و قطار روتے رہے۔ دو متضاد باتوں کا ایک نامعقول مجموعہ ہے اس طرح حضرت مسیح کو خوراک اور کھانے پینے اور دیگر ضروریاتِ زندگی کا محتاج مان کر پھر بھی ان کو خدا تسلیم کرنا انتہائی نامعقول بات ہے اس کے علاوہ باپ بیٹا روح القدس میں سے ہر ایک کو خدا مان کر یہ کہہ دینا کہ تین ایک ہے اور ایک تین ہے حالانکہ مسیحی دو ایک

یا چار کا ایک ہونا تسلیم نہیں کرتے ۔ یہ فیاضی انھوں نے صرف تین کے عدد کے لیے مختص کر دی ہے کہ وہ تین بھی ہے اور ایک بھی ہے اور جب ان سے اس کی حقیقت پوچھی جاتی ہے تو وہ صاف کہہ دیتے ہیں کہ یہ مسئلہ عقل سے بالاتر ہے مگر ہم یہ کہتے ہیں کہ عقل سے بالاتر ہونے کی بجائے عقل کے خلاف ہے پھر تین خداؤں کا تثلیثی تصور اگر ایسا ہے کہ جس میں ہر ایک کی شخصیت محفوظ ہو تو تین کے تین رہے اس کو واحد کہنا غلط ہے اور اگر تینوں شخصیتیں ختم ہو کر ایک وحدت میں منتقل ہوئیں تو وحدت رہی تثلیث نہ رہی بہرحال خدائی حقیقت کو بیک وقت ایک اور تین کہہ دینا خلاف عقل ہے اور پھر نظام عالم چلانے کے لیے ان تینوں میں سے اگر ایک کافی ہے تو باقی دو فضول رہے اور اگر ایک کافی نہیں جب تک تینوں نہ مل جائیں تو ہر ایک کے لیے جداگانہ خدائی کا تصور غلط ہے بہرحال مسیحی تثلیث قطعاً خلافِ عقل ہے اور جس مذہب کا بنیادی عقیدہ عقل انسانی کے خلاف ہو وہ کیونکہ عالمگیر مذہب ہو سکتا ہے اس کے علاوہ نظام عالم کی وحدت و یکسانیت صاف ظاہر کر دی ہے کہ صرف ایک ہی قوت قاہرہ اس نظام کو چلا رہی ہے ۔

نواں معیار - ربطِ دنیا و آخرت

انسان کو دنیا میں کچھ مدت رہ کر آخرت کی طرف جانا ہے دنیا کی محدود زندگی اس کی شرافت و کرامت کے ظہور کے لیے کافی نہیں ورنہ اس کی شرافت خاک میں مل جائے گی اور حیوان مطلق پر اس کو فوقیت حاصل نہ ہو گی بلکہ حیوانِ مطلق زیادہ کامیاب نظر آئے گا کیونکہ وہ ایسی زندگی گزار رہا ہے کہ اس میں نہ غمِ ماضی ہے اور نہ فکر فردا لیکن انسان قوتِ شعور کی وجہ سے دن رات گزشتہ احزان اور مستقبل کے خطرات میں ڈوبا ہوا ہے اس لیے ضروری ہوا کہ انسان کے لیے ایسا مقام حیوٰۃ ہو جو سراپا مسرت ہو اور جس میں غم کا نام و نشان نہ ہو اور خطرات سے پاک ہو ۔ نہ خطرہ مرض

ہو اور نہ اندیشۂ مرگ تاکہ اس مقام پر پہنچ کر انسان کی فوق العالم شرافت و کرامت کا ظہور
ہو اور وہی مقام آخرت ہے جو انسانی حیات کی آخری منزل ہے اور دنیاوی منزل اس
آخروی حیات کے اکتساب اور تحصیل کا ایک ذریعہ ہے انسانی فطرت میں انجام بینی
کا جذبہ اس اخروی تصور کا آئینہ دار ہے۔

دنیا میں انسان کا ٹھکانا زمین ہے اور آخرت میں اس کا مقام عالم بالا ہے چونکہ
بدن انسانی ارضی ہے اور روح انسانی سماوی لہٰذا انسان کا ابتدائی مقام سفلی اور آخری
مقام علوی ہونا ضروری ہوا۔

اس حقیقت کے پیش نظر صحیح فطری اور عالمگیر دین وہ ہوگا جس میں نہ ترک دنیا
کی تعلیم ہو اور نہ ترک آخرت کی بلکہ اس میں دونوں کا حسین امتزاج ہو۔

تاریخ ادیان اور تعلیمات مذاہب سے یہ حقیقت نمایاں ہے کہ موجودہ مسیحی دین
میں دین اور دنیا کے تضاد کا تصور موجود ہے اور اس میں اونٹ کا سوئی کے ناکہ سے
نکل جانا ممکن ہو سکتا ہے لیکن دنیا دار اور امیروں کا دیندار ہونا ممکن نہیں۔ اس لیے
صحیح مسیحی ہونے کے لیے ضروری ہے کہ تمام تعلقات دنیا کو ترک کیا جائے اور
نکاح و اولاد اور ذرائع رزق کے تمام دھندوں سے الگ ہو کر سخت سے سخت ریاضتوں
کی تکالیف کو جھیل کر خدا کو پانے کی کوشش کرنی چاہیے گویا مسیحی ہونے کے لیے دنیا
سے الگ ہونا ضروری ہے یہی وجہ تھی کہ چونکہ ایسا مذہب دنیا کے ساتھ نہیں چل سکتا
تھا اس لیے یورپ کے مسیحیوں نے دین اور دنیا کی تفریق کی راہ اختیار کی اور مسیحیت
کو صرف دین کی راہنمائی کے لیے مختص کر دیا اور دنیا کی راہنمائی کے لیے عقل کی ایجاد کردہ
راہ پر چلے۔ درحقیقت خدا کی طرف سے بذریعہ انبیاء علیہم السلام جتنے ادیان آئے
وہ دین و دنیا کے جامع تھے اور ان میں قطعاً دین و دنیا کی جدائی کی تعلیم نہ
تھی اور نہ ہی دین و دنیا کو ایک دوسرے کا مخالف اور ضد بتلایا گیا ہے لیکن چونکہ

اسلام کے سوا کوئی سماوی دین اصلی شکل میں محفوظ نہیں رہا بلکہ انسانی تحریف و تبدیل کا شکار ہو گیا اور دیدہ دانستہ قصداً اس کو ایسی شکل دے دی گئی جو جدید دنیا میں پنپنے کے قابل نہ ہو تاکہ آسانی کے ساتھ اس کو انسان کی دنیوی زندگی سے خارج کیا جا سکے اب ظاہر ہے کہ موجودہ شکل میں مسیحی دین دنیوی زندگی کے لیے قابلِ عمل نہیں رہا چہ جائیکہ وہ دین عالمگیر ہونے کا حقدار ہو سکے اس کے برخلاف اسلام نے صاف اعلان کیا کہ وہ دین و دنیا کا جامع ہے اور انسانی فطرت کے مطابق اس کا مقصد دنیا و آخرت دونوں کی سربلندی اور کامیابی ہے قرآنِ مجید میں ہے "وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ" تم کو دنیا آخرت دونوں کی سربلندی اور کامیابی نصیب ہوگی بشرطیکہ تم مومن کامل ہو قرآن میں ایک دعا کی تعلیم دی گئی ہے۔ ربنا اتنا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً۔ الآیۃ جس میں دنیا و آخرت دونوں کے فوائد کی تحصیل کی دعا سکھائی گئی ہے خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اور جس کو ہم پہلے نقل کر چکے ہیں کہ دنیا کی تحصیل میں ایسی کوشش کرو کہ گویا تمہیں دنیا میں ہمیشہ رہنا ہے اور آخرت کے لیے ایسی کوشش کرو کہ گویا تم کو کل دنیا سے آخرت کی طرف جانا ہے۔

بیہقی کی حدیث ہے کہ اسلامی عبادات کے بعد سب سے بڑا فرض مسلمان کے لیے رزق حلال کا کمانا ہے ترقی دنیا کی انتہائی شکل حکومت ہے قرآن نے مسلمانوں کے ساتھ یہ وعدہ کیا کہ اگر وہ ایمان اور عملِ صالح پر قائم رہے تو اللہ تعالیٰ ان کو مضبوط حکومت عطا فرمائے گا۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ۔ الآیۃ

دنیوی ترقی اور حکومت کا مدار فوجی قوت اور آلاتِ حرب پر ہے اور اسلام نے اس کو فرض قرار دیا ہے وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ الآیۃ

دنیوی ترقی کا مدار اتحاد پر ہے اسلام نے اس کو بھی فرض قرار دیا۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا۔ دنیوی برتری کا سب سے بڑا ذریعہ جہاد ہے اسلام نے اس کو بھی فرض ٹھہرایا۔ وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ۔

اسلام کی چار عبادات میں سے دو عبادتیں یعنی زکوٰۃ و حج صرف اغنیا اور مالدار مسلمانوں سے متعلق ہیں جس سے اس مقصد کا اظہار مقصود ہے کہ تم مال کما کر ان دونوں عبادات کو بجا لاؤ خود مال کو قرآن نے خیر اور فضل اللہ کے نام سے ذکر کیا ہے۔ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ ۔ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ۔ بہر حال اسلام میں دنیاوی حیات کے ہر گوشے کے متعلق مکمل احکام موجود ہیں اور اس حکیمانہ انداز کے ساتھ موجود ہیں کہ دورِ حاضر کے عقلاء دنگ رہ جاتے ہیں اس لیے دنیا میں انسانوں کے لیے اگر کوئی عالمگیر دین ہو سکتا ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔

دینِ عالمگیر کا دسواں معیار "دوام دین و محفوظیت"

جو دین کہ اس کا بقاء دوامی نہ ہو۔ اور نہ اصلی شکل میں محفوظ ہو وہ عالمگیر نہیں ہو سکتا کیونکہ جو دین ایک خاص وقت تک باقی رہے اور پھر اپنا وجود کھو دے وہ دین عالمگیر کیونکر ہو گا اب چونکہ اسلام ہر دور میں باقی ہے اس لیے عالمگیر دین بھی ہر دور میں باقی اور محفوظ ہونا چاہیے

مسیحی دین کا مدار انجیل پر ہے جو محفوظ نہیں نہ سینوں میں نہ کاغذات میں انجیل کے حفاظ نہ پہلے موجود تھے اور نہ اب موجود ہیں حفاظت کا بنیادی ذریعہ درحقیقت یہی تھا جو بغیر قرآن حکیم کے کسی آسمانی کتاب کو نصیب نہ ہوا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جس زبان میں انجیل نازل ہوئی تھی یعنی "عبرانی" اس زبان کا کوئی اصلی نسخہ روئے زمین پر موجود نہیں اور جو عبرانی نسخہ ہے وہ یونانی نسخہ کا ترجمہ ہے اس بنا پر اصلی کتاب گم ہے اور عبرانی زبان بھی زندہ زبان نہیں رہی اب جو بعد کی بنائی ہوئی انجیل ہیں

وہ چار ہیں اور اصلی انجیل ایک تھی لیکن اس کی تحریف کا بھی یہ حال ہے کہ حقانی نے بحوالہ مسٹر "مل" نقل کیا ہے کہ عہد جدید کے نسخے مقابلہ کیے تو تیس ہزار اختلاف پائے گئے۔ ڈاکٹر گریاخ نے اور زیادہ نسخوں کا مقابلہ کیا یعنی تین سو پچیس نسخوں کا تو ڈیڑھ لاکھ اختلاف ملے۔ پادری فنڈر، اختتام مباحثہ دینی مطبوعہ اکبرآباد میں لکھتے ہیں کہ کتاب کی غلطیاں بہت ہیں اور ہر حال میں تمام یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ صحیح کون ہے۔

لارن صاحب اپنی تفسیر کی دوسری جلد میں لکھتے ہیں بلاشک بعض خرابیاں (تحریفات) جان بوجھ کر بعض لوگوں نے کی ہیں جو دیندار مشہور تھے اور اس کے بعد انہیں تحریفات کو ترجیح دی جاتی تھی تاکہ اپنے مطلب کو قوت دیں یا اعتراض اپنے اوپر نہ آنے دیں۔

"انجیل متی" کا باب اول و دوم ڈاکٹر ولمین وغیرہ کے نزدیک الحاقی ہے

"مرقس" کی انجیل کے اصل نسخہ کا کوئی پتہ نہیں البتہ یونانی ترجمہ ہے

"انجیل لوقا" لوقا معلوم نہیں کہ کون تھا کیونکہ وہ حضرت عیسی علیہ السلام کے حواریوں میں سے نہیں ان کی اصلی زبان کا بھی پتہ نہیں کہ کس زبان میں لکھی گئی تھی

عیسائی محققین کی رائے ہے کہ "انجیل یوحنا" مدرسہ سکندریہ کے کسی طالب علم کی تصنیف ہے

(حقانی ج ۷، ص ۱۰۱ تا ۱۰۵)

کیا ایسا مشکوک مبہم اور محرف دین عالمگیر ہو سکتا ہے اس کے برخلاف اسلام کا یہ حال ہے کہ قرآن آغاز نزول سے اب تک حافظہ اور تحریر دونوں صورتوں میں محفوظ رہا اور اب تک ہے اور ایک زبر یا زیر کا فرق ہو جائے تو لاکھوں حافظ چلا اٹھتے ہیں کہ یوں نہیں یوں ہے تمام عالم کے "قرآن" کے نسخے یکساں رہے ہیں اور کوئی فرق ان میں کسی دور میں نہیں پایا گیا، یہی قرآن کے دوام اور محفوظیت کی واضح دلیل ہے جو اسلام کے عالمگیر ہونے کا بین ثبوت ہے۔

باب ششم

قیامت، معاد اور مجازاتِ اعمال

اسماء القیامۃ

جس چیز کے نام کثیر التعداد ہوں تو یہ اس کی عظمت کی دلیل ہے۔ اللہ جل جلالہ کے نام بہت ہیں جو مسمی کے معظم ہونے کی دلیل ہیں۔ امام سیوطیؒ نے بدور السافرۃ فی امور الاخرۃ میں روز قیامت کے اسّی اسماء ذکر کئے ہیں۔ (صفحہ ۲۹ مطبوعہ کانشی رام لاہور) ہم اُن میں سے صرف مشہور اسماء کو ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ السّاعۃ یہ قیامت کا نام ہے دو وجہ سے۔ ایک اس وجہ سے کہ قیامت اچانک آئے گی۔ جیسے ایک گھنٹہ گذر جانے کے بعد اچانک دوسرا گھنٹہ آجاتا ہے۔ دوم اس وجہ سے کہ قیامت میں اوّلین آخرین کا حساب تھوڑے وقت مثلاً ایک گھنٹہ میں ختم ہو جائے گا یہی سریع الحساب ہونے کا معنی ہے۔ یہی معنی حضرت علیؓ سے منقول ہے۔ اَنَّ السَّاعَۃَ اٰتِیَۃٌ لَّا رَیْبَ فِیْھَا (الحج آیۃ ۷)

۲۔ القیامۃ کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَۃُ الْمَوْتِ ط وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَکُمْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ ط (آل عمران آیۃ ۱۸۴)۔ اس نام کی وجہ یہ ہے کہ قیامت کھڑے ہونے کا نام ہے اور اس دن میں تمام لوگ اور ملائکہ اور روح، اللہ کے آگے کھڑے ہوں گے جب تک اللہ چاہے۔

۳۔ القارعۃ قرعہ دل کو لرزانے اور کھٹکھٹانے کا نام ہے۔ یہ دن اپنی ہیبت ناکیوں سے دلوں کو خوف زدہ کر دے گا۔ اَلْقَارِعَۃُ مَا الْقَارِعَۃُ۔

۴۔ الحاقۃ یہ حق سے ماخوذ ہے۔ اس نام میں یہ بتلانا مقصود ہے کہ یہ دن حق ہے اور اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔

۵۔ الواقعہ وقوع سے ماخوذ یعنی اس دن کے واقع ہونے میں شبہ نہیں، بلکہ حقیقتِ واقعہ ہے۔ یہ دونوں نام بالترتیب اَلْحَآقَّۃُ مَا الْحَآقَّۃُ۔ اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَۃُ

میں مذکور ہے۔

۶۔ الغاشیۃ — هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ط غش کے معنی چھپانے کے ہیں۔ یہ دن اپنی ہیبت ناکیوں سے دلوں کو چھپالے گا اور لوگ حواس باختہ ہو جائیں گے

۷۔ آزفۃ — اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ
آزف قریب ہونے کو کہتے ہیں۔ اَزِفَ الشَّیُٔ قرب اور یہ دن حقیقت کے اعتبار سے قریب ہے کہ آنے والی چیز قریب ہوتی ہے اور جانے والی چیز بعید ہوتی ہے۔ نیز موت قیامت کا دروازہ ہے اور موت قریب ہے۔

۸۔ یوم التغابن — غبن دھوکہ کو کہتے ہیں۔ اس دن یہ امر ظاہر ہوگا کہ حیات دنیا میں کون سے لوگ دھوکہ میں مبتلا رہے۔ جنہوں نے عمرِ عزیز کا قیمتی حصہ کن مضر چیزوں میں گنوایا اور کن قیمتی اعمال سے محروم رہے۔ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ

۹۔ خافضۃ — یعنی پست کرنے والا دن کہ دین سے برگشتہ افراد جہنم کی پست ترین ذلت میں اس دن پہنچیں گے۔

۱۰۔ رافعۃ — بلند کرنے والا دن۔ جن لوگوں نے دنیا کی زندگی میں دین کا اہتمام کیا ہے وہ اس دن جنت کے بلند مقام کی شہنشاہیت سے نوازے جائیں گے

خَافِضَةٌ رَافِعَةٌ۔ طَامَّۃُ الْکُبْرٰی۔ فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى طامۃ الکبریٰ بڑے ہنگامے کا نام ہے قیامت سے بڑا ہنگامہ ممکن نہیں جس میں تمام انسانوں کی قسمت کا ابدی فیصلہ ہوگا۔

قیامت اور حشر و نشر انسانی زندگی کا اہم شعبہ ہے جس پر دائمی تباہی یا خوش حالی کا مدار ہے۔ قیامت کے متعلق تین امور قابلِ غور ہیں

۱۔ قیامت کا وجود جس کو ہم صورتِ قیامت سے تعبیر کرتے ہیں۔

۲۔ مقصد قیامت یعنی مجازاۃ اعمال جس کو ہم روح قیامت سے تعبیر کرتے ہیں۔

۳۔ تفصیلات قیامت مثلاً کیفیتِ قیامت، وزنِ اعمال حوض، عبورِ صراط و نور دوزخ و جنت وغیرہ

سب سے پہلے ہم صورتِ قیامت و معاد کا ذکر کرتے ہیں اور ان کے عقلی و نقلی دلائل پیش کرتے ہیں۔

معاد اور قیامت کا ثبوت نقلی

۱۔ تمام سماوی ادیان قیامت اور مُردوں کے دوبارہ زندہ کئے جانے پر متفق ہیں اور تمام ملل سماوی اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ شرح مواقف ج ۸ صفحہ ۲۹۴ میں یہ نقل موجود ہے۔ اَجْمَعَ اَهْلُ الْمِلَلِ وَالشَّرَائِعِ عَنْ آخِرِهِمْ عَلٰی جَوَازِهٖ وَوُقُوْعِهٖ یعنی تمام اہلِ ملت و شریعت حشر اجساد کے جواز اور وقوع پر متفق ہیں۔

۲۔ خود تمام آسمانی کتابوں میں قیامت کا تذکرہ موجود ہے۔

۳۔ تمام انبیاء علیہم السلام جن سے بڑھ کر صادق اور راست باز اولاد آدم میں نہیں، وہ سب قیامت کی خبر دیتے رہے ہیں۔ قرآن نے قیامت کا بیان نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے پھر مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ فرمایا یعنی قرآن گذشتہ آسمانی کتابوں کے اصول و عقائد کی تصدیق کرتا ہے۔ جس سے ثابت ہوا کہ قرآن، نبوت و قیامت و مجازات اعمال وغیرہ امور میں سابق تعلیمات کتبِ سماویہ کا مصدق ہے۔ قیامت کے بعد آخرت کی زندگی دنیا کی زندگی سے بڑھ کر اور پائیدار ہے۔ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى اُخروی زندگی بہتر اور پائیدار ہے۔ پھر فرمایا اِنَّ هٰذَا لَفِى الصُّحُفِ الْاُوْلٰى صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى یہ مضمون حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے صحیفوں میں موجود ہے۔

تردیدِ انکارِ فلاسفہ

فلاسفہ نے حشر اجساد کا انکار کیا ہے لیکن مجازاۃ اعمال کو وہ بھی تسلیم کرتے ہیں، بعض بہ شکل سعادت و شقاوتِ روحانی اور بعض بشکل تناسخِ ارواح جس کی ہم آگے چل کر تردید کریں گے۔ فلاسفہ کا انکار خود ان کے قواعد فلسفہ کے تحت بھی مردود ہے کیونکہ وہ ہر ممکن کو تحت القدرت تسلیم کرتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ

حشر اجساد کے ممکنات سے ہے حشر میں ایک جز روح انسانی ہے دوم ذرات بدن سوم تالیف اور
ہیت ترکیبیہ اور یہ تینوں اشیاء از قسم ممکن داخل قدرت الہیہ ہیں۔ کیونکہ یہ تینوں چیزیں موت
سے قبل اللہ کے ایجاد سے موجود ہوتی تھیں، اگر غیر ممکن اور ممتنع ہوتیں تو پہلی مرتبہ بھی وجود میں
نہ آتیں۔ اب دوبارہ موجود ہونا تو زیادہ عقل کو قریب ہے۔ اسی کو قرآن نے بیان کیا۔
وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ط وَ لَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ۔ (الروم ۳۰) یعنی دوبارہ پیدا کرنا انسانی قدرت
کے قاعدہ سے زیادہ آسان ہے پہلی بار سے۔ اگرچہ اللہ بہت بلند ہے لہذا اس کے اعتبار سے
دونوں تخلیقوں میں کچھ فرق نہیں۔

شبہ اعادہ معدوم

فلاسفہ کا انکار اس شبہ پر مبنی ہے کہ وجود اول و دوم ایک
ہے اور عدم دو مغائر چیزوں میں آتا ہے لہذا معدوم کا بعینہٖ
اعادہ نہیں ہوتا اور قیامت میں سابق معدوم کا بعینہٖ اعادہ ہے یہ شبہ بالکل باطل ہے۔ ایک
تو اس وجہ سے کہ اول وجود کا زمانہ اور ہے اور دوم وجود کا اور لہذا زمان اول کا وجود ختم ہوا اور
دوسرے زمانے میں اس نے وجود پایا جو بعینہٖ پہلی چیز کا وجود ہے۔ جو وجود پہلے زمانہ میں آسکتا
ہے وہ معدوم ہو کر دوسرے زمانے میں کیوں نہیں آسکتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ زمانہ بدل جانے سے
بعینہٖ پہلی چیز کا اعادہ نہیں ہوا کیونکہ پہلی چیز کی شخصیت کا جزو وہ زمانہ تھا جو نہیں لوٹایا گیا۔ تو یہ
غلط ہے کیونکہ زمانہ مشخص نہیں اس لیے اس کی تبدیلی سے شخصیت نہیں بدلتی ورنہ کل کا آدمی آج
کے دن میں پہلا شخص نہیں کہلائے گا کیونکہ کل اور آج کے زمانہ میں فرق ہے۔ باقی اعادہ معدوم
کے استحالہ اور زمانے سے شخصیت کی تبدیلی کی غلطی ہم ایک مثال سے سمجھاتے ہیں۔ ایک انسان
کا وجود اول زمانہ میں ہونا اور پھر موت کے ذریعہ معدوم ہو کر قیامت کے دوسرے زمانہ میں
موجود ہونا، اس کو ایسا سمجھو کہ ایک آدمی لاہور سے کراچی چلا جائے گویا اس کا پہلا مکان لاہور
تھا، اس سے گم ہو کر دوسرے مکان میں موجود ہوا، اور درمیانی وقت میں لاہور سے چلا ہے
اور کراچی نہیں پہنچا یہ اس کے لیے دونوں شہروں میں معدوم ہونے کا زمانہ ہے۔ تو ایسا ہونے

میں کیا محال لازم آتا ہے۔ انسان مر کر پہلے زمانہ میں معدوم ہوا اور آخرت نہ پہنچنے کی حالت میں آخرت سے بھی معدوم ہے اور آخرت آنے پر وہاں دوبارہ موجود ہوا کیوں کہ زمان سے عدم اور مکان سے عدم میں کوئی فرق نہیں۔ گویا لاہور کو وجودِ انسان کے لیے مانند دنیوی وجود سمجھو اور قیامت اور آخرت کے وجود کو مثل وجود در کراچی اور درمیان میں قطع مسافت کے وقت اس کی جو حالت ہے کہ اس وقت وہ نہ لاہور میں ہے اور نہ کراچی میں، اُس کو عالمِ برزخ اور قبر کی حالت کی طرح سمجھیں کہ مُردگان نہ دنیا میں ہیں نہ آخرت میں۔ اسی طرح اگر زمانے کی تبدیلی سے دنیا کا شخص وہ نہیں رہا ہے جو قیامت میں زندہ کیا گیا کیونکہ زمانے کا فرق ہے تو یہ دو وجہ سے غلط ہے۔ ایک اس وجہ سے کہ زمانے سے اگر شخصیت بدلتی ہے تو مکان کی تبدیلی سے بھی شخصیت بدل جائے گی۔ لہٰذا جو شخص لاہور میں ہے اگر وہ ملتان آجائے تو وہ دوسرا آدمی ہوگا پہلا نہ ہوگا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وحدت کا مدار اجزاء اصلیہ اور روح کی وحدت پر ہے۔ اس کے علاوہ اگر کچھ فرق ہو تو اس سے عرفاً شخصیت نہیں بدلتی۔ مثلاً اگر کسی آدمی کا رنگ پہلے سفید ہو پھر گرم ملک میں دُھوپ میں کام کرنے کی وجہ سے اس کا رنگ سیاہ ہو جائے تو سفیدی وسیاہی کے فرق کے باوجود شخص ایک ہی رہے گا اُس کو کوئی قانون دو قرار نہیں دے سکتا۔ اسی طرح اگر ایک آدمی جس کی عمر پندرہ سال ہو وہ تینتیس سال کا ہو جائے تو رنگ وروپ اور طول وعرض کا فرق ناگزیر ہے لیکن پھر بھی وہ ایک ہی شخص قانوناً کہلائے گا۔ کوئی حکومت اس کی تنخواہ کی ادائیگی سے یہ کہہ کر انکار نہیں کرے گی کہ جس عمر میں تیرا تقرر ہوا اب کچھ تبدیلی ہوئی لہٰذا تم دوسرے شخص ہونے کی وجہ سے تنخواہ کے حقدار نہیں اور نہ ہی کسی مقدمہ میں کوئی عدالت یہ کہہ کر اُس کا مقدمہ خارج کرے گی کہ تم بدل گئے ہو اب تم سابق مدعی نہیں رہے۔ اسی طرح اعمال نیک وبد کی وجہ سے اجزاء اصلیہ کی وحدت کے باوجود اگر رنگ وروپ کا قیامت میں کچھ فرق ہو تو آدمی بعینہٖ وہی کہلائے گا۔

المذاہب فی المعاد

روح کے متعلق دو رائے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ جسم لطیف ہے دوم یہ کہ وہ مجرد اور غیر مادی ہے۔ اب اسی اختلاف کے تحت معاد کے سلسلے میں شرح مواقف مصری ج ۲ ص ۲۹۷ کی نقل کے مطابق پانچ اقوال ہیں۔

۱۔ معاد صرف جسمانی ہے کیونکہ بدن کی طرح رُوح انسانی بھی جسم ہے لہذا صرف جسم ہی کا اعادہ ہے کثیف جسم بدن اور لطیف جسم روح کا اعادہ ہے یہ اکثر متکلمین اسلام کا قول ہے۔ جو روح کو مجرد نہیں مانتے۔

۲۔ معاد صرف رُوحانی ہے یعنی جسم کا اعادہ نہیں۔ صرف رُوح مجرد ہی مدار سعادت و شقاوت ہے۔ یہ یونان کے فلاسفہ الہیین کا قول ہے۔

۳۔ معاد جسمانی و روحانی دونوں ہیں۔ بدن کا اعادہ جسمانی اعادہ ہے اور روح مجرد کا اعادہ رُوحانی اعادہ ہے۔ تو معاد جسمانی بھی ہوا اور روحانی بھی۔ یہ حلیمی، غزالی، ابو زید، دبوسی، راغب معمر اور متاخرین امامیہ اور اکثر صوفیاء کا قول ہے۔ یعنی یہ سب حضرات رُوح کو مجرد مانتے ہیں۔

۴۔ معاد نہ جسمانی ہوگا نہ رُوحانی۔ یہ یونان کے حکماء الہیین کا قول ہے۔

۵۔ نفی اور اثبات معاد دونوں میں توقف ہے۔ یہ جالینوس کا قول ہے۔ ان کو اس میں شبہہ ہے کہ روح مزاج منعدم بالموت کا نام ہے یا جوہر باقی بعد الموت کا۔

ان پانچ اقوال کا تعلق صرف بدنِ انسانی اور روح انسانی کے ساتھ ہے لیکن یہاں ایک چھٹا قول مجازاۃ کے سلسلے میں تناسخِ ارواح کا ہے۔ جو حکماء ہند اور بعض حکماء یونان اور بعض منسوب الی الاسلام حضرات کا قول ہے۔ مثلاً احمد بن حابط جو ابراہیم نظام کا شاگرد ہے ابو مسلم خراسانی، محمد بن زکریا، طبیب رازی اور قرامطہ کا ہے

مجازاۃ کی تین شکلیں

دیکھو اخر کے لیے ملل نحل ابن حزم ج ۱ صفحہ ۹ ۔ اب مجازاۃ اعمال کی شکلیں تین ہوئیں ۔ ۱۔ اہل اسلام اور ملل سماویہ کی رائے ہے کہ حشر اجساد اور بعث بعد الموت کی شکل میں مجازاۃ بہ شکل جنت و دوزخ ہوگی ۔

۲۔ بغیر حشر اجساد کے روح کا نیکی و بدی کے اثر ۔ لذت و الم کو محسوس کرنا مجازاۃ ہے ۔ جو حکماء الہیین کا قول ہے ۔

۳۔ اعمال گذشتہ نیک و بد کے مطابق ارواح کا انسان اور حیوان کے قالب میں بغرض مجازاۃ منتقل ہونا مجازاۃ ہے ۔ یہ بعض حکماء یونان اور اکثر حکماء ہند کا قول ہے ۔

تنقید

اخیر کے دو قول اجماع انبیاء علیہم السلام اور کتب سماویہ کے خلاف ہیں اور عقل و فلسفہ کی بنیاد پر بھی غلط ہیں ۔ رُوحانی مجازاۃ تو اس لیے غلط ہے کہ اعمال میں بدن اور روح دونوں شریک ہیں اور مجازاۃ رُوحانی کا تعلق تو صرف روح سے ہے ، نہ بدن سے ۔ کوئی نیکی ہو ، مثلاً نماز یا بدی ہو مثلاً قتل ، نہ اس کو صرف رُوح کر سکتی ہے اور نہ صرف بدن کر سکتا ہے ، بلکہ دونوں کی شرکت سے ہوتی ہے ۔ لہذا نیکی و بدی کے نتائج میں بھی دونوں کی شمولیت ضروری ہے جیسی اسلامی مجازاۃ اعمال میں ہے کہ رُوح اور بدن کو ملا کر زندہ کرنا ہے ، اس کے بعد جنت و دوزخ کی شکل میں دونوں کو جزاء دینا ہے لیکن صرف روح پر مدار جزاء رکھنا جیسے قول دوم یا سوم کا مفہوم ہے غلط ہے ۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی انار کے باغ میں چوری کی غرض سے دو آدمی جا کر انار توڑ کر جمع کریں ۔ ان میں سے ایک اندھا ہو اور دوسرا لنگڑا ہو ۔ اندھا انار کو پہونچ تو سکتا ہے لیکن پکے اور کچے انار کا فرق نہیں کر سکتا ہے کہ بینائی سے محروم ہے اور لنگڑا فرق تو کر سکتا ہے لیکن لنگڑاہٹ کی وجہ سے پہونچ نہیں سکتا ۔ اب یہ دونوں طے کرتے ہیں کہ اندھا لنگڑے کو کندھے پر سوار کر کے اُس سے انار پر پہونچا کر پکا انار تڑواتا ہے کہ اچانک مالک باغ دونوں کو پکڑ کر عدالت میں پیش کرتا ہے عدالت میں ہر ایک اپنی برأت کے لیے دلیل پیش کرتا ہے ۔ اندھا کہتا ہے کہ میں نے چوری نہیں کی کہ میں تو دیکھتا نہیں اور لنگڑا کہتا ہے کہ میں نے چوری نہیں کی

کریں تو پہونچ نہیں سکتا۔ ایسی صورت میں یقیناً عدالت کا فیصلہ یہ ہوگا کہ یہ چوری دونوں نے مشترک طور پر کی ہے لہذا سزا بھی دونوں کو دینا چاہیئے۔ یہی حال اعمالِ نیک و بد کے بارہ میں جسم و رُوح کا ہے کہ صرف ایک کافی نہیں جب تک دونوں نہ ہوں۔ لہذا جزا میں بھی دونوں کی شرکت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ روحانی مجازاۃ کی حقیقت ایک خوابیدہ شخص کے اچھے یا بُرے خواب کی طرح ہے کہ اچھے خواب میں احساسِ مسرت اور بُرے خواب میں احساس دُکھ ہوتا ہے اور اسی درجے کی دُکھ یا سُکھ کا احساس اصلاح بشری کے لیے کافی نہیں۔ جزاء کے لیے یہ ضروری ہے کہ فوت شدہ فائدہ کے مقابلہ میں قوی تر فائدہ ہو مثلاً ایک آدمی کے پاس کسی یتیم کے باپ نے دس ہزار کی رقم امانت رکھی ہے جس کا یتیم کو علم نہیں اور نہ تحریری یا شہادتی ثبوت ہے۔ ایسی صورت میں اس شخص کو جزاء امانت کی امید پر یتیم کو اُس کے والد کی دس ہزار کی رقم کو حوالہ کرنا دس ہزار کا فائدہ کھو دیتا ہے اور اس رقم سے جو لذتیں وہ حاصل کر سکتا تھا اس سے دستبردار ہوتا ہے اور ایسی قربانی کے لیے تیار ہونے کا محرک وہی جزاء ہو سکتا ہے جو دس ہزار روپے سے لاکھوں گنا زائد قیمتی اور کروڑ گنا سے زیادہ پائیدار ہو مثلاً جنت نہ یہ کہ دس ہزار کی امانت ادا کرنے میں بعد از موت صرف اس کو اچھا تصور نصیب ہو۔

ردِ تناسخ

مجازاۃ بشکلِ تناسخ بھی بوجوہات ذیل عقلاً درست نہیں۔

ا۔ تناسخ انصاف کے خلاف ہے کیونکہ تناسخی مجازاۃ کا تعلق صرف روح سے ہے، بدن اس میں شریک نہیں۔ مثلاً ایک مجرم انسان کی رُوح اگر مرنے کے بعد کسی بھنگی کے بچے کی قالب میں ڈال کر اس کو بھنگی کے گھر میں یا کسی ذلیل جانور میں ڈال کر اس کو جرم کی سزا دی جائے تو اس سزا میں اُس مجرم انسان کا بدن شریک نہیں بلکہ سزا صرف روح کو دی گئی کہ اس کو انسان ذلیل یا حیوان کے حقیر قالبوں میں ڈال کر زحمت دی گئی حالانکہ جرم میں رُوح کے ساتھ مجرم کا بدن بھی شریک رہا ہے یہ خیال نہ کیا جائے کہ بدن رُوح کے لیے صرف جرم کرنے کا آلہ ہے

اس لیے جزا میں شریک کرنا ضروری نہیں، مثلاً جیسے تلوار یا بندوق قاتل کے لیے آلہ ہے اس لیے اُس کو جزا سے خارج سمجھا گیا جیسے قاتل کو سزا دی جاتی ہے لیکن اُس کے تلوار اور بندوق کو سزا نہیں دی جاتی ہے یہ غلط ہے کیونکہ بدن آلہ جرم کی حیثیت نہیں رکھتا کیونکہ آلہ فعل نہیں خود فاعل ہے۔ آلہ مثلاً فاعل یعنی قاتل سے بالکل جُدا اور منفصل وجود رکھتا ہے۔ لیکن رُوح و بدن میں مکمل اتصال اور بدن کے ہر حصہ میں روح سرایت کی ہوئی ہے۔ دوم یہ کہ تلوار قاتل میں تاثر باہمی نہیں قاتل کے غم یا خوشی سے تلوار پر کوئی اثر نہیں پڑتا لیکن رُوح کے غم اور خوشی سے بدن متاثر ہوتا ہے۔

۳۔ یہ تصور تناسخ کی صحت کی دلیل نہیں کہ انسان حیوانات سے کام لیتا ہے اس لیے حیوانات کے اندر جو روحیں ہیں انہوں نے انسانی قالبوں میں رہ کر کوئی جرم کیا ہے جس کی سزا میں اُن کو حیوانی ذِلت نصیب ہوئی ہے یا کم درجے اور غریب انسانوں کی روحوں نے اس سے پہلے انسانی قالب میں کوئی جُرم کیا تھا جس کی سزا میں اُن کو غریب گھرانے میں لوٹا کر اس جرم کی سزا میں مبتلاء مصائب کیا۔ کیونکہ حیوانات کی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ان سے کام لے جس کے لیے جرم سابق کا وجود ضروری نہیں کیونکہ اس کے بغیر نظامِ عالم چل نہیں سکتا اور نہ حیوانات کے وجود کی حکمت نمایاں ہو سکتی ہے بلکہ اگر انسان اس سے کام نہ لے، تو حیوانات کا وجود لغو اور بے کار ٹھہرے گا جو خدائے حکیم کی شان کے خلاف ہے۔ اسی طرح انسانوں کی خوش حالی اور بدحالی تقاضاء فطرت ہے کہ غنی فقیر سے کام لے اور غنی اس کو اُجرت دے۔ غنی فقیر اور غریب کے عمل کا محتاج ہے اور غریب امیر کی اُجرت کا۔ اور اسی احتیاجِ باہمی سے انسانی تمدن کا ربط قائم ہے۔ ورنہ انسانی تمدن کا شیرازہ بکھر جائے گا اسی طرح امراض اور مصائب دنیا بھی حکمت سے خالی نہیں تاکہ صحت کی حالت میں شُکر کا جذبہ اور مصیبت اور مرض کی حالت میں صبر کا جذبہ ظہور میں آکر انسانی کمالات کے ظہور کا موجب بنے۔

۱۔ تناسخی مجازاۃ میں جُرم کا علم نہیں

اگر تناسخی مجازات کو تسلیم کیا جائے تو سزا جرم کے لیے تحقیق جُرم اور مجرم کیلیے اپنے جرم اور اسکی سزا کا علم ضروری ہے جیسے دنیا کی عدالتوں میں مروج ہے لیکن کسی حیوانی روح کو یہ پتہ نہیں کہ اس نے سابق کونسا جرم کیا ہے اور اُس کو کس جرم کی سزا میں حیوان کی قالب میں ڈالا گیا ہے لہذا تناسخ نامعقول ہے

۳۔ تعداد موت و ولادت کا تفاوت تردید تناسخ ہے

اگر حیوانات کی پیدائش انسانی رُوحوں کو بسبب جرائم کے حیوانی قالبوں میں ڈالنے کا نتیجہ ہے جیسے تناسخ والوں کا خیال ہے تو چاہیے کہ جتنے مجرم اور گنہگار انسان مرجائیں بعینہٖ اتنی تعداد میں حیوانات کی پیدائش ہو کیونکہ اُنہی فوت شدہ مجرم انسانوں کی رُوحوں کی حیوانات کے قالب میں پڑنے سے اُن کی تعداد کے موافق حیوانات کی حیات و پیدائش کا حاصل ہونا ضروری ہے لیکن اگر کسی دن ایک لاکھ انسان مرتے ہیں جن میں نصف یا کچھ زیادہ مجرم ہوتے ہیں تو اُسی تعداد کے مطابق کیڑے مکوڑے اور دیگر حیوانات پیدا نہیں ہوتے بلکہ کروڑوں، اربوں حیوانات ایک دن میں پیدا ہو جاتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حیوانات کی پیدائش مجرم روحوں کی تناسخی چکر اور گردش کا نتیجہ نہیں بلکہ ابتدائی تخلیق کے طور پر حیوانات پیدا ہوتے ہیں اس لیے نظریہ تناسخ غلط ٹھہرا۔

۴۔ تناسخ کی تردید کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اگر تناسخ مان لیا جائے تو انسان اور حیوانات کی روحوں کی وحدت کا قائل ہونا پڑے گا کہ درحقیقت حیوانات کی رُوحیں بھی انسانی رُوحیں ہیں جو جُرم کے سبب سے حیوانات کی قالب میں آئی ہیں لیکن دونوں رُوحوں کا مختلف ہونا ظاہر ہے۔ کہ انسانی روحیں عاقل و ناطق ہیں لیکن حیوانی رُوحیں ایسی نہیں۔ دوم یہ کہ اگر بلی میں مثلاً انسانی رُوح ہے تو انسانی قالب میں اُس کو چوہا کھانے سے نفرت تھی تو پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ بلی کے قالب میں وہی چوہا کھانے سے نفرت کرنے والی رُوح یکدم اپنی فطری نفرت

چھوڑ کر چوہے کے پیچھے دوڑنے پر آمادہ ہو گئی۔ یہ فوری انقلاب فطرت نامعقول ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ حیوان کی روح جداگانہ فطرت رکھتی ہے جو انسانی روح سے مختلف ہے۔ اس لیے تناسخ غلط ہے جب مجازاۃ اعمال کی دو شکلیں صرف روحانی معاد اور تناسخ چکر باطل اور نامعقول قرار پا گئیں تو حق شکل مجازاۃ کی ایک باقی رہ گئی۔ وہ یہ کہ مُردوں کے ذرات بدن کو مجتمع کر کے بدن تیار ہو اور ان میں ان کی رُوحوں کو ڈال کر زندہ کر کے مجازاۃ اعمال کے لیے عدالت الٰہیہ میں پیش کر کے دوزخ و جنت کی شکل میں اُن پر قانون مجازاۃ کو نافذ کیا جائے جو نہ صرف بلحاظ نقل تمام شرائع سماویہ اور انبیاء کرام کے تواتر سے ثابت ہے بلکہ عقل و فلسفہ کے لحاظ سے بھی موزوں و معقول ہے اور اس میں کوئی استبعاد نہیں۔ بظاہر اسلامی مجازاۃ کی یہ صورت اگرچہ ظاہر بین حضرات کی نگاہ میں دشوار یا مستبعد نظر آتی ہے لیکن حقیقت پر نگاہ ڈالنے کے بعد اس میں کوئی استبعاد نہیں۔ معاد جسمانی کی حقیقت دو امر سے مرکب ہے ایک یہ کہ معاد کا اصل واقعہ بلحاظ عقل ممکن ہے محال نہیں کیونکہ محال کا ایک عرفی معنی ہے یعنی کسی امر کا دشوار ہونا جیسے ایک آدمی کو دوسرا آدمی کہے کہ میرے ساتھ لاہور جاؤ وہ کہے کہ مجھے عذر ہے گھر میں بیمار ہے نہیں جا سکتا۔ پھر بھی وہ اصرار کرتا ہے کہ تم کو میرے ساتھ جانا پڑے گا جس کے

معادِ جسمانی کی پہلی دلیل

جواب میں وہ کہتا ہے کہ یہ ممکن نہیں کہ میں جاؤں یعنی محال ہے۔ بظاہر یہ ناممکن دشوار کے معنی میں ہے نہ یہ کہ لاہور جانا اس کے لیے عقلاً ناممکن ہے کیونکہ اس کہنے کے بعد اگر وہ لاہور جانے کا ارادہ کر کے ریل کا ٹکٹ لے لے تو جا سکتا ہے۔ دوسرا معنی ناممکن اور محال کا یہ ہے جس کو فلسفہ میں ناممکن کہا جاتا ہے جیسے دو دُونے پانچ یا نفی اور اثبات کا ایک وقت میں ایک محل میں جمع ہونا ایسا محال اور ناممکن واقعی طور پر موجود نہیں ہو سکتا مثلاً یہ کہ زید ایک خاص کمرے میں ایک وقت میں موجود بھی ہے اور موجود نہیں بھی ہے۔ قیامت اور معاد اس معنی میں محال نہیں کیونکہ بیک وقت نفی اور اثبات کا ایک محل میں جمع ہونا ممکن نہیں۔ اس وقت دنیا میں قیامت موجود نہیں اور وقت مقررہ میں

موجود ہوگا۔ موجود ہونا اور نہ ہونا دونوں کسی وقت بھی مجتمع نہیں تاکہ نفی اور اثبات بیک مجتمع ہونے سے محال لازم آئے۔ تمام عقلی اور فلسفی ناممکنات یا محالات کی بنیاد یہی ہے کہ اس میں بیک وقت نفی اور اثبات کا اجتماع ہو۔ دو دُو نے پانچ بھی اس حقیقت کے پائے جانے کی وجہ سے محال ہے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں اور چار ایسا عدد ہے جو پانچ نہ ہو اور جب ہم دو دُو نے پانچ کہتے ہیں تو اُس کو پانچ تسلیم کرتے ہیں تو گویا ہم نے ایک ہی عدد کے متعلق نفی اور اثبات کو جمع کر دیا کہ پانچ نہیں اور پانچ ہے جو محال ہے لیکن قیامت جب ممکن ہے اور متواتر خبر صادق نے اس کی تصدیق کر دی ہے تو پھر اس کے صحیح ہونے میں شک نہیں کیونکہ ہر ممکن امر کی جب تواتر کے ساتھ اس کی تصدیق ہو جائے یا قابل اعتماد ذرائع سے اس کا ثبوت مل جائے تو پھر اس کے واقع ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ مثلاً گذشتہ زمانے میں یہ خبر کہ جاپان کا ہیروشیما ایٹم بم سے تباہ ہوا ایک ممکن معاملہ تھا۔ جب قابلِ اعتماد اطلاع سے اس کی تصدیق ہوئی تو تمام دنیا نے اس کو درست تسلیم کیا۔ اسی طرح موجودہ دنیا کا نفخۂ اسرافیلی سے برباد ہو جانا جو کہ اربوں درجہ ایٹم سے قوی چیز ہے ممکن امر ہے جب آسمانی کتابوں اور انبیاء علیہم السلام جیسے راست بازوں کی متواتر شہادت اس کی تصدیق کر چکے ہیں تو پھر اس کے واقع ہو جانے میں کیا شبہ کیا جا سکتا ہے۔

معادِ جسمانی کی دوسری دلیل

معادِ جسمانی کی دوسری دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ معادِ جسمانی کی حقیقت تخریب اور تعمیر ہے یعنی موجودہ نظامِ دنیا کو درہم برہم کرنا یہ تخریبِ دُنیا ہے اور اس کے بدلے میں جہانِ آخرت کی تعمیر، یہ دونوں کام معادِ جسمانی کی حقیقت ہیں۔

اور یہ دونوں کام فعلِ الٰہی ہیں فعلِ انسانی نہیں۔ اب اگر کوئی انسان اس کو دشوار سمجھے تو اپنی محدود اور ناقص قوت وقدرت کے پیشِ نظر اس کو دشوار سمجھے گا لیکن خالقِ کائنات کی قدرت کے اعتبار سے اس میں کوئی دشواری نہیں کیونکہ کسی کام کا آسان اور مُشکل ہونا فاعل کے اعتبار سے

ہوتا ہے۔ مثلاً بیس من بوجھ اٹھانا چیونٹی کے لیے دشوار ہے لیکن ہاتھی کے لیے آسان ہے حالانکہ چیونٹی اور ہاتھی دونوں مخلوق ہونے اور حیوان ہونے میں برابر ہیں لیکن خالق اور مخلوق میں تو کوئی برابری نہیں تو اگر انسان مخلوق کے لیے دنیا کی تخریب و تعمیر دشوار ہو تو اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ خالقِ کائنات کی قدرت کے لحاظ سے بھی دشوار ہو حالانکہ دنیا کی موجودہ عمارت اسی خالقِ کائنات کی بنائی ہوئی ہے اور بگاڑنا بنانے سے آسان ہے تو اگر ہم انسان اور مخلوق ہونے کے باوجود جب کوئی بڑی سے بڑی عمارت بنا دیتے ہیں تو ہم اس کو گرا کر اس کی جگہ دوسری عمارت بنا دینے کی قدرت رکھتے ہیں تو کیا خالقِ کائنات کو یہ قدرت نہیں کہ اپنی بنائی ہوئی عمارتِ دنیا درہم برہم کر کے اس کی جگہ آخرت کی عمارت کھڑی کر دے یقیناً وہ ایسا کر سکتے ہیں اور یہی معاد جسمانی اور قیامت ہے جس کی صحت و صداقت عقلاً ثابت ہو گئی

ثبوتِ قیامت اور معاد جسمانی کی تیسری دلیل

قیامت میں مجازاتِ اعمال کیلئے انسان کو دوبارہ زندہ کرنا ہے چونکہ خالق کائنات نے انسان کو پہلی مرتبہ زندگی عطا فرمائی جو مشاہدہ میں آتی ہے اور اس وقت انسان کا نام و نشان نہ تھا۔ هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا (سورۃ الدہر آیۃ ۱) انسان پر ابتدائی وجود سے قبل ایسا وقت آیا ہے کہ معدوم ہونے کی وجہ سے قابلِ ذکر بھی نہ تھا اب دوبارہ زندہ کرنا عقلاً زیادہ قرین قیاس ہے۔ اگر ایک معمار پہلی مرتبہ ایک مکان بنا چکا ہو تو دوبارہ ویسا مکان یا اس سے بھی عمدہ مکان بنانا اس کیلئے کوئی دشوار نہیں ہوتا۔ اس کی طرف قرآن نے انسان کو توجہ دلائی ہے۔

كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ؕ وَعْدًا عَلَيْنَا ؕ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ؕ (سورۃ الانبیاء آیۃ ۱۰۴)

ہم نے انسان کو پہلی بار بنایا دوبارہ بھی ایسا ہی بنائیں گے۔ یہ ہمارا پختہ وعدہ ہے۔ ہم ضرور ایسا کریں گے

وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ؕ

انسان ہم پر مثال بتلاتا ہے کہ بوسیدہ

قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝	ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا۔ وہ اپنی پیدائش
قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ	بھول گیا کہ وہ جس نے پہلی بار بنایا
اَوَّلَ مَرَّةٍ ط (یٰس: ۷۸، ۷۹)	وہی دوبارہ زندہ کرے گا۔

بلکہ دوسری آیت میں ہے: وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ: بلکہ دوبارہ پیدا کرنا پہلے کی نسبت زیادہ آسان ہے۔
اس سے قیامت کا ہونا عقلی رنگ میں ثابت ہوا۔ یہ آسانی بھی قدرت انسان کے اندازے پر ہے۔ ورنہ قادرِ مطلق کے لیے سب صورتیں یکساں آسان ہیں۔

وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى۔	اس کے لیے اعلیٰ کمال ہے۔

معاد کی چوتھی دلیل

عام قانون ہے کہ اگر دو کام ایک ہی نوعیت کے ہوں تو اگر کوئی فاعل اسی نوعیت کا مشکل کام کر سکتا ہو تو آسان کام ضرور کر سکتا ہو گا۔ مثلاً ایک درزی جب کوٹ اور شیروانی سی سکتا ہے تو چادر سینا جو کوٹ شیروانی سے آسان ہے اُس کو یقیناً سی سکتا ہو گا کیونکہ دونوں ایک نوعیت کی چیزیں ہیں یعنی خیاطت کی قسم سے ہے۔ اسی طرح ڈیڑھ دو من انسان کی نسبت آسمان و زمین کی تخلیق جو کروڑوں من کی مخلوق ہے جب خدا نے ان کی تخلیق کی ہے تو انسان جو چھوٹی مخلوق ہے اس کی دوبارہ تخلیق اس کے لیے کیا مشکل ہے کہ دونوں کام ایک نوعیت کے ہیں یعنی از قسم تخلیق جو مخلوقِ اکبر کی تخلیق کر سکتا ہے تو مخلوق اصغر کی تخلیق کیوں نہیں کر سکے گا

قرآن نے کہا ہے

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ	کیا تمہارا بنانا مشکل ہے یا آسمان کا جس
بَنٰهَا۔ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا۔	کو اللہ نے بنایا اور بہت بلند جگہ پر
(النّٰزعٰت: ۲۸)	رکھا اس کو

یعنی آسمان عظیم کی تخلیق کی قدرت سے سمجھ لو کہ تم انسانوں کی دوبارہ تخلیق یقیناً خدا کی قدرت میں داخل ہے لہٰذا عقلاً انسان کی دوبارہ زندگی معقول ہے۔

مجازاۃِ اعمال اور معاد کی پانچویں دلیل کل کائنات جو انسان کے علاوہ ہے وہ انسان کی خدمت اور فائدہ رسانی کے لیے بنائی گئی ہے۔ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ اے انسان تمہارے کام اور خدمت میں اللہ نے لگا دیا تمام آسمانی اور زمینی کائنات کو اور انسان کو اللہ نے طاعت اور عبادتِ خداوندی کے لیے بنایا ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ۔ ہم نے جن اور انسان کو خدا کی عبادت کے لیے بنایا ہے۔ اور عبادت کا نتیجہ اس کے ثمرات ہیں۔ اب اگر قیامت یا دوبارہ زندگی اور مجازاۃ اعمال اور جنت و دوزخ کچھ نہیں تو عبادت کا نتیجہ کچھ نہ نکلا اور جب عبادت بے نتیجہ اور لغو ثابت ہوئی تو انسان کی تخلیق بھی عبث ہوئی تو پورے کارخانۂ کائنات کی تخلیق کا وجود بھی عبث ہوا تو خالقِ کائنات کا پورا تخلیقی عمل عبث اور بیکار ثابت ہوا جو اس کی شانِ حکمت کے خلاف ہے۔ لہذا نتائج اعمال انسان کا ظہور بشکلِ قیامت و آخرت ضروری ہے کہ دنیا میں اس کا ظہور نہیں تاکہ خداوند تعالےٰ کا کل کارخانۂ عمل عبث نہ ہونے پائے اور کارخانۂ عالم میں اور انسان کی تخلیق میں جو اس کی حکمت ہے وہ ظہور پذیر ہو جس سے عقلاً قیامت کا ثبوت ضروری ہوا۔

مجازاۃ اعمال اور قیامت کی چھٹی دلیل قرآن نے اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى (کیا انسان گمان کرتا ہے کہ اس کو بیکار چھوڑے گا؟) میں اسی مضمون کی طرف توجہ دلائی ہے اسی طرح اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ۔ کیا تم گمان کرتے ہو کہ ہم نے تم کو عبث پیدا کیا ہے اور تم نتائجِ اعمال پانے کے لیے قیامت میں ہمارے پاس لوٹ کر نہ آؤ گے؟ دنیا میں نیک و بد ہر طرح کے انسان موجود ہیں، کوئی فیض رساں ہے کوئی ظالم، کوئی

لـه ۔۔۔ ۔۔۔ ٢ـه المؤمنون آیۃ ۱۱۴

اللہ کا تابعدار کوئی اللہ سے باغی، کوئی عادل کوئی مفسد کوئی متقی کوئی فاجر۔ لہذا اللہ کے وصفِ عدل کیلئے جس پر اقوامِ عالم کا اتفاق ہے یہ ضروری ہے کہ دونوں کے ساتھ سلوک اور خدا کا طرزِ عمل یکساں نہ ہو ورنہ اللہ کا عدل ظاہر نہ ہوگا۔ خود انسانی بادشاہ بھی اپنے وفادار اور باغی کے ساتھ برابر سلوک نہیں کرتا۔ وفادار کو انعام دیتا ہے اور باغی کو سزا اور اس کے خلاف کارروائی کو عدل و حکمت کے خلاف سمجھتا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس دنیوی زندگی میں نیک و بد انسانوں کے ساتھ یکساں سلوک نظر آرہا ہے بلکہ بسا اوقات باغی ظالم اور بدعمل انسان عیش اڑا رہے ہیں اور بہت سے خداترس عادل بے ضرر اور نیک افراد تنگی اور سختی میں مبتلا ہیں تو اگر اس زندگی کے بعد آخرت کی کوئی دوسری زندگی نہیں تو خالقِ کائنات کا نہ عدل ظاہر ہوگا نہ حکمت۔ اس لیے ضروری ہوا کہ اس زندگی کے بعد دوسری اُخروی زندگی موجود ہو تاکہ اس میں عادل و باغی، نیک اور بد انسانوں کے ساتھ اُن کے اعمال مطابق سلوک ہو اور اللہ کی حکمت اور عدل نمایاں ہوسکے۔ وہی قیامت اور روزِ مجازاۃ اعمال ہے جو عقلاً ضروری ثابت ہوا۔ قرآن نے اسی کی طرف اس آیت میں توجہ دلائی ہے۔

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِى الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ

کیا اگر آخرت نہیں تو ہم اللہ پر یقین کرنے والوں اور نیکو کاروں کو مفسدوں کے برابر رکھیں گے اور خداترسوں کے ساتھ بدکرداروں کی طرح سلوک کریں گے؟ ہرگز نہیں۔

قیامت اور مجازاۃ کی ساتویں دلیل

یہ ایک قانونی ضابطہ ہے کہ ہر مرکب چیز کے لیے بسائط اور مفردات کا ہونا ضروری ہے۔ مثلاً اگر اصل مرکب ہو جیسے انسان جو چار عناصر پانی مٹی ہوا آگ سے مرکب ہے تو اس مرکب کے لیے خالص مفردات بھی موجود ہیں۔ مثلاً خالص پانی، خالص مٹی خالص آگ کہ یہی مفردات بدن انسان کے اندر جو پانی مٹی، ہوا، آگ موجود ہے۔ ان کا خزانہ اور مرکز ہے۔ اسی طرح مصنوعی مرکب مثلاً شربت سکنجبین

ایک مرکب ہے جس کے اجزا میں پانی، سرکہ چینی ہے تو تینوں اجزاء خالص صورت میں سکنجبین سے باہر موجود ہیں۔ یہ قانون اور ضابطہ اعیان و اعراض، جواہر و اوصاف دونوں پر حاوی ہے مثلاً اگر کسی کپڑے میں ایسا رنگ ہو جو سیاہ اور سرخ رنگ سے مرکب ہو تو اس کپڑے سے باہر اس مرکب رنگ کے خالص مفردات موجود ہیں یعنی خالص سیاہ رنگ اور خالص سرخ رنگ۔ اب ہم اس ضابطہ کے تحت دیکھتے ہیں کہ دنیا کی زندگی غم اور خوشی سے مرکب ہے۔ نہ خالص خوشی موجود ہے نہ خالص غم۔ بڑا خوشحال شخص بھی صرف خوشی سے بہرہ یاب نہیں بلکہ غم بھی اس کو لاحق ہے کیونکہ وہ بوڑھا ہوتا ہے، بیمار ہوتا ہے، مرتا ہے اس کے اقارب واحباب مرتے ہیں۔ مال اور اقتدار اور عزت میں فرق آتا ہے۔ یہ سب غم ہے اور بڑے سے بڑا مغموم تنگدست آدمی بھی کوئی نہ کوئی خوشی رکھتا ہے۔ ہوا میں سانس لیتا ہے، پانی پیتا ہے، روٹی کھاتا ہے۔ یہ سب خوشی ہے۔ اب انسانی حیات جو غم و خوشی کا ایک مرکب ہے۔ اس مرکب کے ہر دو جز کے لیے خالص مفرد کا ہونا بھی ضروری ہے کہ وہ اس مرکب کے اجزاء کا مخزن ہو۔ یعنی ایک مرکز خالص غم کا ہونا ضروری ہے جس میں خوشی نہ ہو اور ایک مرکز خوشی و مسرت کا ہونا ضروری ہے جس میں غم کا نام و نشان نہ ہو یہ دو مرکز اس دنیا میں ناپید ہیں بناء برآں قیامت اور آخرت کا وجود ضروری ہے جس میں صرف دو مرکز ہوں۔ ایک صرف غم کا یعنی دوزخ اور دوم صرف خوشی کا یعنی جنت تاکہ مخلوط مرکب کے لیے۔ جو دنیاوی زندگی ہے خالص مفردات کا وجود متحقق ہو سکے لہذا اس سے قیامت، دوزخ اور جنت کا ثبوت ثابت ہوا۔

قیامۃ اور مجازاۃ اعمال کی آٹھویں دلیل

انسانی افراد میں کچھ صالح ہیں اور کچھ مفسد اس لیے تمام انسانی افراد ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں قیمتی اور اعلیٰ اجزا بھی ہیں اور خسیس اور کم درجے کے اجزاء بھی ہیں۔ جس طرح گندم کے پودے میں خوشے کے اندر جو گندم کے دانے ہیں وہ قیمتی ہے اور باقی گندم کا پودا انسان کے کھانے کے لائق نہیں۔ بلکہ مویشیوں کی خوراک ہے اس لیے گندم کے پودوں کو کھلیان میں روندنا پڑتا ہے۔

ہے تاکہ اعلیٰ اور ادنیٰ اجزاء یعنی دانے اور بھوسا الگ ہو جائے اور ہر ایک کو اس کے مناسب ٹھکانے پر پہنچا دیا جائے چنانچہ روندنے اور رگڑے اور رگڑنے کے بعد ہوا کے ذریعہ بھوسا اور غلہ کو الگ الگ کر کے بھوسہ مویشیوں کے معدہ میں اور غلہ انسان کے معدہ میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ اسی طرح قیامت میں ابرار و فجار اخیار و اشرار کا میدان حشر کے کھلیان میں امتیاز ضروری ہے وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ (لیٰس آیۃ ۵۹) اے مجرمو نیکوکاروں سے الگ ہو جاؤ۔ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا (النباء آیۃ ۱۷) نیک و بد انسانوں کی جدائی اور الگ الگ کرنے کے دن کی تاریخ مقرر ہے تاکہ اخیار اور صالح اجزاء کو اس کے مناسب ٹھکانے یعنی جنت میں پہنچا دیا جائے گا کہ یہ اس کا فطری مقام ہے اور اشرار کو ان کے ٹھکانے یعنی جہنم میں پہنچا دیا جائے گا کہ ان کا فطری مقام یہی ہے جس سے نہ صرف قیامت ثابت ہوئی بلکہ جنت اور دوزخ کا بھی ثبوت ہوا۔ گویا جنت کو انسانی معدہ اور دوزخ کو حیوانی معدہ کی طرح سمجھو اور ابرار و اشرار کو غلہ اور بھوسے کی طرح سمجھو لو۔

قیامت اور مجازاۃ کی نویں دلیل

انسان کی فطرت میں راحتِ خالصہ کی تڑپ اور مسرت کا ولولہ فطرتاً موجود ہے اور ہر فرد انسانی کی یہ تمنا اور آرزو ہے کہ اس کو خوشی نصیب ہو اور غم و الم سے محفوظ رہے۔ یہ تمنا تمام افراد اور سب اقوام کو ہے اور کوئی فرد اور قوم ایسی نہیں جو اس تمنا اور خواہش سے خالی ہو جس سے معلوم ہوا کہ یہ انسان کی فطری تمنا ہے جو فطرتِ انسانی کے لوازمات میں سے ہے۔ اب اس تمنا کا پورا ہونا یا ممکن ہوگا یا ناممکن۔ ناممکن تو ہو نہیں سکتا کہ ناممکن امر کی خواہش پر تمام افرادِ انسانی متفق نہیں ہو سکتے مثلاً انسان کے لیے اس دنیا میں سانس لیے بغیر زندہ رہنا ناممکن ہے۔ تو ایک انسان بھی ایسا دستیاب نہیں ہو سکتا کہ اس کی یہ تمنا ہو کہ وہ سانس کا محتاج نہ رہے اور زندگی گذارے اس لیے راحتِ خالصہ کی تمنا امر ممکن ہے ورنہ اس کی خواہش پر تمام انسان کیونکر متفق ہوتے اب جب ممکن ہوئی تو اب یہ دیکھنا ہے کہ کیا یہ تمنا اس دنیا کی زندگی میں پوری ہو سکتی ہے؟ قطعاً پوری نہیں ہو سکتی۔ اب اگر دنیا کے

سوا کوئی اور جہاں یا دورِ زندگی ایسا نہ ہو جس میں یہ تمنا پوری ہو سکے تو یہ خلافِ فطرت اور خلافِ عقل ہے کہ قدرت کی طرف سے ایک ایسے اعلیٰ فطری جذبے کی تکمیل کا کوئی انتظام نہ ہو اور پھر بھی اس جذبہ کو قدرت نے فطرتِ انسانی میں گاڑ دیا ہو جس کے تمام دیگر فطری جذبات خوراک پینا سانس لینا، نکاح کرنا سب کے لیے قدرت نے انتظام مہیا کیا ہے اس لیے تسلیم کرنا پڑے گا کہ جذبۂ راحتِ خالصہ اور غم سے نجات کا انتظام بھی اُس نے کیا ہے لیکن دنیا میں نہیں کسی اور دورِ زندگی میں۔ دنیا میں ایسا انتظام ممکن نہیں زمین کا دائرہ تنگ ہے اور دنیا عالمِ کون وفساد و تغیرات ہے۔ اس میں ایک بادشاہ کے لیے بھی خالص خوشی اور غم سے نجات ناممکن ہے۔ بادشاہ بوڑھا ہوتا ہے جو جوانی کی نسبت غم ہے اور ضرر ہے۔ بیمار ہوتا ہے جو صحت کی نسبت غم اور ضرر ہے دشمن کا خطرہ اور رعیت کی بغاوت کا اندیشہ بھی ہوتا ہے جو غم ہے اور سب سے بڑھ کر خویش واقارب اُس کے مرتے ہیں جو غم ہیں اور مزید براں خود بھی اُس کو موت پیش آتی ہے جو تمام غموں سے بڑھ کر ہے۔ یہ سب تغیرات اس دار الفنا کے لیے امورِ لازمہ ہیں اور اس جہان کی زندگی کے ضروری اجزاء ہیں جو اس سے جُدا نہیں ہو سکتے جیسے گرمی آگ سے جُدا نہیں ہو سکتی۔ دُنیا تنگ ہے اگر موجودہ لوگ زندہ رہیں اور نئے بھی پیدا ہوں تو زمین میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہے گی اور نقل وحرکت اور غذا کے لیے زراعت کا نظام معطل ہو جائے گا۔ اس لیے اس جہاں کا ختم ہونا اور ایک وسیع جہان کا موجود کرنا ضروری ہے تا کہ یہ فطری تمنا پوری ہو سکے۔ اس جہان فانی کا ختم کرنا اور جہانِ بقاء کو موجود کرنے کا نام قیامت ہے۔ جس میں ابدی اعمال کے بدلے اور جزاء میں جنت کی زندگی نصیب ہو کر اس فطری تمنا انسان کی تکمیل ہو گی کیونکہ جنت میں قرآنی بیان کے مطابق لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ (البقرۃ آیۃ ۳۸) نہ کسی کو غم ہو گا اور نہ کسی ڈر کا اندیشہ۔ وَلَكُمْ فِيْهَا مَاتَشْتَهِىْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَاتَدَّعُوْنَ. (حٰمٓ السجدہ آیۃ ۳۱) تم کامل انسانوں کیلئے جنت میں وہ سب کچھ ملے گا جو تمہارا جی چاہے اور جس کو تم طلب کرو گے۔ وہاں جوانی ہو گی بڑھاپا نہ ہو گا۔ صحت ہو گی مرض نہ ہو گا۔ غناء ہو گا محتاجی نہ ہو گی زندگی ہو گی موت نہ ہو گی

جس سے آخرت قیامت اور جنت کا ثبوت عقلاً ثابت ہوا اور اور جب جنت مرکز مسرت وخوش
حالی موجود ہوگی تو جنت کی ضد دوزخ بھی خدا اور آخرت فراموشوں کے لیے ہوگی جس میں راحت
کا نام ونشان نہ ہوگا اور مصائب وآلام کا مرکز دائمی ہوگا کیونکہ ضد کے ساتھ دوسری ضد نظام
قدرت وعدالت کے تحت ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ جو قوم جنت کی قائل ہے وہ دوزخ کو
بھی مانتی ہے۔ سردی کے مقابلے میں گرمی، رات کی تاریکی کے مقابلے میں روشنی کا وجود ضروری
ہے کہ یہ جنت ودوزخ اعمال دنیا کے نتائج ہیں دنیا عالم اضداد تھی تو نتائج کا بھی متضاد ہونا
لازمی ہے۔ اعمال میں ایمان اور اس کے مقابلے میں کفر، طاعت کے مقابلے میں گناہ اور معصیت
عدل کے مقابلے میں ظلم موجود تھا۔ جو باہم متضاد تھے تو اُن کے نتائج میں بھی بشکل دوزخ وجنت
غم وخوشی کا تضاد ضروری ہے۔

قیامت اور مجازاۃ اعمال کی دسویں دلیل

اصلاح بشری تمام اقوام عالم کو محبوب ہے کہ کوئی انسان نہ خدا کا حق تلف کردے اور نہ انسانوں کا
کا حق تلف کردے تاکہ انسانی زندگی، امن واطمینان اور خوش حالی کے ساتھ گذرے اس لیے مختلف
اقوام نے بشری اصلاح کے لیے مختلف انتظامات ہر دور میں کئے ہیں اور مختلف ادارے بنائے
ہیں لیکن اصلاح وجود میں نہ آئی۔ اصلاح کے عقلی اسباب تین ہیں۔ ا تعلیم۔ ۲۔ قانون حکومت۔
۳۔ عقیدہ مجازاۃ اعمال۔

پہلا سبب یعنی تعلیم سے انسان نیک وبد سے واقف تو ہو جاتا ہے لیکن تعلیم انسان کو
آمادہ عمل نہیں بنا سکتی۔ نیک اور بد جاننا اور چیز ہے اور نیکی کرنا اور بدی چھوڑنا اور چیز ہے تعلیم سے
پہلی چیز حاصل ہوتی ہے دوسری نہیں۔

دوسرا سبب قانون بھی اصلاح بشری کے سلسلے میں سو فیصدی کامیاب نہیں کیونکہ جرائم
کا ارتکاب رُوح کرتی ہے اور جب تک روح میں پاکیزگی اور انقلاب پیدا نہ ہو تو جرائم بدستور
صادر ہوتے رہیں گے۔ قانون مجرم کو سزا دلانے میں پوری طرح کامیاب نہیں بوجوہات ذیل:

۱۔ ہر جگہ قانون کی حکومت نہیں ہوتی۔ آزاد علاقوں میں نہ قانون ہے نہ حکومت۔

۲۔ اگر کہیں حکومت اور قانون موجود ہو تو بسا اوقات مجرم جرائم کا ارتکاب ایسی جگہ اور ایسے وقت میں کرتا ہے کہ کوئی گواہ اور شاہد موجود نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں وہ قانونی سزا سے بچ جاتا ہے اور اصلاح کا کام ناتمام رہ جاتا ہے۔

۳۔ اگر گواہ موجود ہوں تو ایسے مواقع بھی پیش آجاتے ہیں کہ گواہ سچی گواہی دینے کیلئے آمادہ بھی نہیں ہوتا

۴۔ اگر کسی وقت شہادت کے لیے آمادہ بھی ہوجائے تو مدعیٰ علیہ کی طرف سے ترغیب یا ترہیب یعنی مالی لالچ یا ضرر رسانی کی دھمکی اس کو سچی شہادت سے روک دیتی ہے۔

۵۔ اگر سچی شہادت دینے کی نوبت آ بھی جائے تو فریق مخالف کے وکیل گواہوں پر جرح کر کے گواہی کو مشکوک بنا کر شہادت کو بے اثر کر دیتے ہیں جس سے مجرم سزا سے بچ جاتا ہے۔

۶۔ اگر بالفرض جرح کے بعد بھی شہادت درست ثابت ہوئی تو فیصلہ جج کے ہاتھ میں ہے وہ غلطی بھی کر سکتا ہے خاص کر جب روح میں تقویٰ نہ ہو۔ اور رشوت اور سفارش کے تاثر سے متاثر بھی ہو سکتا ہے جس سے مجرم سزا یابی سے بری ہو سکتا ہے۔

۷۔ اگر بالفرض سزا ہوئی بھی تو ضروری نہیں کہ وہ سزا جرم کی نوعیت کی سنگین انداز پر ہو۔

ان سب احتمالات کے ہوتے ہوئے قانون کس طرح جرائم کو روک سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قانون اور سزاؤں کے باوجود جرائم اور قیدیوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے

اسی لیے اصلاحِ بشری کا کام قلب وضمیر سے شروع کرنا ضروری ہے تاکہ جرائم صادر نہ ہونے پائیں اور صدور کی صورت میں اس کو ہر حال میں سزا دی جائے۔

اصلاح کی بنیاد قلب وضمیر میں عقیدہ مجازاۃ اعمال کی پختگی اور یقین قیامت ہے جس سے یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ ہر جرم اور حق تلفی درحقیقت اپنی تباہی آخرت کا سامان کرنا ہے اور چند روزہ فانی فوائد کے بدلے دوامی مصیبت میں مبتلا ہونا ہے جو کسی عقلمند کا کام نہیں۔ یہی عقیدہ مجازاۃ تھا جس نے ڈاکوؤں اور لیٹروں کو فرشتہ خصلت بنایا اور اسی عقیدے

کی پختگی سے جن کے دل ودماغ روشن ہونے وہاں سے جرائم، ظلم اور حق تلفی کا نام ونشان مٹ گیا اصلاح بشری کا یہی واحد مجرب نسخہ ہے جس نے تجربات اور مشاہدات کے ذریعے اپنے اصلاحی اثرات سے دنیا کو روشناس کیا ہے۔ اس لیے اصلاح بشری کے زاویہ نگاہ سے قیامت، اور مجازاۃ اعمال کا جزو یقینی ہے ورنہ اس یقین یکجا ہونے کی صورت میں انسانیت اغراض اور مفادات اور جلب منفعت اور خون ریزی کا مجسمہ بن کر دنیا کو جہنم کدہ بنا دے گی اور بنا چکی ہے۔

قیامۃ اور مجازاۃ کی گیارھویں دلیل

انسان کائنات کا قیمتی جز ہے لیکن اس کی عمر اور حیات مختصر ہے۔ آسمان، زمین، پہاڑ طویل اور دراز مدت سے قائم ہیں لیکن انسان کی زندگی ایک مختصر شعلہ ہے جو موت کے ایک جھونکے سے بجھ جاتا ہے حالانکہ اگر کسی آدمی کے گھر ایک برتن مٹی کا ہو اور دوسرا سونے کا۔ تو سونے کا برتن دیرپا ہوگا کر کوئی مالک اپنے سے قیمتی چیز جلد جدا نہیں کرتا جس سے معلوم ہوا کہ انسان کی پوری زندگی یہی مختصر دنیوی زندگی نہیں بلکہ یہ انسان کی اس ابدی زندگی کی تمہید ہے جو اس کو جہان آخرت میں بعد از قیامت بطور جزاء اعمال کے نصیب ہوگی۔ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ لَھِیَ الْحَیَوَانُ یہ دوسری اخروی زندگی انسان کی حقیقی زندگی ہے جس کو زوال نہیں اور جس کی عمر لامحدود ہے تاکہ قیمتی انسان کی درازی عمر دیگر کائنات کی نسبت زیادہ ثابت ہو سکے اور قیمتی اشیاء کی دراز عمر کا ضابطہ خسیس اشیاء کے مقابلے میں پورا ہو سکے۔

مجازاۃ وقیامۃ کی بارھویں دلیل جدید سائنس کے تحت

ڈاکٹر عزاز احمد مکتب کے جدید مرد تحقیق میں انسان کی شخصیت کا ظہور تین چیزوں سے ہوتا ہے نیت، قول، فعل۔ نیت انسانی نفس کے تحت شعور میں محفوظ ہے۔ جب وہ کسی خیال کو بھولتا ہے اور پھر خواب میں دیکھتا ہے تو اس کو یاد آجاتا ہے اور قول ہوائی تموجات میں محفوظ ہے۔ جو ریڈیائی نظام کے ذریعہ منتقل ہو سکتا ہے جس کی رفتار فی سیکنڈ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل ہے۔ تمام اقوال فضا میں محفوظ ہیں لیکن وہ باہم مخلوط ہیں لیکن

تاہنوز آلۂ امتیاز ایجاد نہیں ہوا۔ ممکن ہے کہ آئندہ ایجاد ہو سکے۔ برخلاف ریڈیائی نظام کے کہ وہ طول میں مختلف لائنوں پر سوئی منطبق کر دینے سے مختلف جگہوں سے آوازوں کو منتقل کرتا ہے اور اختلاط نہیں ہوتا کیونکہ ہوائی لہریں طول میں جدا ہیں۔ اسی طرح ہر فعل میں ایک حرارت چھوڑ جاتا ہے جو قریب زمانہ میں جدید علم میں معلوم ہو سکتا ہے لیکن دراز زمانہ گذرنے کے بعد ایسا آلہ اس وقت نہیں کہ ان افعال کو فضا سے لیا جا سکے۔ ممکن ہے کہ مستقبل میں ایسا ہو سکے۔ اس سے آخرت کا وجود درست ثابت ہوتا ہے جس میں ندت قول اور فعل پر جو محفوظ ہیں ان کے نتائج مرتب ہو سکیں۔ اس کے علاوہ ماہرین ارضیات کی تحقیق کے مطابق بطن زمین میں تیرہ ۱۳۰۰ سو درجہ گرمی موجود ہے حالانکہ پانی ابالنے کے لیے سو درجہ گرمی کافی ہے۔ اس کے علاوہ سالانہ زمین سے ہزاروں زلزلے پیدا ہوتے ہیں، بعض محسوس بعض نامحسوس، یہ بھی اسی اندرونِ زمین کی گرمی سے پیدا ہوتے ہیں سمندروں کا کھارا پن وغیرہ یہ سب اس امر کی دلیل ہے کہ جہنم زمین اور سمندر کے نیچے ہیں اور یہ سب جہنمی اثرات ہیں۔

تفصیلاتِ قیامت

کیفیتِ قیامت

قیامت کی حقیقت دو امر ہیں، ایک تخریب عالم موجود، دوم تعمیر عالم آخرت، اور دونوں کو اللہ نے دو نفخوں سے وابستہ کیا ہے۔ اول نفخہ تخریب کے لیے ہے دوم نفخہ تعمیر کے لیے تخریب درحقیقت دنیا کی موت ہے۔ عام عادت کے مطابق موت سے قبل مرض ہی پیش آتا ہے۔ اور جب وہ مرض علاج سے درست نہ ہو تو مریض کا مرض اطباء اور ڈاکٹروں کی نگاہ میں لا علاج صورت اختیار کر کے مرض مہلک بن جاتا ہے اور پھر وہ شخص مر کر ہلاک ہو جاتا اسی ضابطہ کے تحت انسان کا اجتماعی وجود بھی جب وہ مریض ہو جاتا ہے اور کسی علاج

سے انسان کی ہیئتِ اجتماعیہ صحت پذیر نہیں ہوتی تو اس کا مرض لا علاج ہو کر اس کا اجتماعی وجود قریب الہلاک ہو جاتا ہے اور پھر اس پر ہلاکت کا قانون الٰہی نافذ ہو جاتا ہے۔ اور ماسوا انسان کائنات چوں کہ انسان کی خدمت کے لیے ہے جب انسان نہ ہو تو اس کی بھی ضرورت نہیں اس لیئے پوری کائنات آسمان و زمین کی ہلاکت و موت بھی انسان کی ہلاکت سے وابستہ ہو جاتی ہے اور انسان کی موت سے پوری دنیا اور کائنات پر بھی قانون ہلاکت و موت نافذ کر دیا ہے اور اس کا نام قیامت ہے اور قیامت سے قبل کی حالت دنیا کے لیے مرض الموت کی حالت۔ جس کو شریعت کی اصطلاح میں اشراط الساعۃ یا علامات قیامت کہا جاتا ہے۔ جیسے شخص موت سے پہلے مریض میں موت کے علامات نمایاں ہو جاتے ہیں اور ماہر ڈاکٹر و طبیب موت کا حکم لگا دیتے ہیں۔ علامات کے بعد شخص موت میں کچھ وقفہ ہوتا ہے لیکن عالمی موت میں اس کی وسعت کے پیشِ نظر علامات کبریٰ کے متحقق ہونے کے بعد کافی وقفہ ہوتا ہے۔

عالمی مرض الموت یا علامات قیامت

ایمان اور اس کے لوازمات اگر انسانوں کے مجموعی وجود میں متحقق ہوں تو یہ چیز عالم کے لیے بمنزلہ روحِ حیات کے ہے۔ اور جوں جوں اس میں کمی ہوگی تو اس قدر عالمی صحت کے لیے مرض ہے پھر اگر یہ مرض عالمگیر صورت اختیار کرے تو یہ عالمی ہلاکت یا قیامت کے لیے علامات کبریٰ اور مرض مہلک کی طرح ہے جس پر حسبِ ذیل احادیث شہادت دال ہیں۔

۱۔ ابن مسعودؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ قیامت شریر انسانوں پر قائم ہوگی۔ مسلم

۲۔ انسؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ جب تک اللہ اللہ کہنے والے مومن ہوں گے تو قیامت قائم نہ ہوگی۔

۲۔ حذیفہؓ حدیث نقل کرتے ہیں کہ قیامت قائم نہ ہوگی جب تک دنیا کا اقتدار بدترین لوگوں کے ہاتھوں میں نہ آئے گا۔ ترمذی۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ بدی کی عالمگیر قیامت یا ہلاکت عالم کی نشانی ہے اگرچہ ایماندار لوگ تھوڑے رہ جائیں گے تو مسلم میں حضرت عائشہؓ سے حدیث منقول ہے کہ اللہ ایک عمدہ ہوا بھیجے گا جس سے ان قلیل التعداد مومنوں کی روحیں قبض کی جائیں گی اور صرف بڑے لوگ رہ جائیں گے تو قیامت قائم کی جائے گی۔ ان حالات کے پیشِ نظر قیامت قائم کرنے میں یورپ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کے علوم و فنون نے ایمانی عقائد اور ایمانی اعمال کو ختم کیا جس کے دلائل حسبِ ذیل ہیں۔

ا۔ امریکہ کے ہم جنسیت پرستوں یعنی لواطت کے حامیوں کی انجمن کی ایک رپورٹ مندرجہ روزنامہ جنگ ۲۰ اپریل ۱۹۷۶ء میں درج ہے کہ امریکہ کی فوج میں ایک کروڑ ستر لاکھ ہم جنسیت پرست یعنی لواطت کرتے ہیں اور امریکہ کے عام آدمیوں میں ہر چوتھا آدمی لواطت میں مبتلا ہے۔ صرف برطانیہ میں چودہ لاکھ دہ حرامی بچے ہیں جن کی عمر ۱۶ ،۱۷ سال ہے۔ سالانہ حرامی بچوں کی پیدائش ستر ہزار ہے یہ اسقاطِ حمل اور برتھ کنٹرول کے علاوہ ہے۔ اوسطاً ہر چودھواں شخص حرامی ہے۔ ۱۹۴۸ء کی رپورٹ کے مطابق نوے فی صدی امریکی زنا اور ستر فیصد لواطت میں مبتلا ہیں۔ ان کا اندازہ ہے کہ امریکہ میں ۱۹۷۷ء تک ہر پانچواں بچہ حرامی ہوگا۔ رپورٹ ترجمان اسلام ۲۴ مئی ۱۹۶۸ء، خون ریزی کا جو مظاہرہ مغربی تہذیب نے کیا، وہ سابق جنگِ عظیم اور موجودہ جنگوں اور ایٹمی ہتھیاروں سے نمایاں ہے خدا اور اخلاق کا انکار عام ہے۔ سود و شراب جزءِ زندگی ہے۔ جھوٹ ریڈیو اسٹیشنوں اور اخبارات سے شائع ہونا کامیاب سیاست کی نشانی ہے۔ کیا یہ علامات عالمی موت کی دلیل نہیں پھر تعجب یہ کہ ان کو گناہ بھی نہیں سمجھا جاتا۔ چنانچہ انگلستان اور کینیڈا نے تالیوں کی گونج میں جوازِ لواطت کا قانون پاس کیا۔

نفخ الصور

نفخہ اولیٰ جمعہ کے دن اسرافیل فرشتے کے ذریعہ صور پھونکا جائے گا۔ اس میں تجلی جلالی کی ایسی پُرزور قوت ہوگی کہ اس کے خدائی اثر سے موجودہ نظامِ عالم درہم برہم ہو جائے گا یہ نفخ درحقیقت خدا کے وصفِ حمیت کا مظہر ہوگا جس سے ہر چیز علوی و سفلی پر موت و فنا طاری ہوگا۔ قرآن کا بیان ہے۔

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ط (سورۃ الزمر آیۃ ۶۸)	صور پھونکا جائے گا تو آسمان اور زمین کی کائنات ہلاک ہو جائے گی بجز ان کے جن کو اللہ ہلاک کرنا نہ چاہے

استثناء میں ہلاک سے مندرجہ ذیل چیزیں مستثنیٰ ہوں گی۔ دوزخ کے کارندے اور جنت اور اس کے حور و ولدان کہ ان کی تخلیق بقاء کے لیے ہے نہ فناء کے لیے۔ اور چار ملائکہ مقربین اور مدبرات الامر کہ ان سے کام لینا ہے اور شہداء کے ارواح کہ اُن کے ساتھ حیات کا وعدہ ہے بدور السافرۃ فی امور الاخرۃ میں مستثنیات کے دلائل حدیث مذکور ہیں بدور السافرۃ فی اُمور الاخرۃ میں بیہقی سے بروایت مقاتل منقول ہے کہ صور کے دائرہ کی وسعت آسمانوں اور زمین کی وسعت کے برابر ہے۔

نفخہ ثانیہ قرآن میں ہے۔ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ط (الزمر آیۃ ۶۸) صور کے دوبارہ پھونک سے فوت شدہ انسان اور حیوانات سب زندہ ہوں گے یہی ابن عباس سے بدور السافرہ میں منقول ہے طبرانی نے مقدم سے حسن سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ چھوٹے بچے سے بوڑھے تک زندہ ہو جائیں گے۔ باقی جو بچہ قبل از وقت گر گیا ہو تو اگر اُس کے اعضاء تام ہوں اور رُوح پھونکی

کئی ہو تو زندہ کیا جائے گا ورنہ نہیں. سب کی عمر ۳۳ سال کی ہوگی. یہ نفخہ مظہر ہوگا اللہ کی صفتِ محی کا. قرآن کی مذکورہ آیت کا معنی یہ ہے کہ پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو سارے مردگان کھڑے ہو کر دیکھتے ہوں گے. دونوں پھونکوں میں چالیس سال کا وقفہ ہوگا. (بخاری) اس عرصہ درمیانی میں چالیس دن عرش سے جمے ہوئے سفید پانی کی بارش ہوگی جو مردوں کی خاکی قالب پر برسے گی جس سے وہ انسانی صورتوں میں تبدیل ہوگی. بدور السافرہ میں ابوالشیخ کی روایت کے مطابق صور میں تمام ارواح کی تعداد پر سوراخ ہیں جن میں روحیں ہوں گی اور نفخہ سے اُڑ کر اپنی اپنی قالبوں میں داخل ہوں گی. ذراتِ ابدان کا اجتماع زلزلے کے ذریعہ ہوگا. جیسے قرآن میں ہے. اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ. ذرات جب خاکی قالب کی شکل میں خود یا بذریعہ مُدبّرات الامر متشکل ہوں گے. عرش سے وہ ماء الحیات یعنی آبِ حیات چالیس دن تک برستا رہے گا جس سے خاکی قالب لحمی قالب کی شکل اختیار کرے گی جس کو کبھی تغیر اور فنا نہ ہوگا. انسان کا پہلا وجود ماء الفناء اور زمینی پانی سے تھا اور یہ ماء الحیات اور عرشی آب سے ہے. ماء الحیات کا اطلاق ابوہریرہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے. پھر دوسرے نفخے سے تیار شدہ قالبوں میں روحیں منتقل ہو کر مُردے اُٹھ کھڑے ہوں گے.

بیان حکمتِ نفخ

دنیا کا نظام چونکہ مادی اسباب پر مبنی ہے اس لیے دنیا میں پیدا ہونا بھی تدریجاً ہے اور مرنا بھی تدریجاً. سب لوگ یکدم پیدا نہیں ہوتے اور نہ سب یکدم مرتے ہیں. بلکہ ولادت اور فوتیدگی دونوں تدریج اور آہستگی سے ہوتی ہیں. لیکن عالم آخرت عالم معنویات اور عالم جلال وقدرت ہے اور عالم دفعیات ہے اس لیے دنیا کی پوری ابنی اور انسانی عمارت کو ایک نفخہ سے ختم کیا جائے گا اور تمام اموات اور مردگان کو دوسرے

نفخہ سے یکدم زندہ کر دیا جائے گا۔ جیسے لشکر ایک سیٹی بجنے سے جمع ہوتا اور دوسری سے منتشر ہوتا ہے۔ انسان کی پہلی حیات میں قدرت نے رحم مادر میں انسانوں کی قالب سے مُدبّرات الامر فرشتوں سے کام لیا اور جان قبض کرنے اور موت میں بھی۔

وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ فرشتے جان قبض کرنے کے لیے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔

قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ (السجدۃ آیۃ ۱۱) اور کہہ دو کہ جان لیتے ہیں فرشتۂ موت جو تم پر مقرر ہے۔

اس آیت کے تحت ملائکہ سے کام لیا۔ اگرچہ خالقِ کائنات کو کسی کام کے لیے کسی کی ضرورت نہیں لیکن شاہی نظام کے تحت ایسا کیا گیا تاکہ اللہ تعالےٰ کے شاہی نظام کا ظہور ہو۔ ان دونوں نفخوں کو حضرت اسرافیل پھونکیں گے تاکہ اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ کے تحت انسانیت کے تمام امورات میں ملکی قوتوں کی خادمانہ حیثیت نمایاں ہو میہاں تک کہ داخلہ جنت و دوزخ تک یہی ملکی خادمانہ نظام اور کارپردازانہ منصب قائم رہے گا۔ خزنۂ جہنم اور سلام اہلِ جنت کے فرائض بھی ملائکہ کے سپرد ہوں گے جو قرآن میں مذکور ہیں۔ نفخۂ اولےٰ میں تجلی اماتت کا اثر بذریعہ نفخۂ اسرافیل کائنات پر ڈالا جائے گا اور نفخۂ ثانیہ سے تجلی احیاء کا اثر اموات پر ڈالا جائے گا۔ نفخۂ تخریب میں بھی نظم اور باقاعدگی ہوگی کہ شروع علویات وسماویات سے ہوگا۔ جیسے اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ[۱] وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ[۲] کے تحت آسمان جو دنیا کی چھت ہے پھٹ جائے گا۔ اسی طرح وَاِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۙ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ[۳] کے تحت آسمانی کائنات کے روشن ستاروں اور سیاروں کا نظام ختم کیا جائے گا۔ وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ[۴] وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ[۵]

---

۱ الانشقاق آیۃ ۱ ۲ الفرقان آیۃ ۲۵ ۳ التکویر آیۃ ۱، ۲ ۴ الانفطار آیۃ ۳ ۵ التکویر آیۃ ۶

کے تحت تمام میٹھا اور کھارا پانی یک جا کر کے اس کو گرمی سے تحلیل کر کے ختم کر دیا
جائے گا۔ اس گرمی سے پانی میں آگ لگ جائے گی۔ پھر پہاڑوں کو گرد و غبار میں
تبدیل کر کے زمین پھیلایا جائے گا جیسے کہ قرآن میں ہے وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ۔ وَبُسَّتِ الْجِبَالُ
بَسًّا فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْبَثًّا ۔ پہاڑ اڑائے جائیں گے اور ریزہ ریزہ کئے
جائیں گے اور بن جائیں گے گرد و غبار جیسے ہوتے۔ پھر نفخۂ دوم سے تعمیر منظم ہو گی اور حشر اموات ہو
کر اللہ کے آگے صف بستہ کھڑے ہوں گے۔

زمین محشر

زمین محشر بھی زمین دنیا سے مختلف ہو گی۔ قرآن میں

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ — جس دن زمین تبدیل کی جائے گی پہلی زمین سے مختلف۔

یہ تبدیلی ذاتی ہو گی یا صفاتی۔ ایک قول یہ ہے کہ ذاتی ہو گی دوم یہ کہ صرف صفاتی ہو گی
سوم یہ کہ ایک بار صرف صفاتی ہو گی اور دوسری مرتبہ ذاتی۔ مختار یہی ہے کہ صرف صفاتی
ہو گی۔ بخاری و مسلم میں سہل بن سعد سے مرفوع حدیث آئی ہے۔ يُحْشَرُ النَّاسُ يَوْمَ
الْقِيَامَةِ عَلٰى اَرْضٍ بَيْضَاءَ عَفْرَاءَ كَقُرْصَةِ النَّقِيِّ لَيْسَ فِيْهَا عَلَمٌ لِاَحَدٍ
اور صحیحین میں ابو سعید خدری سے مرفوع حدیث آئی ہے تَكُوْنُ الْاَرْضُ خُبْزَةً وَّاحِدَةً
جس کا معنی یہ ہے کہ لوگ ایسی زمین پر اٹھائے جائیں گے جو سفید گندم گونی کی طرف مائل
ہو گی۔ جیسے میدے کی روٹی اس پر کسی قسم کا نشان نہ ہو گا۔ ابو سعید کی حدیث میں ہے کہ ہو جائے
گی یہ زمین ایک روٹی اور بعض روایات میں جو چاندی کا ذکر آیا ہے اس کا مطلب سفیدی میں
چاندی سے مشابہت ہے نہ یہ کہ زمین درحقیقت چاندی کی ہو گی۔ بیہقی میں ابن مسعود

سے بسند صحیح یہ الفاظ آئے ہیں۔ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ اَرْضًا كَاَنَّهَا فِضَّةٌ۔ یعنی دنیا کی زمین ایسی زمین کی صورت میں تبدیل ہوگی کہ وہ چاندی کی طرح سفید ہوگی۔ ابن جریر نے زید بن ثابت سے مرفوعاً حدیث نقل کی ہے۔

اِنَّهَا تَكُوْنُ يَوْمَئِذٍ بَيْضَاءَ مِثْلَ الْفِضَّةِ۔	یہ زمین اُس دن چاندی کی طرح سفید ہو جائے گی۔

راجح صفات کی تبدیلی ہے۔

اکل و شربِ مؤمن

مومن کا میدانِ حشر میں کھانا پینا۔ زمینِ محشر بمنزلہ کیک کی ہوگی۔ مؤمن اس میں سے کھائیں گے۔ بدور السافرہ ص۲۳ میں منقول ہے کہ مومن اپنے قدموں کی طرف اس سے کھائے گا اور کوثر کا پانی جو دودھ سے سفید، برف سے ٹھنڈا اور شہد سے میٹھا ہوگا پیئے گا۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں۔ تاکہ مؤمن کو حشر کے دراز عرصہ میں بھوک پیاس کی تکلیف نہ ہو بدور السافرہ ص۱۰ میں طبرانی کے معجم اوسط سے مرفوعاً حدیث منقول ہے کہ عرش کے نیچے دسترخوان اللہ کی طرف سے بچھ جائے گا جس پر ایسی نعمتیں اور کھانے پینے کی چیزیں اور پھل ہوں گے جو کسی کے نہ دیکھے ہوں گے نہ تصور میں آئے ہوں گے۔ ان پر روزہ دار مسلمان بیٹھ کر کھائیں گے اور اُن کی پہچان یہ ہوگی کہ اُن کے منہ سے مشک و کستوری کی خوشبو کی لہریں پھیلیں گی۔

حوضِ کوثر

قرآن میں ہے۔ اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ابنِ عباس فرماتے ہیں اس سے حوضِ کوثر مراد ہے۔ میدانِ حشر میں ہر پیغمبر کے لیے اُن کی اُمت کے انداز پر حوض ہوں گے۔ حضور علیہ السلام کا حوض سب سے بڑا ہوگا۔ یہی مضمون ترمذی میں سمرہ سے مرفوع

حدیث میں آیا ہے۔ حضور کوثر نبوی کا میدان حشر میں ہونا حضور علیہ السلام سے چھپن[56]
صحابہ نے نقل کیا ہے جن میں خلفاء اربعہ وعشرہ و مبشرہ بھی ہیں۔ بظاہر وہ حوض
مربع متساوی الاضلاع شکل میں ہوگا اور ہر ضلع ایک ماہ کی مسافت کی مقدار لمبا
ہوگا اس کے آبخورے اور گلاس آسمان کے تاروں سے زیادہ تعداد میں ہوں گے
وہ ستارے جو ہم کو اور عوام کو نظر آتے ہیں۔ پانی کا رنگ دودھ کی طرح سفید شہد
سے میٹھا اور برف سے ٹھنڈا ہوگا۔ اس میں سے وہ لوگ پئیں گے۔ جو ایمان کے
علاوہ متبع سنت ہوں گے۔ مبتدعین کو دھکے دے کر دور کیا جائے گا۔ خواہ بدعت
اعتقادی ہو جیسے خوارج، روافض، معتزلہ یا بدعت عملی ہو اور ظالموں کو بھی ہٹایا جائے
گا روایات حدیث بدور السافرہ ص۹۷ سے ص۱۰۰ تک ملاحظہ ہوں۔ حوض کوثر درحقیقت
سنت نبوی یا کتاب وسنت کی جسمانی صورت ہے جس سے کتاب وسنت پر عامل حضرات
مستفید ہوں گے کیونکہ آخرت میں اعمال جسمانی صورت اختیار کریں گے۔ برے اعمال
مضر صورت اور نیک اعمال فائدہ مند اشیاء کی صورتیں۔

نامہائے اعمال

قرآن میں ان کا ذکر ہے

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ	جن کو دائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال ملے گا
فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا	وہ آسان حساب دے گا اور خوش ہوکر
وَّ یَنْقَلِبُ اِلٰۤى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا	جنت میں اہل وعیال کے ساتھ پہنچے گا اور
وَ اَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ	جس کو پشت کی طرف نامۂ اعمال ملے گا
ظَهْرِهٖ ۔ فَسَوْفَ یَدْعُوْا ثُبُوْرًا	وہ ہلاکت ہلاکت پکارے گا اور دوزخ
وَّ یَصْلٰى سَعِیْرًا ط (الانشقاق: ۷-۱۲)	میں جا پڑے گا۔

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَہٗ بِیَمِیْنِہٖ فَیَقُوْلُ ھَآؤُمُ اقْرَءُوْا کِتٰبِیَہْ اِنِّیْ ظَنَنْتُ اَنِّیْ مُلٰقٍ حِسَابِیَہْ ط د
جس کو دائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال ملے گا وہ خوشی سے اوروں کو دکھائے گا کہ پڑھ لو میرا نامۂ اعمال۔ مجھے دنیا میں یقین تھا کہ اس دن اللہ سے ملنا ضروری ہوگا۔

وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَہٗ بِشِمَالِہٖ فَیَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُوْتَ کِتٰبِیَہْ ۔ (الحاقۃ: ۲۵)
اور جس کو بائیں ہاتھ میں نامہ اعمال ملے گا۔ وہ افسوس کرے گا کہ یہ نامۂ اعمال مجھے نہ دیا۔

اِقْرَاْ کِتٰبَکَ ط کَفٰی بِنَفْسِکَ الْیَوْمَ عَلَیْکَ حَسِیْبًا ط (بنی اسرائیل: ۱۴)
خدا کا ہر ایک کو حکم ہوگا۔ پڑھ ڈال اپنا نامۂ عمل اور تم خود اپنے حساب کے لیے کافی ہو۔

بدور السافرہ ۳۰ سے ۳۵ میں احادیث کی بنیاد پر بیان کیا گیا ہے کہ لوحِ محفوظ سے تمام نامۂ اعمال عرش پر جو محشر میں لایا گیا ہوگا، جمع کر دیئے جائیں گے تو اللہ ایک ہوا بھیجے گا کہ ہر ایک کو اُس کا نامۂ اعمال جس ہاتھ میں دینا ہوگا پہنچا دیا جائے گا اور ہر نامۂ عمل کی پہلی تحریر اِقْرَاْ کِتٰبَکَ جو اس کے نام اور باپ کے نام کے ساتھ پکار کر حکم دیا جانے کا پڑھا اور ان پڑھ سب اپنا نامۂ اعمال پڑھ لیں گے۔ اس لیے حدیث میں آیا ہے کہ اولاد کے اچھے نام رکھا کرو۔ غیر ثابت النسب ماں کے نام سے بلائے جائیں گے۔ ناخواندہ لوگوں کا نامۂ اعمال کو پڑھنا خلاف عقل نہیں۔ جو علم خدا کسی کو تعلیم اُستاد کے ذریعہ سکھاتا ہے۔ الہامی طریقے سے بغیر اُستاد کے بھی سکھاتا ہے جیسے انبیاء علیہم السلام کے علوم اور حیوانات کے علوم مثلاً عنکبوت کو جالا بُننے کا علم، شہد کی مکھی کو چھتہ بنانے کا علم، چیونٹیوں کو اجتماعی اُمورات کا علم جو علم الحیوانات میں بیان ہے۔ خود اس زمانے میں نابیناؤں کو اُبھرے حروف کی کتاب دی جاتی ہے اور وہ اس پر انگلیاں پھراتے ہوئے پڑھنا شروع کر دیتا ہے۔ جس کو مشرقی

پاکستان میں ہم نے خود دیکھا ہے۔

شہادت

۱۔ شہادت انبیاء وعلماء اثبات جرم کے لیے قابلِ اعتماد اور ثقہ گواہان کی شہادت ضروری ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ انسانوں کو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ حق اور احکامِ خداوندی پہنچے ہیں یا اُس پر خود انبیاء علیہم السلام بطور گواہ پیش ہوں گے اور اگر پہنچانے والے ورثۃ انبیاء یعنی علماء ہوں گے تو وہ پیش ہوں گے۔ قرآن میں ہے۔ وَجِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَاۗءِ ۔ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰي هٰٓؤُلَاۗءِ شَهِيْدًا ؕ (نساء ۴۰)

۲۔ شہادتِ کراماً کاتبین دوم یہ کہ انسانوں نے احکامِ خداوندی کی خلاف ورزی کی ہے یا نہ؟ اس پر تین قسم کی شہادتیں پیش ہوں گی۔ کراماً کاتبین جو معصوم ملائکہ ہیں، اُن کی شہادت۔ يَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ اَیِ الْمَلٰٓئِكَةُ ۔ اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ۔ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ۔ وَجَاۗءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَاۗىِٕقٌ وَّشَهِيْدٌ ؕ جب انسان کے اعمال کو دو فرشتے اخذ کرنے والے اخذ کرتے رہتے ہیں اور دائیں بائیں بیٹھے رہتے ہیں۔ کوئی لفظ منہ سے نہیں نکالنے پاتا، مگر اُس کے پاس تاک لگانے والا تیار ہے اور ہر شخص اس طرح آئے گا، کہ ایک فرشتہ اس کو میدانِ حساب میں لانے والا ہوگا اور ایک گواہ ہوگا۔ درِ منثور میں حدیث مرفوع ہے کہ یہ دو فرشتے وہی کاتب حسنات وکاتب سیئات ہوں گے۔

۳۔ شہادتِ اعضاء شہادتِ اعضاءِ فاعل یعنی جن اعضاء نے عمل کیا ہے وہ بھی گواہی دیں گے۔

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓي اَفْوَاهِهِمْ آج ہم اُن کے منہ پر مہر لگادیں گے اور

وَتُكَلِّمُنَآ اَيۡدِيۡهِمۡ وَتَشۡهَدُ	اور اُن کے ہاتھ ہم سے کلام کریں گے اور
اَرۡجُلُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ ﴿	اُن کے پاؤں گواہی دیں گے، جو کچھ یہ
(یٰس آیۃ: ۶۵)	لوگ کیا کرتے تھے۔
وَمَا كُنۡتُمۡ تَسۡتَتِرُوۡنَ اَنۡ	اور تم نہیں بچتے اس سے کہ تم پر
يَّشۡهَدَ عَلَيۡكُمۡ سَمۡعُكُمۡ وَلَا	گواہی دیں گے تمہارے کان اور آنکھ
اَبۡصَارُكُمۡ وَلَا جُلُوۡدُكُمۡ ط	اور کھالیں۔ (حٰمٓ السجدہ: ۲۲)
وَقَالُوۡا لِجُلُوۡدِهِمۡ لِمَ شَهِدۡتُّمۡ	اور کہیں گے اپنی کھالوں سے تم نے ہمارے
عَلَيۡنَا ؕ قَالُوۡۤا اَنۡطَقَنَا اللّٰهُ	خلاف کیوں گواہی دی وہ کہیں گی کہ گویا
الَّذِىۡۤ اَنۡطَقَ كُلَّ شَىۡءٍ وَّ	کیا ہم کو اُس خدا نے جس نے ہر چیز کو
هُوَ خَلَقَكُمۡ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيۡهِ	گویا کیا ہے اور اُس نے تم کو پہلی بار پیدا
تُرۡجَعُوۡنَ ﴿ (حٰمٓ السجدہ: ۲۱)	کیا اور اُسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔

۴۔ شہادتِ مکان قرآن میں ہے يَوۡمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخۡبَارَهَا[1] ابن عباس اس آیت کی تفسیر فرماتے ہیں کہ زمین خبر دے گی جو کچھ عمل انسان نے اُس پر کیا ہے۔

یہ کل چار قسم کی شہادتیں ہوئیں۔ اوّل و دوم انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ کی شہادت ہے اور وہ دونوں معصوم ہیں، اس لیے اُن کی شہادت قابلِ اعتماد ہے۔ باقی اخیر کی دو شہادتیں یعنی اعضاء اور مکانِ عمل کی شہادت ہے یہ بوجہ خرقِ عادت ہونے کے قابلِ اعتماد ہیں کیونکہ بظاہر زبان کے سوا اور اعضاء اسی طرح زمین جہاں پر گناہ ہوا شہادت اور کلام پر قدرت نہیں رکھتے، یہ بطور خرقِ عادت شہادت دیں گے اور خرقِ عادت

---

[1] الزلزال آیۃ: ۴

فعلِ الٰہی ہے جس سے ان دونوں کے بیان کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ اعضاء نے جو کچھ بولا یا زمین نے، یہ درست اور صحیح ہے۔ یہ شبہہ نہ کیا جائے کہ اعضاء اور زمین کس طرح بولیں گے کیونکہ جب انسان ایک قول کو جامد ٹیپ ریکارڈ میں بند کر کے سوئی پھیرنے سے جامد اور بے جان سے وہی ٹیپ کردہ باتیں ظاہر کر سکتا ہے کہ تو خالقِ کائنات بھی ایسا کر سکتا ہے کہ انسان کے اقوال و افعال کو اعضاء انسانی اور زمین کے قطعات میں ٹیپ کر کے میدانِ حساب میں مشیئتِ الٰہی کی سوئی پھیر کر اُن سے نطق کرائے۔ اس کے علاوہ انسان کے دیگر اعضاء اور زبان بسماعت کرنے کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں بجز اس کے کہ خالقِ کائنات نے زبان میں نطق اور کلام کی قابلیت اور استعداد رکھی ہے اور دوسرے اعضاء میں نہیں رکھی اب وہ ایسا کر سکتا ہے کہ زبان سے وہ قدرت سلب کر دے اور دیگر اعضاء میں وہ قابلیت پیدا کر دے یا زبان کی قابلیت دیگر اعضاء کی طرف منتقل کر دے۔ اس کے علاوہ جدید تحقیق کی بنیاد پر جمادات نباتات، حیوانات انسان میں حسبِ مراتب زندگی بھی ہے اور گویائی بھی۔ لیکن انسان کے علاوہ دیگر اشیاء کی گویائی انسان کی قوتِ سامعہ سے مستور اور پوشیدہ ہے۔

آیات وَقَالَتْ نَمْلَةٌ وَعُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ۔ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ۔ يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ۔ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ۔ حضور علیہ السلام کو سلام حجر اور کلام جمل احادیث میں ثابت ہے۔ یہ سب دال ہے کہ ان سب کو نطق حاصل ہے جس کو ہم دنیا میں نہیں سُنتے وہ بطور خرقِ عادت آخرت میں مسموع ہوگا کیونکہ آخرت جہانِ خوارق ہے۔ قیامت میں انسان کے تمام اعمال خدا کو معلوم ہیں۔ اس لحاظ سے نہ شہادت کی ضرورت تھی نہ تحریری ثبوت اور نامۂ اعمال کی حاجت تھی لیکن شرعی اور قانونی ضابطہ کے تحت یہ ضرور ہے کہ اعمال قلم بند ہوں تاکہ تحریری ثبوت عدالتِ الٰہی میں پیش کیا جائے اور اگر مجرم نے فراموش کر دیا ہو تو اس کو تحریر دکھلا کر یاد دلایا جائے اور اگر پھر بھی تردّد ہو تو اس کے اثبات پر

شہادت عادیہ جیسے انبیاء، علماء، اور ملائکہ کی شہادت ہے اس کو پیش کیا جائے اور مزید تقویت ثبوت کے لیے معجزانہ شہادتِ اعضاء اور زمین کی بھی پیش کی جائے تاکہ ثبوت میں کسی قسم کا تردد نہ رہے۔ یہ سب شہادتیں ایسی ہیں جو معتمد ہونے کے علاوہ غیر جانبدار بھی ہیں اور ان پر کسی قسم کی جرح نہیں کی جا سکتی کیونکہ بنیادی جرحیں دو ہیں۔ شہادت کو ناقابلِ اعتماد گردانتا اور ظاہر ہے کہ شہادتِ عادیہ انبیاء اور ملائکہ ہے اور علماء کی شہادت تصدیقِ نبی سے مؤید ہے اور شہادت خارقہ اعضاء و زمین بھی معتمد ہے اور یہ چاروں شہادتیں غیر جانب دار بھی ہیں کیونکہ جانب داری گناہ ہے اور انبیاء اور ملائکہ معصوم ہونے کی وجہ سے گناہ سے پاک ہیں۔ باقی اعضاء اور زمین کے متعلق تو گناہ کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا کہ زمین مکلف نہیں اور عضوِ انسانی انسان سے الگ ہو کر مکلف نہیں اور اس کی جانبداری کا تصور تو اس لیے نہیں کیا جا سکتا کہ شہادت اعضاء کی صورت میں خود اعضاء کا ضرر ہے کہ خود اعضاء کو اسی جرم مشہود علیہ پر جہنم کی سزا ہوگی

وزنِ اعمال

قرآن کا ارشاد ہے۔

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ۭ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۭ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ (الانبیاء ۲۱:۴۷)	ہم انصاف کے ترازو قیامت کے دن رکھیں گے پھر کسی نفس پر ظلم نہ ہوگا اور اگر عمل کی مقدار رائی کے دانے کے برابر ہوگی تو ہم اس کو لائیں گے اور ہم حساب لینے کے لیے کافی ہیں۔
وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ	قیامت کے دن اعمال کا تول حق ہے جس کی بھاری ہوئیں تولیں تو وہ

فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ؕ
فَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ
فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ؕ (القارعۃ: ۶-۹)

رہے گا من مانے گذران میں اور جس کی
ہلکی ہوئیں تولیں۔ تو اُس کا
ٹھکانا گڑھا ہے۔

ان آیات و دیگر آیات اور متعدد احادیث اور اجماعِ اہلِ سُنّت سے آخرت میں اعمال کا تولا جانا حق ہے البتہ معتزلہ اور سلف میں مجاہد اعمش اور ضحاک کی رائے یہ ہے کہ قرآن میں جہاں وزن کا ذکر ہے اس سے اعمال کا تول مراد نہیں۔ بلکہ منصفانہ فیصلہ اور عدل الہٰی مراد ہے لیکن یہ رائے بقول امام آمدی اس لیے غلط ہے کہ میزان قرآن میں ثقل و خفّت یعنی بھارے اور ہلکے ہونے کے ساتھ موصوف ہے۔ لیکن انصاف کو بھارا اور ہلکا نہیں کہا جا سکتا اور نہ وہ ثقل اور خفت سے موصوف ہو سکتا ہے اس لیے جمہور کی رائے درست ہے کہ جس ترازو سے اعمال کا وزن ہو گا وہ جسمانی اور حسّی ہو گا۔ معنوی میزان بمعنی انصاف مراد نہیں جیسے معتزلہ کا خیال ہے۔ میزان حسّی کے ثبوت میں سلمان فارسی سے مرفوع حدیث آئی ہے۔

يُوْضَعُ الْمِيْزَانُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ
فَلَوْ وُضِعَ فِيْهِ السَّمٰوَاتِ
وَالْاَرْضِ لَوَسِعَهٗ

ترازو کھڑا کیا جائے گا جو اس قدر کشادہ ہو گا
اگر تمام آسمان اور زمین اس میں رکھے جائیں
تو اس میں سما سکتے ہیں۔

اس حدیث کو حافظ ابن حجر نے بخاری کی آخری حدیث کی شرح میں حاکم سے بروایت سلمان اور ابن مردویہ سے بروایت عائشہ اور بیہقی سے بروایت انس اور طبرانی سے بروایت ابوہریرۃ نقل کی ہے اور سلمان کی روایت ابن المبارک نے کتاب الزہد ابوالقاسم اللالکائی نے کتاب السُّنۃ نیز آلوسی نے تفسیر سورۃ اعراف میں نقل کیا۔

میزان واحد ہے یا متعدد

حافظ ابن حجر کی رائے یہ ہے کہ میزان واحد ہے اور جمع کی تعبیر جو قرآن میں آتا ہے جیسے مندرجہ

صدر روایت میں موازین آیا ہے یا باعتبار اعمال متعددہ کے جمیعۃ اعتباری ہے یا تعظیم کی وجہ سے جمع لایا گیا ہے کہ میزانِ آخرت اگرچہ ایک ہے لیکن عظیم ہونے کی وجہ سے ایسا ہے کہ کثیر التعداد کہلانے کا مستحق ہے جیسے كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ ن الْمُرْسَلِينَ حضرت نوح علیہ السلام سے تعظیم مرسلین کے ساتھ تعبیر کی گئی ہے اور بعض کی رائے یہ ہے کہ حقیقۃً میزان متعدد ہے یا ہر آدمی کے لیے ایک میزان ہے یا ہر عمل کے لیے جداگانہ میزان ہے۔ پہلا قول راجح ہے۔

موزون لہم کا بیان

کن اشخاص کے اعمال تو لے جائیں گے۔ قسطلانی نے امام غزالی سے نقل کیا ہے کہ تین گروہ کے اعمال نہیں تو لے جائیں گے باقی سب مکلفین کے اعمال تو لے جائیں گے۔ وہ تین گروہ معصومین انبیاء علیہم السلام اور میرے نزدیک اطفال المسلمین بھی اس میں داخل ہیں اور مجنونین وقت بلوغ بھی دوسرا گروہ جو بلا حساب جنت میں داخل ہوگا وہ چار ارب نوے کروڑ ہیں۔ تیسرا گروہ کفار اعمال میں باہمی وزن ہوگا اور اس کے لیے متضاد اعمال کا ہونا ضروری ہے جو ان تینوں گروہوں میں نہیں۔ اسی طرح آیت فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا میں قرآنی تصریح ہے کہ ہم کفار کے لیے وزن قائم نہیں کریں گے لیکن امام بخاری کی رائے تعمیم ہے کہ انہوں نے ان اعمال بنی آدم و قولهم یوزن فرمایا کہ آدم کی اولاد کا عمل و قول تولا جائے گا۔ یہی قول مختار حافظ ابن حجر اور علامہ آلوسی کا ہے۔ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا میں مراد وزن سے قول نہیں بلکہ قدر اور مرتبہ ہے یعنی کفار کے اعمال کے لیے خدا کے ہاں قدر و منزلت نہ ہوگی۔ باقی اعمال متضادہ کا جواب امام قرطبی نے یہ دیا ہے کہ ایک پلڑا کفار کا نیکیوں سے خالی ہوگا کیونکہ کفر کے ساتھ کوئی نیکی نیکی نہیں رہتی۔ اور دوسرے پلڑے میں کفر اور گناہ ہوں گے تو یہ پلڑا بھاری ہوگا۔ یا اگر کفار کے صدقات اور خیرات کا تخفیف عذاب میں اثر مانا جائے کیفما کان تو وہ ایک پلڑے میں

ہوں گے اور دوسرے پلڑے میں کفر اور گناہ ہوں گے تو کفر والا پلڑا بھاری ہو گا۔ تیسرا قول شرح عقائد سبکی میں امام ماتریدی سے منقول ہے کہ کفار کے لیے میزان تمیز ہو گا کہ اس کے ذریعہ کفار کے مختلف طبقات میں ان کے اعمال تول کر یہ فیصلہ ہو گا کہ کن کفار کے گناہ زیادہ ہیں، کن کے کم۔ تاکہ ابدی عذاب میں شریک ہونے کے باوجود ان کے گناہوں کی کثرت و قلت کے مطابق ان کے مناسب اعمال طبقات متعین کئے جائیں۔ حافظ ابن حجر نے بھی قصہ ابی طالب و ابی لہب سے استدلال کر کے کفار کی بعض نیکیوں کو تخفیف عذاب میں مؤثر تسلیم کیا ہے۔ سورۂ مومنین جز ۱۸ کے آخر کی آیت سے کفار کے اعمال کا وزن ثابت ہوتا ہے۔ آیت یہ ہے

وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُہٗ فَاُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَھُمْ فِیْ جَھَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ۔ تَلْفَحُ وُجُوْھَھُمُ النَّارُ وَھُمْ فِیْھَا کٰلِحُوْنَ ۔ اَلَمْ تَکُنْ اٰیٰتِیْ تُتْلٰی عَلَیْکُمْ فَکُنْتُمْ بِھَا تُکَذِّبُوْنَ ط (آیۃ ۱۰۳-۱۰۵)	جن کے تول ہلکے ہوں گے یہ وہ لوگ ہوں گے جو اپنے نفسوں کو نقصان میں ڈالے ہوئے ہیں جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔ دوزخ کی آگ اُن کے چہروں کو جلائے گی اور اُن کے منہ اس میں بگڑے ہوں گے ان سے کہا جائیگا کیا تم کو ہماری آیتیں نہیں سنائی گئیں جن کو تم نے جھٹلایا۔

آخری فقرہ سے جس میں تکذیب آیات کا ذکر ہے ان کا کافر ہونا ثابت ہوا اور آیت کا پہلا فقرہ خفت موازینہ سے ان کے اعمال کا وزن ثابت ہوا۔

بیان الموزون

میزان میں کیا چیز تولی جائے گی۔ اس میں تین قول ہیں۔ اول ابن عباس کا قول ہے کہ اعراض و اعمال کو اجسام بنا کر تولا جائے گا۔ اس کو قسطلانی نے بلفظ یُقَلِّبُ اللّٰہُ الاَعْرَاضَ اَجْسَامًا کے نقل کیا ہے اور بدور السافرہ ص ۱۳۵ میں شعب الایمان بیہقی سے بلفظ یُؤْتٰی بالْحَسَنَاتِ

بِاَحْسَنِ صُوْرَةٍ وَ يُؤْتٰى بِالسَّيِّئَاتِ بِاَقْبَحِ صُوْرَةٍ

کے ساتھ نقل کیا، یعنی نیکیوں کو اچھی صورت اور گناہوں کو بری صورت میں لایا جائے گا۔ اس قول کو طیبی نے شرح مشکاۃ میں ترجیح دی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ نامہا ئے اعمال تولے جائیں گے جن کا بوجھل اور ہلکا ہونا اعمال کی نوعیت پر ہوگا۔ جس کی دلیل حدیث البطاقہ ہے۔ جس کو امام ترمذی نے عبداللہ ابن عمرو بن العاص سے نقل کر کے اس کی تحسین کی ہے اور ابن حبان نے بھی اس کو اپنے صحیح میں ذکر ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔

يُؤْتٰى بِتِسْعٍ وَّتِسْعِيْنَ سِجِلًّا فَتُوْضَعُ فِيْ كَفَّةٍ وَيُؤْتٰى بِالْبِطَاقَةِ فَتُوْضَعُ فِي الْاُخْرٰى. فَطَاشَتِ السِّجِلَّاتُ وَثَقُلَتِ الْبِطَاقَةُ

یعنی ننانوے دفتر لاکر ایک پلڑے میں رکھے جائیں گے اور پرچی دوسرے پلڑے میں ننانوے دفتر ہلکے ہوں گے اور پرچی بھاری ہو جائے گی۔

اس کو امام الحرمین نے ترجیح دی اور کہا کہ ثقل اجر کے انداز پر ہوگا۔ قرطبی نے بھی اس کو ترجیح دی اور یہ ابن عمر کا قول ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ نفسِ اعمال تولے جائیں گے جس پر ابوداؤد اور ترمذی کی مرفوع حدیث وال ہے اور ابن حبان نے اس کی تصحیح کی۔ لفظ حدیث یہ ہے۔

مَا يُوْضَعُ فِي الْمِيْزَانِ اَحْسَنُ مِنْ خُلُقٍ حَسَنٍ

میزان میں اخلاق حسنہ سے بڑھ کر کوئی عمل نہیں رکھا جائے گا۔

اس کو حافظ ابن حجر نے ترجیح دی ہے۔ اعمال کا تول پہلے زمانہ میں بعید از عقل سمجھا جاتا تھا لیکن تھرمامیٹر سے بدن کی گرمی یا موسم کا درجۂ حرارت معلوم کیا جاتا ہے حالانکہ عرض ہے۔ اس لیے اب اس میں استبعاد نہیں رہا۔ ہمارے نزدیک ان اقوال میں اختلاف نہیں یہ ہو سکتا ہے کہ تینوں طریقوں سے وزن اعمال ہو، اعمال کو اجسام بنا کر تولنا نامہائے اعمال کا تولنا، خود نفس اعمال کا تولنا، تینوں طریقے برتے جائیں گے تاکہ انسان کی قسمت

کے آخری فیصلے صادر ہونے میں شک و شبہ کی گنجائش نہ رہے۔ ذہبی نے فضل علم میں عمران بن حصین سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث لائی کہ علماء کی سیاہی اور شہدا کا خون تولا جائے گا تو علماء کی سیاہی بھاری ہوگی۔ (بدور ص۱۴۱)

وازن اعمال تولنے کے لیے تولنے والا ضروری ہے۔ وہ کون ہوگا؟ مختلف روایات کے تحت اس میں چار اقوال ہیں۔

۱۔ اللہ جلّ مجدہ تولنے والا ہوگا۔ یہی امام غزالی کا قول ہے۔ الدرۃ الفاخرۃ فی کشف علوم الاخرۃ میں۔ جس کی دلیل قرآن کی آیت و نضع الموازین ہم رکھیں گے ترازو کہ اس میں اللہ نے اپنی طرف نسبت کی ہے۔

۲۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وازن ملک الموت ہوگا۔ بہتوں نے انس بن مالک سے کی روایت کی ہے۔

۳۔ سوم یہ کہ وازن حضرت آدم ہوں گے۔ طبرانی نے معجم صغیر میں ابو ہریرۃ سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے۔

یَا اٰدَمُ قَدْ جَعَلْتُكَ حَكَمًا بَيْنِي	اے آدم میں نے تم کو منصف ٹھہرایا ہے اپنے
وَبَيْنَ ذُرِّيَّتِكَ قُمْ عِنْدَ الْمِيزَانِ	اور آپکی اولاد کے درمیان جا کھڑے ہو میزان کے پاس۔

۴۔ چوتھا قول یہ ہے کہ وازن حضرت جبرئیل ہوں گے۔ اس کو ابوالقاسم الاسکافی نے حذیفہ کی روایت سے نقل کیا ہے۔

میرے نزدیک ان چار اقوال میں کوئی اختلاف نہیں۔ چاروں قول درست ہیں۔ اللہ جل مجدہ اس لحاظ سے تولنے والا اور وازن ہے کہ تول کا حکم وہی دے گا۔ اس لیے اللہ کو نسبت بحیثیت آمر کے ہے۔ ملک الموت علیہ السلام نے دنیا سے آخرت کی طرف مردگان کا چالان کیا ہے۔ جس طرح پولیس چالان کرتی ہے۔ تو عدالت الٰہیہ میں چالان کنندہ علیہ السلام یعنی ملک الموت

کی حاضری اور بیان بھی ضروری ہے۔ جیسے انسانی عدالتوں میں پولیس کا بیان لیا جاتا ہے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام چونکہ قانون الٰہی، قرآن کے پہنچانے والے ہیں اس لیے آپ کی موجودگی مقدمہ قانون شکنی کی پیشی میں ضروری ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کا مقدمہ درپیش ہے اس لیے بحیثیت سرپرست آپ کی حاضری بھی ضروری ہے۔

وزن اعمال کی حکمت

اعمال کے تولنے سے اللہ کی کوئی غرض وابستہ نہیں۔ وہ عالم الغیب ہونے کے لحاظ سے اعمال کے ایک ایک ذرہ سے باخبر ہے بلکہ وزن اعمال عدالتی کارروائی کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔

۱۔ تاکہ نامۂ اعمال کے ذریعہ خود عمل کرنے والوں کو اپنے اعمال کا علم ہو جائے اور اگر بھول گئے ہوں تو یاد آ جائے جیسے ڈائری میں نظر ڈالنے سے گذشتہ امور یاد آ جاتے ہیں اور نفسیاتی طور پر تسلیم کرلیں کہ یہ سب کچھ درست ہے خواہ زبان سے اقرار کریں یا نہ۔ جیسے اِقْرَاْ كِتَابَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ حَسِيْبًا میں اسی حکمت کی طرف اشارہ کیا گیا۔

۲۔ دوم یہ کہ وزنِ اعمال سے اعمال کی مقدار عام طور پر معلوم ہو جائے تاکہ اعمالِ نیک کی جزاء سے اللہ کے فضل اور احسان کا ظہور ہو اور اعمالِ بد کی سزا میں اللہ کے عدل کا ظہور ہو کر مجرم کے ساتھ بے انصافی نہیں ہوئی۔

۳۔ شہادتِ انبیاء علیہم السلام وعلماء، وشہادتِ ملائکہ، شہادتِ اعضاء اور شہادتِ قطعاتِ زمین سے یہ ظاہر کیا جائے کہ جو کچھ عدالتی کارروائی ہو رہی ہے وہ مبنی بر حقیقت ہے۔

۴۔ اس سب کارروائی سے یہ بھی ظاہر کرنا مقصود ہے کہ یہ سب انتظامات انسانی اعمال کی اہمیت کو ظاہر کر رہے ہیں کہ کائنات کی تخلیق کا مقصد یہی نتائج اعمال تھے۔ اسی وجہ سے اس کے لیے یہ وسیع انتظامات کئے گئے۔

راجح اور مرجوح کی پہچان

نیکی اور بدی کے پلڑے کے بھاری اور ہلکے ہونے کی معرفت کی علامت کیا ہوگی۔ اس میں تین اقوال ہیں۔

۱۔ جمہور کا قول یہ ہے کہ دنیا کے دستور کے مطابق نیچے جھکنے والا پلڑا اُس کے بھاری ہونے اور اُوپر چڑھنا اُس کے ہلکے ہونے کی نشانی ہے جیسے دنیا کے تول میں یہی قاعدہ ہے۔

۲۔ دوسرا قول یہ ہے کہ دُنیا کے دستور کے برعکس ہوگا کہ جو پلڑا اوپر چڑھے گا وہ بھارا ہوگا اور جو نیچے جُھکے گا وہ ہلکا ہوگا کیونکہ حیز اور مرکزِ میلان کی آخرت میں تبدیلی ہوگی۔ نیکیوں کا مرکز اوپر ہوگا جہاں جنت ہے اور بدیوں کا مرکز نیچے ہوگا جہاں دوزخ ہے۔ یہی قول بدر الدین زرکشی کا ہے البرہان فی علوم القرآن میں اور شاہ عبدالعزیز کا مختار ہے فتح العزیز میں۔

۳۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اگر حسنات کے پلے سے نورانی ستون نکلے تو نیکی کا پلہ بھاری ہے اور اگر سئیات کے پلے سے ظلمانی اور سیاہ ستون نکلے تو سئیات کا پلہ بھاری ہے اس کو علامہ الوسی نے تفسیر سورۃ قارعہ میں نقل کیا ہے۔

مقام وزن

حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں اور ابو القاسم اللالکائی نے کتاب السنۃ میں نقل کیا ہے کہ میزان نصب کیا جائے گا اللہ کے سامنے حسنات کا پلہ عرش سے دائیں طرف اور سئیات کا عرش کے بائیں طرف ہوگا حسنات کے بالمقابل جنت اور سئیات کے بالمقابل دوزخ ہوگا۔

عبورِ صراط و نور

قرآن میں ہے

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ	یعنی تم میں سے کوئی نہیں جو پُل صراط کے
عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۚ	ذریعہ دوزخ پر وارد نہ ہو یہ اللہ کا قطعی
ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّ	فیصلہ ہے پھر ہم اللہ سے ڈرنے والوں کو بچا
نَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا	دیں گے اور ظالموں کو اس میں گھٹنوں کے بل
(سورۃ مریم آیۃ ۷۱، ۷۲)	گرا کر چھوڑیں گے۔

اس آیت میں سب کے لیے دوزخ میں وارد ہونا مذکور ہے۔ مسند احمد حاکم نے تصحیح سند کے ساتھ اور بیہقی نے ابو سمیۃ سے باسناد جابر مرفوعاً نقل کیا ہے کہ وارد کا معنی داخل ہونا ہے اور اسی طرح مستدرک حاکم میں ابن مسعود و ابن عباس سے بھی منقول ہے جس سے سب کا جہنم میں دخول مراد لیا گیا ہے۔ امام قرطبی نے اس قول کو ترجیح دی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وارد ہونے سے گزرنا پل صراط پر مراد ہے داخل ہونا نہیں۔ یہ نووی کا مختار ہے۔ یہ قول مسند احمد اور ترمذی میں ابن مسعود سے مرفوعاً منقول ہے جس میں مذکور ہے کہ بعض اعمال کے انداز کے مطابق بجلی کی طرح گزریں گے۔ بعض ہوا کی طرح، بعض تیز گھوڑے، بعض پرندوں کی طرح اور بعض سواری کی طرح گذریں گے اور بعض کو آگ لگے گی زخمی ہو کر بچیں گے اور بعض گر پڑیں گے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ وارد سے قریب ہونا مراد اور دوزخ کو دیکھنا مراد ہے کہ جب دوزخ کے قریب ہی ہوگا۔ پھر کافروں کو اس میں ڈالا جائے گا اور مسلمانوں کو جنت پہنچایا جائے گا جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں و لما ورد ماء مدین آیا ہے یعنی حضرت موسیٰ جب مدین کے پانی پر وارد ہوئے جس کا معنی پانی میں داخل ہونا نہیں بلکہ اس کے قریب اور پاس ہونا مراد ہے۔ اگر پہلا قول لیا جائے تو داخل ہونا عذاب کو مستلزم نہیں کیونکہ آگ لوگوں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح برد اور سلام بن جائے گی۔ جیسے طبرانی اور بیہقی میں خالد بن معدان سے منقول ہے کہ مومنوں کو پتہ بھی نہ لگے گا۔ وہ کہیں گے کہ ہمیں تو حسبِ وعدہ دوزخ پر وارد نہ ہوا۔ اللہ کی طرف سے جواب دیا جائے گا۔ مَرَرْتُمْ عَلَيْهَا وَهِيَ خَامِدَةٌ تم اس پر گذرے لیکن وہ بجھی ہوئی تھی۔ طبرانی اور ابن عدی نے یعلی بن منبہ سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ دوزخ مومن کو کہے گی کہ گزر جا تیرے نور نے میری گرمی بجھا دی جز یا مُؤْمِنُ اَطْفَأَ نُورُكَ لَهَبِيْ بدور السافرہ صد ۵۲ و صد ۱۵۳۔ پل صراط کے خطرناک وقت میں تاریکی ہوگی۔ مشعل نظر آئے گی۔ مومنوں پر اعمال کے مطابق ایمانی نور تقسیم ہوگا۔ بعض کے ساتھ پہاڑ کے برابر روشنی ہوگی۔ بعضوں کے

کے پاس درخت کھجور کے برابر اور کم عمل والوں کے پاس انگوٹھے کے برابر۔ ابن جریر ابن مسعود۔ جس کو دیکھ کر منافق مومنوں سے درخواست کریں گے۔

اُنْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۔ کہ کچھ ٹھہر جاؤ کہ ہم تمہاری روشنی میں گذر جائیں۔

قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَاءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ۔ وہ جواب دیں گے واپس جاؤ دنیا میں وہاں سے نور حاصل کر کے لاؤ۔

کیونکہ نور عمل سے حاصل ہوتا ہے اور دار العمل دنیا ہے نہ آخرت۔ آخرت دار الجزاء ہے (بدور السافرہ مع تشریح ص ۱۴۵ و ص ۱۴۶)

حقیقت صراط

پل صراط کی ہیئت ریلوے اسٹیشن کے پل کی طرح معلوم ہوتی ہے۔ ابن عساکر نے فضیل بن عیاض سے نقل کیا ہے کہ جہنم کے اوپر پل صراط کا طول پندرہ ہزار سال کی مسافت کے انداز پر ہے۔ ایک تہائی حصہ چڑھنا ہے اور ایک تہائی اُترنا اور ایک تہائی سیدھا برابر چلنا ہے۔ بدور ص ۱۴۹ بیہقی میں انس سے مرفوعاً منقول ہے کہ اَدَقُّ مِنَ الشَّعْرِ وَاَحَدُّ مِنَ السَّيْفِ

اسی طرح مسلم میں ابوسعید خدری اور ابن جریر میں ابن مسعود سے اور مستدرک حاکم میں بعض کے حق میں بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے تیز ہوگا اور بعض کے حق میں کشادہ میدان کی طرح ہوگا۔

پل صراط اور نور کی حکمت

پل صراط پر چلنا موقف یعنی میدان حساب سے شروع ہوگا اور یہ پل دوزخ کے اُوپر ہے اور گذر جانے کے بعد جنت کی حد شروع ہوگی اور جنت میں داخلہ ہوگا۔ جیسے کہ بدور السافرہ میں روایات سے ثابت ہے۔ اگر سب کو گزرنا ہے جیسے کہ ایک قول یہ ہے تو اہل

تقویٰ کو اس میں کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی اور کفار اور فجار کو تکلیف ہوگی۔ یہ اس صورت میں کو وارد سے مرور یعنی گزرنا مراد اور اگر دخول مراد ہو جیسے کہ ایک قول یہ بھی ہے تو بھی اتقیاء کو کوئی تکلیف نہ ہوگی کیونکہ ان کے مرور اور گذرنے کے وقت آتش دوزخ بردو سلام ہوگی اور اس کی تپش نور ایمان سے بجھ جائے گی جیسا کہ ہم نے اس کی روایات نقل کی ہیں اور خود قرآن میں بھی مذکور ہے۔ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوا وَّنَذَرُ الظَّالِمِينَ فِيهَا جِثِيًّا (مریم آیۃ ۷۱، ۷۲) پھر ہم تقوی والوں کو پل صراط اور آتش دوزخ سے نجات دیں گے اور کفار و فجار کو اس میں گھٹنوں کے بل گرا دیں گے۔ باقی اگر نفس پل کی باریکی اور اس کی دھار کی تکلیف کے خیال سے گزرنے میں تکلیف کا اندیشہ ہو تو وہ بھی نہ ہوگا کیونکہ ہم نے گذشتہ روایت میں ثابت کیا کہ پل صراط کی بال سے باریک ہونا اور تلوار کی دھار سے تیز ہونا سب گذرنے والوں کے حق میں نہیں۔ کفار یا بعض فجار کے حق میں ہے۔ اتقیاء کے حق میں ایک وسیع سڑک اور میدان کی طرح ہوگا۔ جس سے معلوم ہوا کہ اس پل میں گذرنے والوں کے اعمال کے مطابق مختلف شعبے اور شاخیں ہیں۔ ہر ایک کو اپنے اعمال کے مطابق کی راہ سے گزرنا ہوگا۔ دوسری صورت کہ اگر بالفرض سب کی ایک ہی گذرگاہ ہے تو بھی مومن کے لیے ڈر نہیں۔ جیسے امام بدر الدین زرکشی نے البرہان فی احکام القرآن میں ذکر کیا ہے کہ عالم آخرت میں حیز اور مرکز بدلا جائے گا۔ دنیا کے بدستور کے مطابق نہ ہوگا بلکہ بقول شاہ ولی اللہ احکام روح احکام بدن پر غالب ہوں گے۔ لہٰذا کفار کے لیے مرکز میلان نیچے یعنی جہنم کی طرف ہوگا اور اتقیاء اور نیکوکاروں کے لیے مرکز میلان اوپر جنت کی طرف ہوگا۔ جس سے کفار پل بھر بوجھ پڑ جانے کی وجہ سے زخمی ہوں گے، لڑکھڑائیں گے، گر پڑیں گے۔ اور اتقیاء کا جھکاؤ اوپر کی طرف ہوگا۔ تو پل بھر بوجھ نہ ہوگا تو وہ تکلیف سے محفوظ رہیں گے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ اگر آدمی تلوار کی دھار پر قدم رکھے تو تکلیف ہوگی لیکن اگر قدم ہوا میں اٹھا کر اس قدم پر تلوار رکھ دیں تو کوئی تکلیف نہ ہوگی کیونکہ

قدم کا جھکاؤ تلوار کی طرف نہیں بلکہ نیچے کی طرف ہے۔ احیاز اور مرکزِ میلان کی تبدیلی کا سبب یہ ہے کہ کفار نے جہنمی اعمال دنیا میں کئے ہیں جن کو اپنے مرکزِ جہنم کی طرف میلان اور جھکاؤ ہے اور اتقیا نے جنّتی اعمال کئے تھے جن کی وجہ سے انہوں نے اپنے عملوں میں اوپر یعنی جنت کی طرف میلان اور جھکاؤ پیدا کیا۔ باقی جہنم کفر و معصیت کی صورتِ مثالی اور جنت ایمان و طاعت کی صورتِ مثالی ہے پُل صراط شریعت اسلامی کی صورتِ مثالی ہے گناہوں کا مزاج ناری و ظلماتی ہے اور گرم ہے اور طاعت اور نیکی کا مزاج نوری بارد اور سرد ہے جس کی طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دُعا میں اشارہ ہے

اَللّٰھُمَّ اغْسِلْ خَطَایَ بِمَاءِ الثَّلْجِ وَالْبَرْدِ — اے خدا میرے گناہوں کو برف اور اولوں کے پانی سے دھو کر دور کر۔

صحیحین کی حدیث میں آیا ہے۔

حُفَّتِ الْجَنَّۃُ بِالْمَکَارِہِ وَحُفَّتِ النَّارُ بِالشَّھَوَاتِ ط — جنت کو تکلیفات نے گھیرا ہے اور دوزخ کو خواہشات نے

لہٰذا جنت جانے تک دوزخ کے پُل پر گزر جانے سے اس حقیقت کا اظہار مقصود ہے کہ جو اس پُل سے بچ کر سالم گزر کر جنت پہنچ گئے یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے شریعت پر چلنے کے لیے ہر قسم کی تکلیف اٹھا کر جنت کی سڑک تیار کی تھی اور نورانی اعمال کی وجہ سے اس نورانی دارالسلام اور بہشت میں پہنچ گئے اور جن لوگوں نے شریعت کی سڑک اور پُل پر گزرنا ترک کیا تھا۔ یا کچھ شریعت پر چلے تھے اور کچھ طبیعت پر۔ ان کی گذرگاہ اور شاہراہ جنت ان کے لیے جیسے دنیا میں ان کو سخت دشوار اور ناگوار معلوم ہوتی تھی وہی ناگواری اور دشواری پل صراط کی شکل میں پیش کی گئی کہ اب ان کو جنت کی رسائی مشکل ہوئی۔ دنیا میں ان کو شریعت اسلامی کی راہ پر چلنا دشوار تھا۔ جس کی وجہ سے آخرت میں اس شریعت کی شکل ہیبت ناک اور بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے تیز شکل میں بصورت پُل صراط پیش کی گئی شریعت

پر دنیا میں چلنا اتقیاء اور صلحاء کے لیے آسان تھا اسی شریعت کو اُن کے آگے آسان شکل میں پیش کیا گیا اور جیسے جنت کی شاہراہ اور سڑک دنیا میں صرف ایک تھی یعنی شریعت اسلامی جن کو دنیا میں اس پر گزرنا آسان تھا آخرت میں بھی آسان ہوگا اور اس کو عبور کر کے جنت میں داخل ہوں گے اور جن کے لیے شریعت پر چلنا مشکل تھا اور نفس اور خواہشات کی پیروی آسان تھی اُن کے لیے پُل صراط پر گزرنا اور جنت تک رسائی ناممکن ہوگی اور پُل پر قدم رکھنے کے ساتھ اپنے مرکز میلان یعنی خواہشات اور گناہوں کے مرکز یعنی دوزخ میں جا پڑیں گے یہی حقیقت ہے کہ پُل صورت کی آخرت کا سارا نقشہ دنیاوی اعمال کی شکل وصورت پر بنایا گیا ہے۔

نُور کے اسباب

الصَّلٰوۃُ نُورٌ۔ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِیٓ اُنْزِلَ مَعَہٗ۔ اَلصَّبْرُ ضِیَاءٌ۔ وَالظُّلْمُ ظُلُمَاتٌ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ۔ صراط پر روشنی نماز، قرآن اور ترک ظلم سے حاصل ہوتی ہے (بدور صفحہ ۱۴۷)

پُل صراط پر آسانی سے گذر جانے میں مؤثر اعمال

۱۔ حکومت کے ظلم سے کمزور آدمی کو اپنے اثر سے چھڑانا۔ (طبرانی عن عائشہ)

۲۔ مساجد سے دین کے کام کے لیے تعلق اور بار بار آنا (بزاز باسناد حسن عن ابی الدرداء)

۳۔ دین میں اپنی رائے سے زیادتی نہ کرنا اور سُنت کی تعلیم دینا (دیلمی فی الاناجۃ بدور السافرہ صفحہ ۱۵۱)

جنّت و دوزخ

اہل سنت والجماعۃ اس عقیدہ پر متفق ہیں کہ جنت و دوزخ کی تخلیق ہو چکی ہے۔ امام ابوالحسن الاشعری نے مقالات الاسلامیین واختلاف المصلین میں بلفظِ مَا اَجْمَعَ عَلَیْہِ اَصْحَابُ الْحَدِیْثِ وَاَھْلُ السُّنَّۃِ۔ یعنی جن عقائد پر اہل حدیث اور اہلِ سُنّت متفق ہیں ان کی تفصیل میں فرماتے ہیں۔

وَاَنَّ الْجَنَّۃَ وَالنَّارَ مَخْلُوْقَتَانِ۔ کہ جنت و دوزخ پیدا شدہ ہیں۔

امام ابن قیم نے صحابہ، تابعین واہل سنت والحدیث وفقہا واہلِ التصوف کا اس عقیدہ پر حادی الارواح میں اجماع نقل کیا ہے۔ معتزلہ کا یہ کہنا کہ اس وقت جنت و دوزخ مخلوق نہیں۔ قیامت میں ان کی تخلیق ہوگی کہ ضرورتِ تخلیق اُس وقت ہے بالکل غلط ہے۔ جنت و دوزخ کی فی الحال موجودیت عبث نہیں بلکہ اس میں فوائد ہیں۔

جنت و دوزخ کے حالی وُجُود کے دلائل

ا۔ تمام انبیاء علیہم السلام نے جنت کی بشارت سنائی اور دوزخ سے ڈرایا اور ابشار وانذار کی اصلاحی تاثیر اس صورت میں قوی ہے کہ ابشار وانذار کے وقت جنت و دوزخ موجود ہوں۔

۲۔ موت کے وقت اور عذاب وثواب قبر کی صورت میں جنت و دوزخ کا معائنہ اور اس کے راحت والم سے متاثر ہونا احادیثِ صحیحہ میں ثابت ہے جو جنت کے وجود سے متعلق ہے۔ بعض اخیار کا مثلاً شہداء، صدیقین وانبیاء۔ بلکہ مؤمنین کی روحوں کا بعداز موت جنت کی نعمتوں سے فائدہ اور اشرار کا دوزخ کے آلام سے ضرر پذیر ہونا صحیح احادیث میں

مذکور ہے جس سے معلوم ہُوا کہ قبل از قیامت بھی انسانی ارواح کو جنت و دوزخ کے وجود سے ارتباط موجود ہے اس لیے ان کی پیدائش قبل از قیامت ان فوائد پر مشتمل ہے۔

دلائلِ نقلیہ وُجُودِ جنّت و دوزخ

آدم علیہ السلام کی سکونت جنت میں اور پھر زمین پر اُترنا قرآن میں مذکور ہے اور یہی جنت جنتِ آخرت اور دار الثواب تھی۔ یہی صحیح قول ہے۔ امام رازی کی نقل کے مطابق کہ مسکنِ آدم زمینی باغ تھا یا ابوالقاسم بلخی معتزلی ابو مسلم اصفہانی کا قول ہے یا امام موصوف کا اس مسئلہ میں خود توقف اختیار کرنا یا جبائی کا یہ کہنا کہ ساتویں آسمان کی جنت ہے یا بعض صوفیاء کا کہنا کہ جبلِ یاقوت کا ایک باغ تھا یا یہود و نصاریٰ کا باغِ عدن یا فلسطین یا اصفہان کا تعین کرنا یہ سب خلافِ عقل و نقل ہے بوجوہات ذیل۔

مسکنِ آدم آسمانی جنت تھا

اگر جنت کا لفظ جب لام تعریف کے ساتھ ذکر ہوا اور الفاظ میں زمین کے کسی باغ مراد لینے کا قرینہ موجود نہ ہو تو جنت سے مراد دار الثواب ہوگی بالخصوص کہ مسکنِ آدم میں آسمانی جنت کے دو قرینے خود الفاظ قرآن میں موجود ہیں۔ ایک یہ کہ سورہ طٰہٰ میں اس جنت کی جو صفات مذکور ہیں وہ زمینی جنت یا باغ کی صفات نہیں۔ بلکہ اس جنت کے صفات ہیں جو دار الجزاء ہے اور عالم بالا میں ہے۔ اللہ نے آدم کو جنت میں بسانے کے بعد ارشاد فرمایا

فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقَىٰ ۝ إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ۝ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ[1]

یہ پانچ صفات ایسے ہیں جس سے دنیا کا کوئی مقام خالی نہیں۔ مثلاً یہ کہ اس جنت سے نکلنے

---

[1] سورۃ طٰہٰ آیۃ ۱۱۷ تا ۱۱۹ [2] سورۃ البقرۃ آیۃ ۳۶

کے بعد تم کو تکلیف ہوگی اور یہ کہ اس جنت میں تم کو نہ بھوک لگے گی اور نہ ننگا ہونا پڑے گا اور نہ پیاس لگے گی اور نہ دھوپ لگے گی۔ یہ تمام خصوصیات بہشت بریں کے ہیں نہ باغ دنیا کے باغ دنیا میں اگر کچھ تھوڑے بہت فوائد ہیں تو اس سے نکلنے کے بعد کسی دوسرے باغ میں چلے جانے سے بھی وہ فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔

۲۔ دوسرا قرینہ کہ مسکن آدم بہشت تھا سورۃ بقرہ میں ہے۔ قُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ جنت سے اُترنے پر اس آیت میں دو نتیجے مرتب کیے گئے۔ اوّل یہ کہ تمہاری اولاد میں دشمنی ہوگی۔ جیسے اس سے پیشتر ملائکہ کی زبان سے بھی یہ ظاہر کیا گیا کہ أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ ط کہ تم ایسے لوگوں کو زمین میں جانشین بناتے ہو جو اس میں فساد اور خونریزی کریں گے۔ آیت مذکورہ میں اھبطوا کہ اُترو۔ اس کے بعد جمع کے لفظ سے فرمایا کہ تمہاری اولاد ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے اور دوسری یہ کہ تم اور تمہاری اور اولاد کو زمین میں ایک مقرر وقت تک رہنا ہے اور اس سے فائدہ اٹھانا ہوگا۔ اگر مسکن آدم آسمانی نہ ہوتا بلکہ زمینی ہوتا تو یہ الفاظ اللہ نہ فرماتا کیونکہ عداوت زمینی زندگی کا خاصہ ہے اور یہ بھی نہ فرماتا کہ تم اُترنے کے بعد زمین میں رہو گے جبکہ وہ پہلے بھی زمینی باغ میں رہتے تھے۔ معلوم ہوا کہ جس جنت سے اُتارے گئے وہ زمینی باغ نہ تھا۔ بھوک باطنی ذلت ہے اور ننگا پن ظاہری ذلت۔ پیاس باطنی گرمی ہے اور دھوپ ظاہری گرمی۔ جن میں تقابل ہے مسکن آدم ان سب سے پاک تھا۔

مسکن آدم کے متعلق استدلال

حدیثی استدلال صحیح مسلم میں ابوہریرہؓ و حذیفہؓ سے مرفوعاً حدیث آئی ہے کہ قیامت میں اولاد آدم، آدم علیہ السلام کو جنت کے کھلوانے کی درخواست

کرے گی جس کے جواب میں آپ فرمائیں گے وَھَلْ اَخْرَجَکُمْ مِنَ الْجَنَّۃِ اِلَّا خَطِیْئَۃُ اَبِیْکُمْ کہ تم کو جنت سے تو اپنے باپ کی غلطی نے نکلوایا۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ جس جنت سے حضرت آدم نکالے گئے یہ وہی جنت تھی جس میں آخرت میں جزائے اعمال کے طور پر داخلہ ہوگا۔ جب جنت کا خالی وجود ثابت ہوا تو دوزخ کا بھی ہوا کیونکہ فرق کا کوئی قائل نہیں۔

قرآنی استدلال دوسری دلیل یہ کہ جنت کے متعلق قرآن میں آیا کہ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ اور دوزخ کے متعلق آیا اُعِدَّتْ لِلْکَافِرِیْنَ یعنی جنت متقیوں کے لیے تیار کی گئی ہے اور دوزخ کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ یہ دو تعبیر ماضی اور گذشتہ کے لیے ہیں جو جنت و دوزخ کے سابق موجودگی کی دلیل ہے۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ فرعون اور لشکر فرعون کے غرق کردینے کے متعلق قرآن میں آیا ہے کہ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا کہ وہ غرق کیے گئے اور دوزخ میں داخل کیے گئے فرعون کا واقعہ گذشتہ ہے۔ اگر دوزخ قبل از قیامت موجود نہیں تو کس میں داخل کیے گئے۔

مسکن آدم کے بہشت ہونے پر شبہات کا ازالہ

جن لوگوں نے مسکن آدم کے جنت الخُلد ہونے سے انکار کیا ان کے شبہات درج ذیل ہیں۔

۱۔ داخلہ جنت قیامت میں ہوگا نہ قبل از قیامت اور آدم کا داخلہ بہشت قیامت سے پہلے تھا۔

۲۔ جنت میں برہنہ ہونا تکلیف اور غم پیش آنا نہیں ہوگا لیکن حضرت آدم علیہ السلام کو شجرہ ممنوعہ میں سے کھانے کے بعد یہ امور پیش آئے جو اس کے مسکن کے جنت الخلد ہونے کی دلیل ہے۔

۳۔ جنت آسمانی میں امر و نہی کی تکلیف نہیں دی جائے گی لیکن مسکنِ آدم میں نہی کا معاملہ پیش آیا۔

۴۔ جنتِ آسمانی میں داخلے کے بعد نکلنا نہ ہوگا لیکن حضرت آدم علیہ السلام نکالے گئے۔

ان چار شبہات کا جواب ایک ہے۔ وہ یہ کہ یہ سب امور اس وقت سے متعلق ہیں جب مومنوں کا داخلہ بعد از قیامت بطور جزائے اعمال کے ہو جائے۔ ایسا داخلہ قیامت کے بعد ہوگا ایسے داخلہ کے بعد برہنہ ہونے اور غم و رنج کی نوبت بھی نہ آئے گی۔ ایسے داخلہ کے بعد امر و نہی کے ساتھ اہل جنت مکلّف بھی نہ ہوں گے اور ایسے داخلہ کے بعد جنت سے نکلنا بھی نہ ہوگا۔ اور اس کی دلیل قرآنی آیات کا سیاق و سباق ہے جس میں اس داخلہ کی تصریح ہے جو بطور جزائے اعمال کے بعد از قیامت ہوگا۔

باقی پانچواں شبہہ کہ جنت کا داخلہ شیطان وسوسہ ڈالنے کے لیے کیسا ہوا جب کہ وہ جنت سے نکال دیئے گئے تھے تو اس کا جواب پہلا تو یہ ہے کہ وسوسہ ڈالنے کے لیے داخلِ جنت ہونا ضروری نہیں۔ جنت سے باہر رہ کر بھی وسوسہ ڈال سکتا ہے۔ جیسے کروڑوں میل دُور سورج ہم کو گرمی اور روشنی کا اثر پہنچاتا ہے جو جسم کثیف ہے شیطان لطیف کا اثر اس سے بھی قوی تر ہے۔ دوم یہ کہ داخلہ بغرض اقامت در ہائش ممنوع تھا نہ یہ کہ عارضی طور پر بطور امتحان و آزمائش کے داخلے کی بھی بندش تھی۔ سوم یہ کہ داخلے کی بندش قانونی تھی۔ جیسے کسی مجرم کا داخلہ حکومت کی طرف سے قانوناً بند کیا جائے۔ اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ چوری چھپکے بھی نہیں جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی حکمت کے تحت چوری چھپکے انداز میں علمِ الٰہی کے باوجود اس کے داخلے میں مداخلت نہیں کی گئی۔

چھٹا شبہہ کہ حضرت آدم زمین پر خلیفہ بنائے گئے تھے تو آسمان پر کیوں لے جائے گئے اس کا جواب یہ ہے کہ جیسے حضرت عیسٰی علیہ السلام زمین کے پیغمبر تھے لیکن کسی مصلحت کے تحت آسمان پر اُٹھائے گئے اور پھر زمین پر اُتارے جائیں گے۔

آسمانی جنّت میں سکونتِ آدم اور تناولِ شجرہ کیوجہ سے آتارنے کی حکمت

پہلی حکمت

ایک حکمت تو اس میں یہ تھی کہ آدم اور اولاد آدم میں یہ شعور راسخ اور مضبوط کیا جائے کہ انسانیت کا وطنِ اصلی زمین نہیں بلکہ آسمانی بہشت ہے تاکہ اس کے حصول کے لیے جو واحد ذریعہ ہے وہ صرف انبیاء علیہم السلام کی ہدایت اور تعلیمات کی پیروی ہے۔ اس کے لیے وہ زمینی زندگی میں پوری کوشش صرف کرے۔ تاکہ آبائی وطن کو پا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں آدم علیہ السلام کے نزول کے بعد یہ مضمون مذکور ہے۔ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۔ (البقرہ آیۃ ۳۸) یعنی زمین پر اُترنے کے بعد جب اللہ کی طرف سے سامانِ ہدایت انبیاء اور آسمانی کتب کے ذریعہ آجائے تو جو اس پر چلیں گے وہ وطن یعنی بہشت کی وہ زندگی پائیں گے جو خوف اور غم سے پاک ہے

دوسری حکمت

اللہ کی نافرمانی کے خطرناک اور دیرپا نتائج سے ڈرانا جو اس واقعہ سے مفہوم ہوتا ہے۔ آدم علیہ السلام جو تمام انسانیت کے باپ اور پیغمبر ہونے کے لحاظ سے مقبول و محبوبِ خدا تھے اُس نے ممنوعہ درخت سے کھایا جو گناہ یقیناً نہ تھا کیونکہ گناہ کے لیے قصد و ارادہ شرط ہے اور قرآن کا بیان ہے کہ۔ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ۔ ہم نے آدم کا قصد درخت کھانے میں نہیں پایا کہ قصد تھا ہی نہیں۔ ورنہ اللہ کا علم اس کو ضرور پاتا۔ دوم یہ کہ جنت شرعی احکام کا محل نہیں۔ لہٰذا یہ ممانعت تشریعی حکم نہ تھا۔ تشفیقی یعنی شفقت اور مہربانی کے اظہار کے لیے ایک حکم تھا۔ جس کا توڑنا گناہ تو نہیں ہوتا لیکن اس کی تعمیل نہ کرنے میں ضرر ہوتا ہے۔ جیسے ڈاکٹر یا حکیم کسی مریض کو کسی چیز کے کھانے سے روک دے۔ اس پر بھی وہ اگر کھائے تو گناہ تو نہیں ہوگا لیکن بدپرہیزی کے ضرر کا خمیازہ اس کو بھگتنا پڑے گا۔ بہرحال یہ صورت بھی قرینِ قیاس ہے کہ لفظ ہذا کے تحت

معین درخت کی بندش ہوئی۔ جس سے مرادِ الٰہی اس معین درخت کے تمام اقسام کی بندش تھی لیکن آدم علیہ السلام نے شخصی بندش سمجھی جو گناہ نہیں لیکن اجتہادی غلطی ہو سکتی ہے۔ ان سب امور سے یہ ظاہر ہوا کہ آدم علیہ السلام کا درخت سے کھا لینا حقیقی گناہ نہیں تھا۔ صوری حکم شکنی تھی۔ اور اس صوری حکم عدولی پر عصیٰ آدمُ ربّہٗ فغویٰ کا اطلاق کیا گیا کہ آدم نے ظاہری عصیان وغوایت کا ارتکاب کیا اور صوری مناسبت سے عربی زبان کے قواعد کے لحاظ سے بھلائی پر بھی ہم شکلی کیوجہ سے برائی پر اطلاق کیا جاتا ہے۔ جیسے جزآءُ سیئۃٍ سیئۃٌ مثلُھا (الشوریٰ: ۴۰) اور فمنِ اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیہ بمثلِ ما اعتدیٰ علیکم (البقرۃ آیۃ ۱۹۴) یعنی برائی کا بدلہ برائی ہے۔ اور جو تم پر ظلم اور زیادتی کرے تم بھی اُسی مقدار میں اُس پر ظلم اور زیادتی کرو۔ حالانکہ جوابی کارروائی جائز ہے نہ کہ برائی ہے اور نہ ظلم و زیادتی ہے۔ لیکن تھپڑ کے مقابلہ میں تھپڑ چونکہ دونوں تھپڑ کی صورت اور شکل کے اعتبار سے ایک جیسے ہیں اگرچہ ابتداءً تھپڑ ناجائز اور بُرائی ہے اور جوابی تھپڑ قانوناً جائز ہے اور بُرائی نہیں لیکن ہم شکلی کی وجہ سے اس پر بھی برائی اور زیادتی کا لفظ بولا گیا۔ یہی معاملہ حضرت آدم علیہ السلام کا درخت میں سے کھانے کا بھی ہے کہ اس کی ظاہری صورت حکم توڑنے کی تھی اگرچہ حقیقی حکم شکنی نہ تھی کیونکہ نہ حکم الٰہی شرعی حکم تھا نہ آپ کا فعل ارادے سے تھا۔ تاہم معصیۃ وغوایۃ کے الفاظ اس پر اطلاق کئے گئے۔ ان سب باتوں کے باوجود آدم اور اولادِ آدم کو جنت کی راحتوں سے محروم ہونا پڑا۔ جب صوری نافرمانی کا یہ حال ہے تو حقیقی نافرمانی کا انجام تو اس سے بھی خطرناک ہوگا۔ یہی تصور واقعہ آدم سے پیدا ہوتا ہے تاکہ گناہ کی نفرت راسخ ہو۔ پھر اس صوری اور غیر حقیقی نافرمانی کے کس قدر دُور رس اور خطرناک نتائج نکلے کہ جنت کی زندگی میں تمام اسبابِ مسرت حاصل تھے اور رنج و تکلیف کا نام و نشان نہ تھا۔ اس سے محرومی ہوئی اور دنیوی زندگی کی بے پناہ تکلیفات اور غموم و آلام میں خود آپ کو اور آپ کی تمام

اولاد کو قیامت تک مبتلا ہونا پڑا۔ جب غیر حقیقی نافرمانی کے یہ نتائج ہیں تو زمین پر اگر کوئی انسان حقیقی گناہ کرے اور وہ ایک نہیں بلکہ متعدد ہوں تو اُس کے نتائج آخرت کی زندگی کے لیے کس قدر خطرناک ہوں گے۔ جب جنت کی زندگی کی غیر حقیقی نافرمانی کے نتائج دنیا کی زندگی میں یوں نمودار ہوئے تو دنیوی زندگی کی نافرمانی کے نتائج آخرت میں کس قدر خطرناک صورت میں سامنے آئیں گے۔ اس لیے اولادِ آدم کو اپنے باپ کی اس تاریخی واقعہ سے سبق لینا چاہیے تاکہ نافرمانی نہ ہونے پائے۔

تیسری حکمت یہ ہے کہ جنت دارالراحت ہے اور زمین دارالمحنت ہے لہٰذا اس دارالمحنت میں دین کے لیے محنت کرنا حقیقی راحت یعنی جنت کے حصول کا واحد ذریعہ ہے لہٰذا زمین کی زندگی میں دین کے لیے مشقت اٹھاؤ تاکہ جنت کی راحت نصیب ہو۔

براحتے نرسید آنکہ محنتے نہ کشید

دنیا کا نظام بھی ایسا ہے کہ جو محنت کرتا ہے وہی راحت پاتا ہے۔

چوتھی حکمت واقعہ آدم وابلیس سے اولادِ آدم کو یہ ذہن نشین کرانا ہے کہ شیطان انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ جس کا کام طاعتِ خداوندی سے ہٹانا ہے اور خواہشِ نفس میں لگانا ہے لہٰذا انسانیت اور ابلیسیت کے درمیان مسلسل عداوت رہے گی اور فلاحِ انسانی کا راز اسی میں مضمر ہے کہ وہ ابلیسی لغزشوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے تاکہ اس کو وطنِ اصلی اور آبائی مقام نصیب ہو ورنہ وطنِ اصلی سے محرومی نصیب ہوگی۔

پانچویں حکمت حضرت آدم علیہ السلام کو جنتی زندگی سے زمینی زندگی کی طرف منتقل کرنے میں ایک حکمت یہ تھی کہ جنت کی پُرمسرت زندگی کا وہ دنیا کی پُرآلام زندگی سے موازنہ کریں اور یہ تاریخی حقیقت اولادِ آدم میں تسلسل کے ساتھ

منتقل ہو کر قابل ترجیح حیاتِ آخرت ہے تاکہ وہ دنیا کے دھندوں میں منہمک ہو کر جنت وآخرت کی حقیقی زندگی سے غفلت نہ برتیں تاکہ وَالْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی (الاعلیٰ آیۃ ۱۷) آخرت اور جنت کی حیات بہتر اور پائیدار ہے کا تصور اولادِ آدم کو جنت کی زندگی کمانے کی جدوجہد میں برقی رو پیدا کر دے۔

چھٹی حکمت

قصۂ آدم علیہ السلام عداوت ابلیس کا مظہر ہے جس سے اس حکمت کا اظہار مقصود ہے کہ تکمیلِ انسانیت کے لیے ابلیسی عداوت کا وجود ضروری ہے کیونکہ ایک مخفی مکار اور عظیم دشمن کا وجود انسانیت کے حدود کے تحفظ کا محرک ہے اور ایسے خطرناک دشمن دین کی عداوت کا تصور محافظت دین کا سامان ہے۔ انسانی وجود کے اندر ایک چھوٹی حکومت کا نمونہ موجود ہے۔ انسانی اعضاء رعیت کی مانند ہیں۔ روحِ انسانی ایک بادشاہ اور حکمران ہے رشرع اور قانون الہٰی اس چھوٹی سی حکومت کا دستور مملکت ہے شیطان یا ابلیسیت بدنی اعضاء کی رعیت کو شرعی دستورِ مملکت سے بغاوت پر آمادہ کرتی ہے۔ اگر روحِ انسانی دفاعِ مملکت اور ڈیفنس سے غافل رہے تو دشمن اس مملکت پر قبضہ کرنے کرنے میں کامیاب ہو جائے گا اور انسان کی اندرونی مملکت کا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور اگر دشمن سے بچاؤ کی حفاظتی تدابیر پر بروقت نظر رہے گی تو ڈیفنس اور دفاع مضبوط ہو کر ابلیسی تدابیر ناکام ہوں گی۔ اس کی واضح مثال مملکتِ پاکستان کے پہلو میں بھارت کی دشمن حکومت کا وجود ہے۔ اگر پاکستان کے پہلو میں بھارت جیسی دشمن اور مکار حکومت نہ ہوتی تو پاکستانی عوام اور حکومت دونوں غفلت کا شکار ہو کر دفاع اور تحفظِ مملکت کا پُرجوش انتظام نہ کرتے اور پاکستان کی بری، بحری، ہوائی فوج نہ ہونے کے برابر ہوتی اور اسلحہ جنگ اور جنگی قوتوں کو بروئے کار لانے کا کوئی انتظام نہ ہوتا اور ہماری تمام مخفی دفاعی قوتیں معطل ہو کر رہ جاتیں۔ اب جو کچھ پاکستان کی دفاعی سازوسامان کی روز افزوں ترقی ہمیں نظر آتی ہے یہ سب بھارت جیسے دشمن کے وجود کے تصور کا صدقہ

بے یہی راز ہے کہ آدمیت کی تکمیل کے لیے اس کے ساتھ ساتھ ابلیس عداوت کا کارخانہ بھی وجود میں آیا۔ دشمن کے وجود کا یہ فلسفہ حضرت علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اپنے مرید کو سمجھایا جس نے حضرت کو دشمنوں کی ضرر رسانی کی شکایت کی آپ کا جواب اقبال نے نظم کیا فرمایا ؎

راست می گویم عدو ہم یار تست — ہستی او رونقِ بازار تست

ہر کہ دانا ئے مقامات خودی است — فضل حق داند اگر دشمن قوی است

کشت انسان را عدو باشد سحاب — ممکناتش را بر انگیزد ز خاک

حقیقت حیاۃ الجنّت

جنت کی حقیقت اور اس کی نعمتیں اس قدر بلند ہیں کہ انسان کا تصور اس کی بلندی تک رسائی سے قاصر ہے۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ط (السجدۃ آیۃ ۱۷)

یعنی مشاہدہ سے قبل کوئی نفس ان نعماء جنت کو نہیں جانتا جو میں نے مخفی رکھی ہیں آنکھوں کو ٹھنڈی کرنے والی نعمتیں جو ان کے عمل کا بدلہ ہوگا۔

بخاری و مسلم میں حضور علیہ السلام کا ارشاد ابوہریرہؓ کی روایت سے منقول ہے کہ اللہ فرماتا ہے کہ میں نے جنت میں وہ وہ نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں ہیں نہ کسی کان نے ان کی تعریف سُنی ہے اور نہ کوئی دل اس کا تصور کر سکتا ہے۔ چونکہ ان نعمتوں کے ساتھ دنیا کی نعمتوں کو کوئی نسبت نہیں اس لیے ان کی صحیح حقیقت کا انکشاف قبل از مشاہدہ اور استعمال ناممکن ہے لیکن اُن کا اجمالی تعارف چونکہ علوم الآخرۃ کے تحت ضروری تھا اور انسان صرف دنیوی نعمتوں سے متعارف ہے۔ اس لیے دنیا کی نعمتوں کی تعبیر کے ذریعے قرآن اور حدیث نے ہم کو نعماء جنت سے متعارف کرایا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ جنت کی نعمتوں کے لیے دنیوی اشیاء کے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں یہ صرف

رسمی اور تعبیری مناسبت کی وجہ سے ہے ورنہ حقیقت دنیا اور آخرت کی نعمتوں کی مختلف ہے میں کہتا ہوں کہ جنت میں بھی پانی ہوگا اور دنیا میں بھی پانی ہے لیکن دونوں میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ اگر پوری دنیا کی دولت خرچ کر کے ایک گلاس عمدہ شربت تیار کیا جائے تو یہ شربت جنت کے پانی کے مقابلے میں ایسا ہے کہ جس نے جنت کا پانی پیا ہو اس کو یہی شربت دیکھ کر قے آئے گی۔ اس پانی کی جو لذت اور بدنی و روحانی اثرات ہیں وہ دنیا کے پانی میں کہاں۔

اجمالی نقشہ حیاتِ آخرت

قرآن حکیم نے حیات جنت کا منفی انداز میں یہ نقشہ کھینچا ہے لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ کہ وہ زندگی خوف اور غم سے کلیۃً پاک ہے۔ اور مثبت انداز میں یہ بیان کیا ہے وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ۝ نُزُلًا مِّنْ غَفُورٍ رَّحِيمٍ[1] کہ جنت کی زندگی میں تم کو جو کچھ جی چاہے وہ ملے گا اور جو کچھ طلب کرو گے وہ بھی ملے گا یعنی دل اور زبان کے تمام مطلوبات حاصل ہوں گے اور تم کو خود انتظام کرنے کی ضرورت بھی نہ ہوگی کہ تم تمام عرصۂ حیات جنت میں خدائے غفور و رحیم کے مہمان ہو گے مہمان کو ضروریات کے لیے خود کچھ نہیں کرنا پڑتا، سب کچھ میزبان کے ذمہ ہوتا ہے احادیث میں جو بدور السافرہ میں ہیں اس اجمالی حیاتِ طیبہ کی یہ تفصیل آئی ہے غِنًا وَلَا فَقْرَ صِحَّةٌ وَلَا مَرَضَ شَبَابٌ وَلَا هَرَمَ حَيَاةٌ وَلَا مَوْتَ ۝ یعنی حیاتِ جنت میں بے نیازی اور غنا ہے فقر و محتاجی نہیں۔ تندرستی ظاہری و باطنی ہے مرض نہیں، جوانی ہے بڑھاپا نہیں زندگی ہے موت نہیں، یہ وہ مختصر نقشہ ہے کہ اس نقشہ کے مطابق ایک منٹ کی زندگی بھی کسی بڑے سے بڑے شہنشاہ کو دنیا میں نصیب نہیں۔ اسی لیے اللہ کا ارشاد ہے وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ[2] ۝ کہ صرف آخرت کی زندگی ہی حقیقی زندگی ہے

---

[1] حٰم السجدۃ آیۃ ۳۱۔۳۲ [2] عنکبوت آیۃ ۶۴

حدیث میں آیا کہ جنتی زندگی میں ایک شخص کی طاقت ایک سو قوی جوان اشخاص کے برابر ہوگی جو ہمیشہ ایک ہی حالت میں رہے گی۔ اس میں کمی نہیں آئے گی۔ حُسن اور خوبصورتی اس کی بے مثال ہوگی، اور اس میں دائمی اضافہ ہوتا رہے گا جیسے احادیث صحیحہ سے ثابت ہے اس کے علاوہ دیدار الٰہی کی لذت ایسی ہوگی جو ان تمام لذتوں سے بالاتر ہوگی جو جنت میں دیگر ذرائع سے حاصل ہوں گی۔

قیامت کی علامات میں سے حضرت عیسٰی علیہ السّلام کا آسمان سے نزول کی بحث بھی شامل ہے

حضرت عیسٰی علیہ السلام کا آسمان کو اُٹھایا جانا اور اس وقت زندہ ہونا اور آخری زمانے میں زمین پر نزول فرمانا اہلِ اسلام کا متفقہ عقیدہ ہے کہ تقریباً چودہ سو سال سے لے کر اب تک اسلام کے تمام فرقے اس پر متفق چلے آتے ہیں اور اسلامی فرقوں میں اس عقیدے کے متعلق کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا حالانکہ دیگر بیسیوں اعتقادی مسائل میں اختلاف موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب و سنت کی روشنی میں اس مسئلہ کو اس قدر واضح اور صاف کیا گیا ہے کہ جس کو اسلام کے ساتھ معمولی تعلق بھی ہو وہ اس مسئلہ میں اختلاف کا روادار نہیں اور اسلام اور مسئلہ حیات و نزول مسیح علیہ السّلام کو لازم و ملزوم سمجھتے رہے ہیں اور یہ کہ تسلیمِ اسلام کے ساتھ اس مسئلہ کا انکار قطعاً جمع نہیں ہو سکتا۔ تفسیر بحر المحیط ج ۲ ص ۴۷۳ میں امام ابنِ عطیہ سے اجماع کے الفاظ منقول ہیں۔

حَیَاتُ الْمَسِیْحِ بِجِسْمِہٖ اِلَی الْیَوْمِ وَنُزُوْلُہٗ مِنَ السَّمَاءِ بِجِسْمِہِ الْعُنْصُرِیِّ مِمَّا اَجْمَعَ عَلَیْہِ الْاُمَّۃُ وَتَوَاتَرَ بِہِ الْاَحَادِیْث

حضرت مسیح علیہ السّلام کا جسم کے ساتھ اس وقت تک زندہ ہونا اور جسم عنصری لیے آسمان سے اُتر کر آنا ایسا عقیدہ ہے جس پر امت کا اتفاق ہے اور پیغمبر کی متواتر احادیث سے ثابت ہے

تفسیر جامع البیان میں اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ کے تحت تفسیر وجیز سے نقل کیا ہے

وَالْاِجْمَاعُ عَلٰی اَنَّهٗ حَیٌّ فِی السَّمَآءِ یَنْزِلُ یَقْتُلُ الدَّجَّالَ وَیُؤَیِّدُ الدِّیْنَ

اس پر اجماع ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام آسمان پر زندہ ہیں، اُتریں گے دجال کو قتل کریں گے اور دین اسلام کو مضبوط کریں گے۔

اسی طرح امام شوکانی کے رسالہ التَّوْضِیْحُ فِیْمَا تَوَاتَرَ فِی الْمُنْتَظَرِ وَالدَّجَّالِ وَالْمَسِیْحِ اور امام سیوطی کے اَلْاِعْلَامُ بِحُکْمِ عِیْسٰی عَلَیْهِ السَّلَامُ میں تواتر اور اجماع مذکور ہے۔ حجج الکرامۃ صفحہ ۴۳۲ میں امام شوکانی کی انتیس ۲۹ احادیث درباره نزول عیسٰی علیہ السلام کے ذکر کے بعد تواتر اور اجماع کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح حافظ ابن حجر نے تلخیص الحبیر کتاب الطلاق میں لکھا ہے۔ اَلْاِجْمَاعُ عَلٰی اَنَّهٗ رُفِعَ بِبَدَنِهٖ حَیًّا کہ اس پر اجماع ہے کہ وہ بدن کے ساتھ زندہ اُٹھائے گئے ہیں۔ اسی طرح فتح الباری میں ذکر ادریسؑ کے سلسلہ حضرت مسیحؑ کے نزول پر اجماع منقول ہے۔ اسی طرح تفسیر ابن کثیر میں تواتر نزول کی صراحت کی گئی ہے۔ اس طرح:۔

۱۔ مرزا غلام احمد نے براہین احمدیہ صفحہ ۴۹۸ میں حضرت مسیح علیہ السلام کے زندہ ہونے اور دوبارہ آنے کی تصریح کی ہے اور یہ کتاب اس کے اقرار کے مطابق اس وقت لکھی گئی تھی کہ وہ بزعم خود نبی تھا۔ (دیکھو ایام الصلح صفحہ ۷۵)

۲۔ مرزا غلام احمد براہین احمدیہ حاشیہ صفحہ ۵۰۵ میں وان عدتم عدنا کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اس میں مسیح کے جلالی طور پر آنے کا اشارہ ہے۔ اگر زمی قبول نہ کرو گے تو وہ زمانہ بھی آنے والا ہے کہ جب مسیح علیہ السلام جلالت کے ساتھ دنیا پر اُتریں گے اور جلال الٰہی گمراہی کو نیست و نابود کر دے گا۔ میرا زمانہ اس زمانہ کے لیے بطور ارہاص واقعہ ہوا ہے۔

۳۔ مرزا غلام احمد هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ کی تفسیر براہین صفحہ ۴۹۸ میں یوں ذکر کرتے ہیں کہ جب حضرت مسیح علیہ السلام دوبارہ اس دنیا میں تشریف لائیں گے تو ان کے ہاتھ سے دین اسلام جمیع آفاق و اقطار میں پھیل جائے گا۔

۴۔ ازالہ اوہام ص۲۲۵ پر مرزا غلام احمد لکھتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے عمر کو قتل سے منع کیا اور فرمایا اگر یہی دجال ہے تو اس کا صاحب عیسیٰ بن مریم ہے جو اس کو قتل کرے گا ہم اسے قتل نہیں کر سکتے۔

حیات و نزولِ مسیح کے مسئلہ پر ہم مختصراً قرآنی ؂ حدیثی ؂ تاریخی ؂ اور عقلی ؂ حیثیت سے روشنی ڈالیں گے۔ اجماعی ؂ حیثیت سے ہم نے مسئلہ پر روشنی ڈال دی ہے۔

حیاتِ مسیح علیہ السّلام قرآنی روشنی میں

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ ؕ (آل عمران آیۃ ۵۴) یہود نے حضرت مسیحؑ کے خلاف تدبیر کی اور اللہ نے ان کو بچانے کی تدبیر کی۔ اللہ کی تدبیر سب تدبیر کرنے والوں کی تدبیر سے بہتر ہے۔ مرزا صاحب نے اس آیۃ کا مطلب یہ بیان کیا یہودیوں نے حضرت مسیحؑ کے لیے قتل و صلیب کا حیلہ سوچا تھا۔ خدا نے مسیحؑ کو وعدہ دیا اور کہا کہ تجھے اپنی طرف رفع کروں گا۔ (اربعین جلد ۳ ص۱۰)۔ پھر آئینہ کمالات ص۴۶ و ص۴۹ میں لکھتے ہیں کہ وعدے کے الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ وہ وعدہ جلد پورا ہونے والا ہے۔ پھر مرزا صاحب ازالہ اوہام ص۳۸۰ میں لکھتے ہیں کہ پھر لعد اس کے ان کے (یہود) کے حوالے کیا گیا۔ تازیانے لگائے گئے۔ گالیاں سُننا طمانچے کھانا۔ ہنسی اور ٹھٹھے میں اڑائے جانا اُس نے دیکھا۔ آخر صلیب پر چڑھا دیا۔ آیت مذکورہ کی مرزائی تفسیر نہ صرف یہ کہ بے دلیل اور تحریف ہے خود ایک عظیم بہتان اور ذات خداوندی کی شان کے بھی خلاف ہے۔ بقول مرزا یہود نے حضرت مسیح کے خلاف تدبیر کی اور اللہ نے بچانے کی۔ پھر یہود نے اُس کو تازیانے بھی لگائے، گالیاں بھی دیں، ٹھٹھا اور تمسخر بھی اڑایا، سولی پر بھی چڑھایا پھر بھی قرآن نے یہ کہا کہ اللہ خیر الماکرین ہے اور اس کی تدبیر بہتر و کامیاب رہی۔ اگر مرزائی تحریف کے اس خود ساختہ شوشے کو بھی مان لیا جائے کہ سولی پر اتارنے سے یہود نے اس کو مُردہ سمجھا لیکن اس کی آخری رمق باقی تھی اور

علاج سے اچھے ہوئے پھر کشمیر جا کر بہت مدت کے بعد طبعی موت سے مر گئے، تو کبھی موت کے وقوع کی راہ میں یہود کی غلط فہمی آڑے آگئی، نہ کوئی خرقِ عادت کارنامہ آیت مذکورہ کی روح اللہ کی حفاظتی تدبیر کا یہودی تدبیر سے موازنہ کر کے اللہ کی تدبیر کی پوری کامیابی اور عظمت کا بیان کرنا مقصود ہے لیکن مرزا کی تفسیر کے تحت اس وعدہ الٰہی کے باوجود یہود نامسعود حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ جو کچھ کرنا چاہتے تھے وہ سب کچھ کر چکے لیکن پھر بھی بقول مرزا تدبیر اور وعدہ الٰہی بلند اور کامیاب رہا۔ اس طرح مرزا نے حضرت مسیح اور خدائے قرآن دونوں کی یہود کے مقابلے میں توہین اور تذلیل کی۔ اگر دماغ میں کجی اور الحاد نہ ہو تو آیت کا مطلب صاف ہے کہ یہود نے حضرت مسیح کے خلاف تدبیر کی کہ ان کو بے عزت کر کے سولی پر چڑھا دیا جائے لیکن اللہ نے اُس کو آسمان پر اُٹھا لیا اور یہود اس کا بال بھی بیکا نہ کر سکے۔ تقریباً چودہ سو (۱۴۰۰) سال سے قرآنی علوم کے ماہرین صحابہ و تابعین وغیرہ نے یہی مطلب سمجھا لیکن چودھویں صدی میں مسیحیت کی دکان جمانے والے نے یہ نامعقول مطلب تراشا۔

۲۔ اِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسٰۤی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَمُطَہِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ ج ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُکُمْ فَاَحْکُمُ بَیْنَکُمْ فِیْمَا کُنْتُمْ فِیْہِ تَخْتَلِفُوْنَ ط (آل عمران: ۵۵)

جس وقت کہا اللہ نے اے عیسیٰ میں لے لوں گا تجھ کو اور اُٹھا لوں گا تجھ کو اپنی طرف اور پاک کر دوں گا تجھ کو کافروں سے اور رکھوں گا ان کو جو تیرے تابع ہیں غالب ان لوگوں پر جو انکار کرتے ہیں قیامت کے دن تک پھر میری طرف تم سب کو آنا ہے پھر میں فیصلہ کر دوں گا جس بات میں تم جھگڑتے تھے۔

توفّی کے متعلق کلیات ابی البقاء میں ہے

اَلتَّوَفِّیْ اَلْاِمَاتَۃُ وَقَبْضُ الرُّوْحِ

یعنی توفّی کا لفظ عوام کے ہاں موت دینے اور

وَعَلَيْهِ اسْتِعْمَالُ الْعَامَّةِ وَ	جان لینے کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن بلغاء کے
الْاِسْتِيْفَاءُ وَ اَخْذُ الْحَقِّ وَ	نزدیک اس کے معنی پورا وصول کرنا اور
عَلَيْهِ اسْتِعْمَالُ الْبُلَغَاءِ	ٹھیک لینا ہے

گویا ان کے نزدیک موت پر توفی کا اطلاق اس حیثیت سے ہے کہ اس میں کسی خاص عضو سے نہیں بلکہ پورے بدن سے جان لی جاتی ہے تو اگر خدا نے کسی کی جان بدن سمیت لی تو اس پر توفی کا اطلاق بطریقِ اولیٰ ہوگا اور روح مع البدن لینا توفی کے مفہوم میں داخل ہے۔ عام طور پر چونکہ روح بدن کے بغیر لی جاتی ہے اس لئے موت پر توفی کا اطلاق کثرت سے آیا اور یہاں یہ راز ہے، کہ عیسیٰ علیہ السلام کی حالت چونکہ عام حالات سے مختلف تھی اس لئے اہم ترین ضرورت کے موقع پر بھی اللہ نے عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں موت کا اطلاق نہیں کیا بلکہ توفی کا کیا جو قبضِ روح اور قبضِ روح مع البدن دونوں کو شامل ہے۔ یہ غلط ہے کہ فاعل اگر خدا ہو اور مفعول ذی رُوح ہو، تو توفی موت کے معنی میں ہوگا۔ بالفرض اگر موت کے معنی میں ہو تو ضحاک شاگرد ابنِ عباس نے معالم میں تقدیم وتاخیر کا قول نقل کیا ہے۔ یعنی متوفیک، میں تم کو موت دوں گا زمین پر اتارنے کے بعد کی دلیل یہ ہے کہ سورۂ زمر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ط ۔ یہاں فاعل اللہ اور مفعول ذی روح ہے پھر بھی نیند کی حالت کے متعلق فرمایا کہ اللہ جان لیتا ہے موت کے وقت اور وہ جان بھی لیتا ہے جو نیند کی حالت میں مری نہیں، یہاں نیند پر توفی کا اطلاق آیا اور توفی کو عدمِ موت کے ساتھ جمع کیا اس حقیقت کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق توفی کے لفظ میں موت کا معنی مراد نہیں بلکہ اُٹھا لینے کا معنی مراد ہے اور یہی معنی ابنِ عباس کا صحیح قول ہے جو روح المعانی میں مذکور ہے اور مناسب حال عیسیٰ علیہ السلام بھی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہودی محاصرہ کے وقت جو پریشانی لاحق تھی وہ مندرجہ ذیل امور کی وجہ سے تھی۔

ا ر کہ میں یہود کی دست بُرد اور جور و ستم سے بچ جاؤں گا یا نہیں۔ اس کے جواب میں

یٰعِیۡسٰۤی اِنِّیۡ مُتَوَفِّیۡکَ ۔ میں تم کو پورے لوں گا اور دست بُرد سے بچالوں گا جیسے ۔

وَاِذۡ کَفَفۡتُ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ عَنۡکَ میں بنی اسرائیل کو تم تک پہنچنے سے روکوں گا۔

۲۔ دوسری یہ تشویش تھی کہ میرا بچاناز مین کے کس حصہ میں ہو گا کہ ان کو میری طرف پہنچنے

نہ دیا جائے گا یا اور کوئی صورت ہو گی۔ اس کے جواب میں فرمایا کہ میں تجھ کو اپنی طرف آسمان پر

اُٹھالوں گا۔

۳۔ اپنی والدہ اور خاندان کے حال سے مشوش تھے کہ وہ ان پر داغ لگاتے تھے۔ اس

کے متعلق کیا انتظام ہو گا؟ اس کے متعلق فرمایا۔ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا[1]

میں منکروں سے تم کو اور تمہاری والدہ کو پاک کردوں گا۔ چنانچہ اس کا انتظام

قرآن اور خاتم الانبیاء علیہ السلام کی زبان سے کیا گیا کہ آپ اور آپ کی والدہ کی زندگی بے

داغ ہے۔

۴۔ کہ میرے اُٹھائے جانے کے بعد میری اُمت یا متبعین کا ان منکروں کے مقابلہ میں کیا حال

ہو گا تو فرمایا۔ وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ

کہ قیامت تک تیرے تابع تیرے منکروں پر غالب ہوں گے۔ یہ وعدہ آج بھی ایک حقیقت

ہے۔ اسرائیل کا وجود اس وعدے پر اثر انداز نہیں کہ خود قرآن نے یہود کی ذلت اور

مسکنت میں دو استثنائی صورتیں بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ یہود اسلام لاکر اسلام کی پناہ میں

آجائیں۔ دوم یہ کہ کسی قوم عیسائی کی پناہ آجائے۔ اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ[2]

یعنی ذلت اور مسکنت کی دو صورتیں مستثنائی ہیں۔ اسلام لاکر اللہ کی پناہ میں آجانا یا عیسائی

قوم کی پناہ میں آنا۔ اسرائیل، برطانیہ، امریکہ اور عیسائی اقوام کی پناہ کی وجہ سے موجود ہے جس کا

---

[1] سورۃ زمر آیۃ ۴۱ [2] آل عمران آیۃ ۵۵ [3] سورۃ المائدہ آیۃ ۱۹

استغنا، خود قرآن نے کیا ہے۔ یہود کی قوت اور اقتدار عیسائیوں کے سہارے قائم ہے لیکن مسلمانوں کا اقتدار عیسائیوں کے سہارے کا محتاج نہیں، خواہ امریکہ ہو یا روس، بلکہ خود آپس میں متحد ہو کر سامانِ قوت کی فراہمی کا محتاج ہے کہ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا[۳] کے تحت نوّے کروڑ مسلمان ایک منظم بلاک بن جائیں اور وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ[۴] کے تحت سامان قوت کی تیاری میں لگ جائے اور اپنی خداداد مشترک دولت اس میں صرف کر دے تو مستقل عزت مسلمانوں کے لیے اب بھی پہلے کی طرح حاصل ہو گی لیکن حبل اللہ اور اسلام پر عمل پیرا ہونے سے مسلمانوں کی قوت ہے نہ کہ اسلام کو چھوڑ کر مغربیت اختیار کرنے اور اسلام میں تحریف کرنے سے وہ قوی ہوں گے۔ یورپ کی قوت بھی تعلیم اسلامی کے اجزاء سے ہے۔ یعنی سامانِ قوت کی تیاری اور قوانین قدرت کا علم حاصل کر کے اس سے استفادہ کرنا۔ ان کے غیر اسلامی اجزاء یعنی اُن کے تمدن کو ان کی ترقی میں دخل نہیں بلکہ ان کی وجہ سے مادی ترقی کے باوجود ان کا زوال شروع ہو گیا ہے۔ وہ غیر اسلامی اجزاء خدا اور آخرت فراموشی، انبیاء علیہم السلام کے اخلاقی اقدار کو زندگی سے خارج کرنا، نسل و وطن کے بت کی پرستش کرنا، زنا، جوا بازی، لواطت، شراب نوشی، سود، عیاشی جنہوں نے مغربی قوت کے اعصاب کو کمزور کر دیا ہے اس کمزوری کی وجہ سے مغرب کی نمبر ایک قوت کوریا اور ویت کانگ کی معمولی بے سروسامان ریاستوں کے ہاتھوں پٹ رہی ہے اور اب توبہ کرنے پر آمادہ ہے لیکن توبہ بھی قبول نہیں ہوتی مغرب زدہ مسلمانوں کی یہ بدقسمتی ہے کہ اُن کے ذہنی انحطاط نے ان کو سامان قوت کے ترک اور سامان زوال کے اپنانے پر آمادہ کیا ہے مسلمانوں کی بڑی قوت اسلام ہے وہ اس میں تحریف کر رہے ہیں اور اسباب زوال میں خطرناک چیز یورپ کی شیطانی تہذیب ہے اسکو وہ اپنا رہے ہیں

۱؎ و ۲؎ سورۃ آل عمران آیۃ ۵۵ ۳؎ آل عمران ۴؎ آل عمران ۵؎ انفال

۳۔ وَبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ۝ وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۚ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ۚ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۝ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ۝ (النساء: ۱۵۶ تا ۱۵۹)	یہود کے دلوں پر بندش ہدایت کی مہر لگ چکی ان کے کفر کی وجہ سے اور حضرت مریم پر بڑا بہتان باندھنے کی وجہ سے اور اس وجہ کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے عیسٰی ابن مریم کو جو خدا کے رسول تھے قتل کر ڈالا اور انہوں نے اس کو نہ قتل کیا نہ سولی پر چڑھایا لیکن شبہ پڑ گیا انکو اور جو حضرت عیسٰی کے متعلق اختلاف کرتے تھے وہ شک میں ہیں انکو علم نہیں صرف اٹکل پچو باتوں پر چلتے ہیں اور انہوں نے یقیناً حضرت عیسٰی کو قتل نہیں کیا بلکہ اس کو اللہ نے اپنی طرف اٹھالیا اور وہ غالب اور حکمت والا ہے اور اہل کتاب کا کوئی گروہ نہیں مگر وہ حضرت عیسٰیؑ پر اس کے مرنے سے پہلے ایمان لائے گا اور وہ ان کے اعمال پر گواہ ہوں گے۔

اس آیت میں چند امور بیان ہوئے ہیں۔

(۱) کہ حضرت عیسٰیؑ نہ قتل ہوئے نہ سولی پر چڑھائے گئے۔ جو لوگ قتل اور صلب کے قائل ہیں جیسے یہود و نصاریٰ وہ قطعاً غلطی پر ہیں۔ قرآن نے واضح الفاظ میں ان کی تردید کی۔ مرزائیوں یا مرزا کا یہ کہنا کہ سولی پر چڑھائے گئے ہیں لیکن سولی پر مرے نہیں۔ یہ قول بھی یہود و نصاریٰ کی طرح قرآن کے خلاف ہے۔ مَا صَلَبُوْهُ کا یہ معنی تراشنا کہ سولی پر نہیں مرے لغت عرب کے خلاف ہے۔ صلب کے معنی سولی پر چڑھانا اور ما صلب کا معنی سولی پر نہ چڑھانا ہے۔ یہ قطعاً قرآن کی تحریف ہے کہ ما صلبوہ کا یہ معنی لیا جائے

کہ یہود نے حضرت عیسیٰ کو سولی پر چڑھایا لیکن سولی پر اس کو موت نہیں آئی۔

۲۔ آیت میں وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا کے بعد فرمایا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ یعنی حضرت عیسیٰ قتل نہیں ہوئے اللہ نے اس کو اپنی طرف اُٹھایا۔ ماقتلوہ اور بل رفعہ اللہ میں ضمیر حضرت عیسیٰ کی طرف راجع ہے اور عیسیٰ نام ہے جسم اور روح دونوں کا یعنی عیسیٰ جو مجموعہ روح وجسم کا ہے اس پر قتل واقع نہیں ہوا بلکہ بجائے قتل کے رفع الی اللہ واقع ہوا۔ یہ ظاہر ہے کہ مراد یہ ہے کہ یہاں جس ذات سے قتل کی نفی ہوئی اسی کے لیے رفع کا اثبات ہے اور قتل نہ صرف جسم کا ممکن ہے اور نہ صرف روح کا بلکہ جسم اور روح کے مجموعہ پر قتل واقع ہو سکتا ہے کیونکہ قتل کا مفہوم یہ ہے کہ کسی خارجی مؤثر کے ذریعہ روح کو جسم سے الگ کیا جائے۔ جب غیر مقتول جسم مع روح ہے' تو مرفوع الی اللہ بھی جسم و روح کا مجموعہ ہوگا۔

(۳) اس کے علاوہ جب رفع حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر واقع ہے تو جب تک اس کے خلاف قرینہ نہ ہو تو جسمانی رفع ہی مراد ہوگا جیسے سورۂ یوسف میں وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ کہ حضرت یوسفؑ نے والدین کو تخت پر اُٹھایا جس کا معنی جسم اور روح دونوں کا اُٹھانا ہے نہ کہ والدین کی روح کو اُٹھانا۔

(۴) اگر روحانی رفع لیا جاوے تو یہ چند وجوہات سے غلط ہے۔

ایک وجہ یہ کہ مجاز کو اختیار کرنا ہے بلا قرینہ مثلاً يَرْفَعُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ یہاں چونکہ جسمانی رفع مراد نہ تھا دینی رفع مراد تھا تو بطور قرینہ لفظ درجات لایا گیا۔ اسی طرح وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ یہاں بھی قرینہ موجود ہے جو لفظ درجات ہے۔

دوسری وجہ روحانی رفع مراد لینے کے غلط ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ - کہ یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل نہیں کیا

بلکہ اللہ نے ان کو اپنی طرف اُٹھایا۔ اب روحانی رفع مراد لینے میں یہ ہوگا، کہ یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کا مرتبہ بلند کیا جو بالکل تحریف اور غلط ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس واقعہ سے قبل چالیس سال پیغمبر کی حیثیت سے زمین پر رہے اور پیغمبر کے مرتبہ کی بلندی پیغمبر کے وقت سے ان کو حاصل ہوتی ہے تو اس وقت مرتبہ کی بلندی کی تخصیص بے فائدہ ہے اس کے علاوہ عربی زبان میں بَلْ کا استعمال دو مقابل چیزوں میں ہوتا ہے لیکن یہاں اگر رفع سے روحانی رفع اور مرتبہ کی بلندی مرزائی تحریف کے مطابق لی جائے تو مقابلہ فوت ہو جائے گا جس سے بَلْ کا استعمال غلط پڑے گا کیونکہ معنی یہ ہوگا کہ یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مصلوب و مقتول نہیں کیا بلکہ اللہ نے اس کا مرتبہ بلند کیا۔ اگر کوئی پیغمبر یا مومن ناحق مقتول و مصلوب ہو جائے تو وہ شہید ہوگا اور شہید کا مرتبہ بلند ہوتا ہے تو اس کا مقابلہ بل رفعہ اللہ کے لیے درست ہوگا جب کہ اس سے بھی مرتبہ کی بلندی اور رفع روحانی مراد ہوگا۔ مرزائی تحریف کا یہ دعویٰ کہ بائیبل کی رو سے مصلوب ملعون ہوتا ہے اس لیے ملعونیت کی نفی اور مرتبہ کی بلندی میں مقابلہ صحیح ہوا۔ یہ بھی جھوٹ اور غلط ہے۔ بائیبل میں صاف لکھا ہے کہ جو کسی جرم سے مصلوب ہو وہ ملعون ہے نہ وہ مصلوب جو ناحق سولی دیا گیا ہو بلکہ وہ تو شہید ہوگا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ روحانی رفع اللہ نے ہر نبی کو عطا کیا ہے خصوصاً خاتم الانبیاء کو سب سے بڑھ کر روحانی رفع عطا ہوئی۔ تو اگر یہی معنی مراد ہوتا اور رفع جسمانی آسمانی مراد نہ ہوتا، تو بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ کے الفاظ ہر نبی کے حق میں مذکور ہوتے خصوصاً خاتم الانبیاء علیہ السلام کے حق میں تو حضرت مسیحؑ سے رفع کی خصوصیت باقی نہ رہتی خصوصیت صاف بتلا رہی ہے کہ یہ رفع جسمانی جو صرف حضرت مسیحؑ سے خاص ہے یا جس کو رفع جسمانی ہو چکا ہے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ اس رفع کے بعد قرآن میں وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا

کے الفاظ آئے ہیں جو اسی انداز میں کسی اور نبی کے بارے میں نہیں آئے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رفع جسمانی مراد ہے جس میں قدرت و قوت کا بھی ظہور ہے جس پر لفظ عزیز دلالت کرتا ہے اور حکمت کا بھی ظہور ہے جس پر لفظ حکیما دلالت کرتا ہے جس کو ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔

دوسرا امر جو آیت مذکورہ سے معلوم ہوتا ہے وہ ہے وَاِنْ مِّنْ اَہْلِ الْکِتَابِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِہٖ قَبْلَ مَوْتِہٖ جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اہلِ کتاب کا کوئی فرد نہ ہوگا مگر حضرت عیسٰی علیہ السلام پر ایمان لائیں گے حضرت عیسٰی کی موت سے پہلے۔ بِہٖ اور مَوْتِہٖ دونوں ضمیروں کا مرجع حضرت عیسٰی علیہ السلام ہے لَیُؤْمِنَنَّ کا لفظ جس میں نون تاکید ثقیلہ ہے جو مضارع کو مستقبل سے مختص کرتا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے مضمون کا تعلق نزول قرآن کے مابعد زمانے سے ہے اور ایسے زمانے سے ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کو اہلِ کتاب سے زمینی تعلق قائم ہو جو نزول مسیح کا زمانہ ہے جس سے مسیح کا نزول ثابت ہوا اور بل رفعہ اللہ سے صعود ثابت ہوتا ہے تو پوری آیت رفع و نزول دونوں پر مشتمل ہے یہی وجہ ہے کہ صحیحین کی حدیث بروایت ابی ہریرۃ نزول مسیح علیہ السلام کی حدیث مرفوع کے بعد ابوہریرۃ فرماتے ہیں۔ فاقرؤا ان شئتم وَاِنْ مِّنْ اَہْلِ الْکِتَابِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِہٖ جس میں یہ بتلانا مقصود ہے کہ نزولِ مسیح من السماء کے بعد اہل کتاب ان پر ایمان لائیں گے۔ یہ مسئلہ خالص نقلی ہے، عقل سے معلوم نہیں ہو سکتا اس لیے ابوہریرۃ کا موقوف اس میں مرفوع کے حکم میں ہے یعنی حضور علیہ السلام سے ابوہریرۃ نے ضرور سن لیا ہوگا کہ تمام کتابیوں کا حضرت علیہ السلام پر ایمان لانا ان کے آخر زمانے میں نازل ہونے اور تشریف لانے کے بعد ضرور ہوگا۔ باقی مَوْتِہٖ کی ضمیر کتابی کو لوٹانا صحیح نہیں ہے تو انتشار ضمائر شان بلاغت کے خلاف ہے دوم مَوْتِہٖ کی قید لغو ہو کر شان بلاغت کے خلاف ہوگی کیونکہ معنی یہ ہوگا کہ ہر کتابی اپنے مرنے سے پہلے حضرت عیسٰی علیہ السلام پر ایمان لائے

گا حالانکہ ایمان تو مرنے سے پہلے لایا جاتا ہے جیسے نماز روزہ کو مرنے سے پہلے ادا کیا جاتا ہے۔ تو جو چیز عقل سے معلوم ہو اس کو بطور قید لانا کہ وہ مرنے سے پہلے ایمان لائیں گے ایسا ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ میں نے روٹی کھائی مرنے سے پہلے، پانی پیا مرنے سے پہلے اور ظاہر ہے کہ یہ غیر بلیغ کلام ہے۔ اگر یہ توجیہ کی جائے کہ حالتِ نزع میں ایمان لائیں گے تو یہ ایمان غیر معتبر ہے ورنہ فرعون بھی مومن قرار پائے گا تو ایسے غیر معتبر ایمان کا ذکر ہی عبث ہے اس کے علاوہ نزع کی حالت میں تو ہر کافر اپنے نبی پر ایمان لاتا ہے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اس امر کی تخصیص نہیں رہی۔

۲۔ وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ ۚ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝ وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ (الزخرف آیۃ ۶۱، ۶۲)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کی نشانی ہے قیامت میں شک نہ کرو اور میری پیروی کرو یہی سیدھی راہ ہے شیطان تم کو اس بات کے ماننے سے نہ روکے۔ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام کو قیامت کی علامت دو وجہ سے ٹھہرایا گیا۔ ایک ان کی بلا باپ پیدائش جو مردوں کو دوبارہ زندہ کرنے کی دلیل ہے۔ دوم قیامت کے قریب ان کا آسمان سے نزول، جو قربِ قیامت کی نشانی ہے۔ سیاق و سباق کے مطابق اِنَّهٗ کی ضمیر کا مرجع عیسیٰ علیہ السلام ہے۔ اور اس کے سوا جو بھی رائے ہو وہ ضعیف ہے۔ ابن ماجہ صفحہ ۳۰۹ باب فتنۃ الدجال میں حدیث اسراء کے تحت حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قیامت کا سوال ہوا آپ نے فرمایا کہ اس کے واقع ہونے کا وقت تو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جب دجال کا ذکر ہوا تو حضرت عیسیٰ نے فرمایا میں نازل ہوں گا اور اس کو قتل کروں گا۔ اس آیت کی تفسیر میں ابن جریر نے آسمان سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول قیامت سے پہلے ابن عباس ابی مالک، عوف، مجاہد، قتادہ، سدی ضحاک و ابن زید کی روایات سے نقل کیا ہے جو آپ

کے نزول کی دلیل ہے اور آیت مذکورہ میں اسی نزول کے پیش نظر حضرت عیسیٰ کو قیامت
کی علامت قرار دیا گیا ہے یہی صحیح معنی ہے۔ اگر بغیر باپ کی پیدائش کی علامت ہوتی تو اس
اطلاق کے زیادہ حق دار حضرت آدم تھے جن کی پیدائش ماں اور باپ دونوں کے بغیر ہوئی
لیکن قرآن میں علم للساعۃ کا اطلاق اُن پر نہیں آیا معلوم ہوا کہ مراد اہل علامت قیامت
کا حضرت عیسیٰ کا آسمان سے قرب قیامت میں نزول ہے اور جو اس عقیدے سے روک
دے وہ شیطان ہے۔ فَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطَانُ تم کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے
آسمان سے نازل ہونے کے عقیدے سے شیطان روک نہ دے۔ یعنی اس عقیدے سے
روکنے والا قرآن کے اس ارشاد کے مطابق شیطان ہے۔

۵۔ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ؕ	(اس وقت کو یاد کرو) جبکہ فرشتوں نے کہا کہ اے مریمؑ بے شک اللہ تم کو بشارت دیتے ہیں ایک کلمہ کی جو منجانب اللہ ہوگا اس کا نام مسیح عیسیٰؑ بن مریمؑ ہوگا باآبرو ہوں گے دنیا میں اور آخرت میں اور منجملہ مقربین کے ہونگے

(آل عمران آیۃ: ۴۵)

یہاں عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں اُن کا مقربین سے ہونا بیان ہوا ہے۔ دوسری
جگہ اہل جنت کے حق میں سورۃ واقعہ میں بیان ہوا ہے۔ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ
فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ تیسری جگہ ملائکہ کے حق میں آیا ہے۔ لن یستنکف المسیح
ان یکون عبد اللہ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ مسیح کو اللہ کے بندہ ہونے سے عار نہیں اور
نہ مقرب ملائکہ کو عار ہے۔ ان تینوں جگہ میں قرب سے مراد قرب جسمی و حسی و سماوی مراد
ہے یہی وجہ ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں امام رازی نے تفسیر کبیر اور ابوالسعود نے اپنی
تفسیر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان پر جسم کے ساتھ اٹھایا جانا ذکر کیا ہے اور

مدارک، خازن، سراج المنیر اور کشاف میں ہے فَحَظُوظُهُ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقربین میں سے ہونا، ان کو آسمان پر اٹھانا اور ملائکہ کی صحبت اختیار کرنا اور پھر باقی ماندہ امور کی تکمیل کے لیے ان کا زمین پر نزول فرمانا مثلاً نکاح، حج، جہاد کرنا اور مسیحی اقوام کے فتنوں کو مٹانا۔

حیات و نزول مسیح حدیث کی روشنی میں

۱۔ بخاری میں ابو ہریرۃ نے حضور علیہ السلام سے جو حدیث نقل کی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا، قسم ہے خدا کی کہ عیسیٰ اُوپر سے تم میں نازل ہوگا۔ حضرت مریم کا فرزند جو حاکم ہوگا انصاف والا، صلیبی قوت توڑ دے گا اور خنزیر کے قتل کا حکم دے گا اور تمام لوگوں کے مسلمان ہو جانے سے جہاد کی ضرورت نہ رہے گی اور لوگوں کو اس قدر مال دے گا کہ کوئی قبول کرنے والا نہ ہوگا اور عبادت کی محبت اس قدر بڑھ جائے گی کہ لوگوں کو ایک سجدہ تمام دنیا کی دولت سے بہتر نظر آئے گا۔ پھر ابو ہریرۃ نے اس کی تصدیق کے لیے اس آیت کی طرف توجہ دلائی جس کا معنی یہ ہے کہ اس وقت کوئی کتابی نہ ہوگا مگر ایمان لائے گا عیسیٰ علیہ السلام پر۔ (بقول مرزا صاحب قرآن کے بعد اصح کتاب بخاری کی حدیث ہے)

۲۔ حدیث دوم یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے اور عیسیٰ کے درمیان نبی نہیں اور وہ اُتریں گے جب اس کو دیکھو تو پہچان لو۔ وہ قامت کے درمیانے ہیں سرخ و سفید ہیں دو زرد کپڑوں میں اُتریں گے۔ سر کے بال اس کے ایسے معلوم ہوں گے کہ گویا اس سے پانی ٹپکتا ہے اگرچہ اس کو پانی نہیں پہنچا ہوگا تو اسلام پر لوگوں سے جہاد کریں گے۔ صلیبی قوت توڑ دیں گے خنزیر کے قتل کا حکم دیں گے جزیہ موقوف کریں گے۔ اس کے وقت اسلام کے سوا تمام ادیان کا خاتمہ ہوگا دجال کو قتل کریں گے

زمین میں چالیس برس رہیں گے پھر وفات پائیں گے اور مسلمان اس پر نماز جنازہ پڑھیں گے۔ (ابوداؤد عن ابو ہریرۃ مرفوعاً ص۲۳۸)

۳۔ مشکوٰۃ باب نزول عیسیٰ میں عبداللہ بن عمرو نے حضور سے نقل کیا ہے کہ ابن مریم زمین پر اتریں گے شادی کریں گے اور اولاد پیدا ہوگی اور ٹھہریں گے زمین پر پینتالیس برس پھر فوت ہوں گے اور دفن ہوں گے میرے مقبرہ میں تو قیامت میں اٹھیں گے ہم اور عیسیٰ ابن مریم ایک مقبرہ سے جو ابوبکر و عمر کے درمیان ہوں گے۔

۴۔ صحیح مسلم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰ دمشق کے شرق میں اسفید منارہ پر اتریں گے دو کپڑوں میں درمیان دو فرشتوں کے دونوں ہتھیلی فرشتوں پر رکھے ہوئے ہوں گے دجال کو باب لُدّ پر پائیں گے تو اس کو قتل کریں گے۔

آیات حیات مسیح علیہ السلام کثیر التعداد ہیں اور احادیث تو حدِ تواتر کو پہنچی ہیں جو ۲۹ صحابہ سے منقول ہیں لیکن ہم نے بغرضِ اختصار پانچ آیات اور صرف چار احادیث پر اکتفا کیا ان احادیث میں حضور علیہ السلام نے تحفظِ ایمان اور گمراہی سے بچانے کے لیے حضرت مسیح کی جو علامات ذکر ہیں وہی کافی شافی ہیں اور جو گمراہ ہیں کہ استعارات اور مجازات سے وہ پوری تاریخ اور ایک دنیا کو بدلا سکتے ہیں اُن کے لیے قرآن و احادیث کا دفتر بھی بے کار ہے۔ ان چار احادیث سے حضرت مسیح موعود کی معرفت کی جو واضح علامات ہیں وہ نمبروار حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ مسیح موعود کا باپ نہ ہوگا اس لیے عام ضابطہ کے خلاف وہ اپنی والدہ مریم سے منسوب ہوگا لیکن مرزا غلام احمد کا باپ تھا مرزا غلام مرتضیٰ تھا اور اس کی والدہ کا نام ممتاز بی بی تھا اور وہ باپ سے منسوب تھا نہ کہ ماں سے

۲۔ وہ حاکم ہوگا لیکن مرزا غلام تھا اور انگریزی حکومت کا غلام تھا۔

۳۔ عادل ہوگا۔ عدل اللہ کے قانون چلانے کا نام ہے۔ مرزا کے وقت شرعی قانون بند تھا

اور انگریز کا قانون خود اُس پر اور اس کے مریدوں پر بھی نافذ تھا۔

۴۔ صلیبی قوت کو توڑ دے گا۔ مرزا کے وقت میں صلیبی قوت کو اس قدر غلبہ حاصل ہوا کہ اس سے پہلے نہ تھا۔ خود اُن کا باپ اُن کے اقرار کے مطابق پچاس گھوڑوں کے سواروں کو مہیا کر کے تحریکِ آزادی ۱۸۵۷ء میں صلیبی قوت کو ہندوستان پر مسلط کرنے کے لیے لڑا اور خود مرزا نے تحفۂ قیصریہ میں اپنے آنے کا مقصد یہ ظاہر کیا کہ میں انگریز کی صلیبی حکومت کے لیے ایک ایسی فوج تیار کروں جو انگریز کی حکومت کی وفادار ہو۔

۵۔ اس کے وقت میں خنزیر خوری کا خاتمہ ہوگا لیکن مرزا کے وقت میں اس میں اضافہ ہوا۔

۶۔ وہ لوگوں پر اس قدر مال برسائے گا کہ کوئی قبول کرنے والا نہ ہوگا۔ مرزا نے مال نہیں دیا بلکہ لینا شروع کیا۔ چندہ عام اور چندہ بہشتی مقبرہ کو شرطِ ایمان قرار دیا۔

۷۔ عبادت کا ذوق اتنا بڑھے گا کہ ایک سجدہ کی قیمت لوگوں کی نگاہوں میں ساری دنیا سے زائد ہوگی لیکن مرزا کے وقت میں نصاریٰ نے مسلمانوں کو مرتد بنانا شروع کیا اور لاکھوں کو مرتد کیا۔

۸۔ وہ آسمان سے زمین پر اُتریں گے لیکن مرزا زمین ہی میں پیدا ہوئے اور زمین ہی پر رہے۔

۹۔ فرشتوں پر ہاتھ رکھے ہوئے ہوں گے۔ لیکن مرزا کو کسی فرشتہ کا دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوا۔

۱۰۔ دمشق کے سفید منارہ پر نزول فرمائیں گے۔ لیکن مرزا کو عرب سرزمین کی زیارت بھی کبھی نصیب نہیں ہوئی۔

۱۱۔ باب لُد پر یہودی دجال کو قتل کریں گے۔ لیکن مرزا کو نہ لُد کا دیکھنا نصیب ہوا، اور نہ دجال کا۔ البتہ اس کی روحانی اولاد نے دجال کی قوم یہود سے تل ابیب میں تعلق پیدا کیا جبکہ تمام عالم اسلام کا اُن سے تعلق منقطع ہو چکا ہے۔ شاید کہ ظہورِ دجال کے وقت امداد کے

کے لیے حاضر رہیں۔

۱۲۔ اسلام کے سوا کوئی دین باقی نہ رہے گا۔ لیکن سب باطل ادیان مرزا کے وقت باقی رہے بلکہ اور نئے باطل ادیان بھی خلافِ اسلام پیدا ہوئے جن میں خود ایک دینِ مرزائیت ہے جو وحدت اسلامی کے برخلاف ایٹم بم ہے۔

۱۳۔ حج کریں گے۔ مرزا کو موت تک حج نصیب نہ ہوا۔

۱۴۔ وہ شادی کریں گے اور اولاد ہو گی یعنی نزول سے قبل نہ اس نے شادی کی ہو گی اور نہ اولاد ہو گی۔ لیکن مرزا کی شادی اور اولاد دعویٰ سے قبل موجود تھی۔

۱۵۔ جہاد کریں گے اور جزیہ موقوف کریں گے۔ مرزا نے جہاد کرنے کی بجائے خود جہاد کو حرام ٹھہرا کر نصاریٰ کے استعمار کے لیے راہ صاف کیا۔ جزیہ کا تو سوال ہی نہیں رہا۔

۱۶۔ باشندگان زمین کا ایک ہی دین یعنی اسلام ہو گا۔ اس لیے مختلف مذاہب کی لڑائیاں موقوف ہوں گی۔ لیکن مرزا کے وقت میں مختلف مذاہب نے مسلمانوں پر ہندوستان، ترکی، فلسطین شمالی افریقہ میں جو مظالم کئے اُن کی تاریخ میں نظیر نہیں۔ یہ سب مرزا کی برکت تھی۔

۱۷۔ امن قائم ہو گا اور جنگ ختم ہو گی لیکن مرزا کے وقت میں اور اس کے بعد امن کا نام و نشان مٹ گیا اور جنگ کے لیے وہ مہلک اوزار تیار کئے گئے کہ مرزا اور اس کے بعد کی ایک جنگ کی تباہی سابق زمانے کی سینکڑوں جنگوں کی تباہی سے زیادہ ہے۔

ان علامات کے لحاظ سے مرزا کی شخصیت ضدِ مسیح موعود ہے۔ باقی رہا یہ مسئلہ کہ مجازات و استعارات کی مشین سے پوری تاریخ بھی بدلائی جاسکتی ہے جس کی نہ قادیان میں کبھی کمی رہی نہ ربوہ میں۔ تو ایسی صورت میں تمام قرآن و حدیث بلکہ پوری تاریخ کو بازیچۂ اطفال بنایا جاسکتا ہے اور ایسا کرنے سے یہ خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ پھر قادیانی و مرزائی تاویلات کے آگے ہر چیز کی حقیقت بدلائی جاسکتی ہے اور الفاظ اور تعبیرات سے کسی مقصد کا تعین ممکن نہیں بلکہ مرزائیوں کے لیے الفاظ ربڑ کا ایک ایسا تسمہ ہے کہ جہاں تک چاہو اس کو پھیلا سکتے

ہو اور ایسی صورت میں کہ نزولِ مسیح کی علامات اس کی ضد پر بھی چسپاں کیے جا سکتے ہیں۔ تو پھر ان علامات کا بیان بھی بے فائدہ رہا کیونکہ علامات سے مسیح کی شخصیت کا تعین مقصود تھا اور جب نہ نام سے تعین ممکن نہ والدہ کے نام سے نہ مکان سے نہ مقام نزول سے بلکہ ان تمام علامات کی ضد شخصیت کو بھی اس میں گھسیٹا جا سکتا ہے تو تمام نظام ہائے سلطنت کے دفتری الفاظ بھی تاویل سے لغو اور بے فائدہ ہو سکتے ہیں۔

شیخ اکبر اور حیات عیسٰی علیہ السلام

شیخ اکبر فتوحات مکیہ باب ۳۶۷ میں لکھتے ہیں

فِی حَدِیْثِ الْمِعْرَاجِ فَلَمَّا دَخَلَ بِجَسَدِہٖ فَاِنَّہٗ لَمْ یَمُتْ اِلَی الْآنَ بَلْ رَفَعَہُ اللّٰہُ اِلٰی ھٰذِہِ السَّمَآءِ وَاَسْکَنَہٗ بِھَا وَحَکَّمَہٗ فِیْھَا وَھُوَ شَیْخُنَا الَّذِیْ رَجَعْنَا عَلٰی یَدِہٖ وَلَہٗ بِنَا عِنَایَۃٌ عَظِیْمَۃٌ وَلَا یَغْفَلُ عَنَّا سَاعَۃً وَاَرْجُوْ اَنْ اُدْرِکَہٗ فِیْ نُزُوْلِہٖ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ تَعَالٰی۔

حدیث معراج میں ہے کہ وہ داخل ہوئے تو ان کو عیسٰی جسم کے ساتھ ملے کیونکہ وہ اب نہیں مرے بلکہ اللہ نے اس کو اس آسمان تک اٹھایا اور اس میں بسایا اور اس کا حکم اس میں چلتا رہا اور وہ ہمارے پہلے شیخ ہیں جن کے ہاتھ پر ہم نے خدا کی طرف رجوع کیا۔ ان کو ہم پر مہربانی ہے اور ہم سے وہ غفلت نہیں کرتے مجھے امید ہے کہ اگر اللہ نے چاہا تو میں ان کے زمین پر نازل ہونے کا زمانہ پالوں گا۔

حیاتِ مسیح تاریخی نقطہ نظر سے

حضور مسیح حضور علیہ السلام کے قریب تر پیغمبر ہیں اور تمام نصاریٰ اور مسلمان ان کی عظمت اور شخصیت کو مانتے ہیں۔ نصاریٰ نے بالخصوص ہزاروں سال کے آثار قدیمہ کو دریافت کیا لیکن نہ خود نصاریٰ اور نہ مؤرخوں کو یہ پتہ لگا کہ عیسٰی علیہ السلام مرنے سے بچ کر فلسطین سے طویل سفر کاٹ کر کشمیر آئے اور پھر وہیں فوت ہو کر محلہ خانیار میں دفن ہوئے

اور نہ ہندوستان اور کشمیر والوں کو پتہ لگا۔ صرف مرزا کو دعویٰ مسیحیت کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے نئی تاریخ بنانی پڑی۔ اگر اس طرح فرضی تاریخ گھڑنا درست ہو تو تمام گذشتہ انبیاء اور سلاطین کی تاریخیں ناقابلِ اعتبار قرار پائیں گی بلکہ پوری تاریخ ناقابلِ اعتبار بن جائے گی

حضرت عیسیٰؑ کی حیات و نزول کی حکمت آپ کی ذاتی حیثیت کے اعتبار سے

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نانا (عمران) جو زاہد اور امام تھے حضرت سلیمان علیہ السلام کی نسل سے تھے اور آپ کی بیوی حنّہ بنت فاقوذ حضرت داؤد علیہ السلام کی نسل سے تھی۔ جو بناء بر تحقیقی قول حضرت ذکریا علیہ السلام کی بیوی الیشاع کی بھانجی تھی گویا حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرت مریم علیہ السلام کے خالہ زاد بھائی تھے۔ حدیثِ معراج میں حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ علیہما السلام کو ابنا خالۃ یعنی خالہ زاد بھائی کہا گیا ہے وہ مجاز ہے کیونکہ عمران وحنّہ کی حضرت مریم علیہ السلام کے سوا اور کوئی اولاد نہ تھی۔ مریم کے معنی سریانی زبان میں خادم کے ہیں۔ حضرت مریم سے حضرت مسیح عیسیٰ علیہ السلام نفخۂ جبرائیل سے پیدا ہوئے۔ مسیح کے معنی مبارک ہے یا بمعنی سیاحت کرنے والے جس کا گھر نہ ہو۔ نفخۂ جبرائیلی جو گریبان مریم میں پھونکا گیا وہ کلمہ کُن تھا۔ اس درجے کلمہ کہلانے۔ اس بنیاد پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت مادری رشتہ سے انسانی ہے اور نفخۂ جبرئیلی کے اعتبار سے ملکی ہے۔ نفخۂ جبرئیلی پدری تعلق کے تام مقام تھا لہٰذا ذاتِ مسیح میں مادری اور پدری دونوں رشتوں کا جمع ہونا ضروری ہے۔ مادری رشتہ کے لحاظ سے زمین پر رہنا، زمینی خواہشات کھانا پینا، میلان صنفی کا موجود ہونا ضروری

تھا اور جبرائیلی اور ملکی رشتہ کے لحاظ سے ملکی خواص کھانے پینے وغیرہ خواہشات کا منقطع ہونا لازمی تھا۔ اس حکمت کی بنیاد پر آپ میں زمینی اور انسانی زندگی کے صفات بھی جمع کیے گئے اور ملکی زندگی سے آسمانی زندگی اور انسانی خواہشات سے استغنا۔ اور ملکی صفات آپ کو عطا کیے گئے۔ لہٰذا حضرت مسیح علیہ السلام کا طولِ حیات سماوی اور ضروریات انسانی سے منقطع ہونا آپ کی شخصیت کے ملکی پہلو کا عقلی تقاضا ہے اور جب دوبارہ زمین پر نزول فرمائیں گے تو زمینی خواص سے موصوف ہوں گے۔ اسی لیے حدیث نزولِ مسیح میں آیا ہے کہ یَتَزَوَّجُ وَیُولَدُ لَہٗ۔ کہ وہ شادی کریں گے اور ان کی اولاد بھی ہوگی۔ شیخ اکبر فتوحات باب میں لکھتے ہیں۔ نِصْفُہٗ بَشَرٌ وَّ نِصْفُہٗ مَلَکٌ یعنی حضرت مسیح علیہ السلام کا نصف بشر اور نصف ملک ہے آسمان پر ملکی خواص اور زمین پر انسانی خواص ہوں گے۔

ازالہ شبہہ

سطحی نگاہ والے شبہہ کرتے ہیں کہ اگر مسیح آسمان پر ہیں تو کھانا پینا کہاں سے ہے اس کا پہلا جواب تو اب گذرا کہ آسمانی زندگی ان کے ملکی طرز کی زندگی ہے جس میں وہ کھانے، پینے اور اس کے لوازمات سے بے نیاز ہیں۔ جس کے کچھ نظائر زمینی زندگی میں بھی موجود ہیں۔

۱۔ طبقات شافعیہ ج ۵ ص ۳۰ میں شیخ عزیز الدین فاروقی سے روایت ہے کہ انہوں نے عراق میں ایک آدمی دیکھا کہ وہ نہ کھاتا تھا نہ پیتا تھا۔

۲۔ امام ذہبی فرماتے ہیں کہ اندلس میں ایک عورت تھی۔ جو بیس سال سے دکھاتی اور نہ پیتی تھی۔ جس کا واقعہ مشہور ہے۔

۳۔ حاکم تاریخ نیشاپور میں عیسیٰ بن محمد الطہمانی سے نقل کرتے ہیں کہ رحمت نام ایک عورت کا شوہر شہید ہو چکا تھا تو اس نے شوہر کو خواب میں دیکھا کہ وہ جنت کا طعام کھاتا ہے تو اس نے اس میں سے ایک ٹکڑا اپنی بیوی کو دے دیا۔ جب وہ خواب سے بیدار ہوئی

بحوالہ مذکورہ طبقات دوسرا جواب یہ ہے کہ زمین کو آسمان سے ایسی نسبت ہے جیسے رائی کے دانہ کو پہاڑ سے۔ تو جب اس چھوٹی زمین پر اللہ تعالےٰ نے اربوں مخلوقات کے کھانے کا انتظام فرما دیا ہے تو کیا آسمان پر ایک فرد کی ضروریات کا انتظام کرنا اس کے لیے مشکل ہے۔؟ قطعاً نہیں۔

۲۔ حکمت نزول حضرت عیسیٰؑ بلحاظ ختم نبوۃ

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ○	جب لیا اللہ نے عہد نبیوں سے کہ جو کچھ میں نے دیا کتاب اور علم اور پھر آئے تمہارے پاس پیغمبر کہ سچا بتا دے تمہارے پاس والی کتاب کو تو اس رسول پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے۔ فرمایا کیا تم نے اقرار کیا اور اس شرط پر ہمارا عہد قبول کیا بولے ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا تو اب گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔

(آل عمران : ۸۱)

حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہؓ بن عباس کی تفسیر کے مطابق یہ عہد انبیاء علیہم السلام سے خاتم الانبیاء علیہ السلام کے بارہ میں لیا گیا گویا حضور کریمؐ نبی الامم اور نبی الانبیاء بھی ہیں۔ آیت مذکورہ میں انبیاء علیہم السلام نے خاتم الانبیاء کی نبوۃ کا اعتقاداً اور اقراراً تسلیم کیا اور نصرۃ بالواسطہ بھی انبیاء علیہم السلام نے حضور کی نبوت کی تصدیق کردی اور اپنی امتوں کو آپ کے نبی ہونے اور امداد دینے کی تاکید فرمائی جیسے موسیٰ علیہ

السلام نے تورات کی کتاب استثناء باب ۱۸، باب ۳۳، داؤد علیہ السلام نے زبور باب ۴۵،
حضرت سلیمان علیہ السلام نے غزل الغزلات، حضرت عیسٰی علیہ السلام نے انجیل
یوحنا باب ۱۹ آیت ۵ تا آیت ۱۵ میں اعلان کیا۔ اب ضرورت تھی کہ آپ کی نبی الانبیاء کا عملی
بالذات ظہور ہو جس کی ایک صورت حدیث معراج میں آپ کی امامتِ انبیاء علیہم السلام
کی شکل میں اور دوسری صورت یہ ہوئی کہ آپ سے قریب نبی حضرت عیسٰی علیہ
السلام کو آخری زمانہ تک زندہ رکھ کر نبی ہونے کے باوجود اُمتی کی پوزیشن میں خدمتِ
دینِ محمدی کے لیے آسمان سے نازل فرمانا طے کیا گیا تاکہ حضرت عیسٰی علیہ السلام جملہ
انبیاء علیہم السلام سابقین کی نمائندہ کے طور پر شرعِ محمدی کی خدمت و نصرت عملی
رنگ میں انجام دیں اور حضور کی نبی الانبیائی کے عہدہ کو نمایاں کر دیں۔ نبی الانبیائی کے
منصب کی عملی تکمیل آئندہ کسی نبی کے ذریعہ ممکن نہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے
بعد نبوت کا دروازہ بند تھا، اس لیے سابق انبیاء علیہم السلام میں سے ایک نبی
کو آخری وقت کی نصرتِ دینِ محمدی و اظہار شان نبی الانبیائی کے لیئے باقی رکھنا پڑا
جو حضور کریم کے بعد عطاء عہدہ نبوت کی بندش کی دلیل ہے یہی حکمت نزولِ عیسٰی
علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ختمِ نبوت کی حیثیت سے ہے۔

۴۔ حکمت نزولِ مسیحؑ بلحاظ فتنِ عالمی و اصلاحِ عمومی

اس سلسلے میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کے نزول کی حکمتیں حسبِ ذیل ہیں

۱۔ آپ کے نزول کا ایک مقصد دجالی فتنے کا استیصال اور قتلِ دجال ہے۔ دجال مدعی
الوہیت ہوگا اور آپ توحیدِ باری قائم کرنے اور غیر اللہ کی الوہیت کی طرف دعوت دینے
کے جرم میں اس کو قتل کریں گے جس سے خود آپ کی اُمت کی گمراہی جو خود حضرت
عیسٰی علیہ السلام کو الٰہ مانتی ہے خود حضرت عیسٰی علیہ السلام کے اس عملِ قتل دجال

سے باطل قرار پائے گی اور نصاریٰ کو ذہن نشین ہو جائے گا کہ خدا کے سوا کسی اور کو

اِلٰہ ماننا ایسا عقیدہ ہے جو موجب سزا قتل ہے۔

۲۔ یہود آپ کے قتل اور مصلوب ہونے کے مدعی تھے۔ جب آپ کے ہاتھوں دجال

یہودی اور اس کے ماننے والے یہود قتل کئے جائیں گے۔ تو یہ عملاً یہود کے اس جھوٹے

دعوٰی کی تردید اور سزا ہوگی۔

۳۔ آپ دجال میں اسی مناسبت ہے کہ آپ مسیح ہدایت ہیں اور مکان نہ رکھنے کی

وجہ سے سیاحت کرتے تھے اس لیے مسیح کہلانے اور دجال مسیح ضلالت ہے جو دائیں

آنکھ کے مسموح ہونے کی وجہ سے مسیح کہلاتا تھا تو آپ ہی کے ہاتھوں دجال مسموح العین کے قتل اور اس کے متبعین کی تباہی زیادہ موزوں تھی

۴۔ اس وقت تمدن جدید اور سائنسی ترقی نے عالمی تباہی کی جو صورت پیدا کی ہے اس

کو دیکھ کر عالم موجود کی اس تباہی اور خون ریزی اور عالمگیر فساد کی اصلاح اور ازالہ

مادی ذرائع سے ہونا ناممکن ہو گیا ہے۔ پوری دنیا مادیت پرستی کی وجہ سے جہنم کے

کنارہ پر کھڑی ہے۔ انسانی اخلاق کا تقریباً خاتمہ ہو چکا ہے۔ انسانی لباس میں اس

وقت حیوانیت اور حیوانی جذبات برسر عروج ہیں۔ اصلاح کی راہیں مادی ذرائع سے

کلیۃً مسدود ہو چکی ہیں۔ اس وقت کا مشرقی و مغربی بلاک یاجوج و ماجوج کی صورت

میں دنیا کی تخریب میں مصروف ہے۔ یاجوج و ماجوج کو عبرانی زبان میں غوغ ما

غوغ اور انگریزی میں گاگ میگاگ کہتے ہیں۔ ملاحظہ ہو عقیدۃ الاسلام صفحہ ۲۹۸

روس اور اسی طرح چین یاجوج ہے اور برطانیہ اور اسی طرح امریکہ وغیرہ ماجوج

ہے اور بعض کاکس میکاکس اور بعض چین ماچین سے تعبیر کرتے ہیں۔ ناسخ التواریخ

نے ہبوط آدم علیہ السلام سے تاریخ تعمیر سد ذی القرنین تک کی تاریخ ۳۴۹۰ سنہ ہوطی

لکھا ہے اور کبھی یاجوج ماجوج کا اطلاق مطلق کافر پر کیا جاتا ہے حدیث حشر میں ہے۔

مِنْ یَاجُوْجَ وَمَاجُوْجَ اَلْفٌ وَّ۔ یعنی دوزخ میں یاجوج ماجوج سے

مِنْکُمْ رَجُلٌ ہزار اور تم میں ایک ہوگا۔

یعنی کافروں سے ہزار اور تم سے ایک ہوگا۔ حافظ ابنِ حجرؒ اور قرطبیؒ نے اس کی تشریح کی ہے۔ أَيْ مِنْهُمْ وَمِمَّنْ كَانَ عَلَى الشِّرْكِ مِثْلَهُمْ وَرَجُلٌ مِنْكُمْ أَيْ مِنْ أَحْوَالِهِ وَمِمَّنْ كَانَ مِثْلَهُمْ ۔ گویا ہزار سے مطلق کافر اور منکم سے مطلق مؤمن مراد ہیں۔ سنہدرین جو کمار الیہود سے ہے اور اُن کے ہاں حدیث کا درجہ رکھتا ہے۔ جو خزائن الروم میں عبرانی خط میں موجود ہے نقل کیا ہے کہ عالم ۴۲۹۱ھ کے بعد یتیم ہو جائے گا اور اس کے بعد گوگ ماگوگ کی لڑائیاں ہوں گی، اور باقی ایام ماشیح کے ہوں گے۔ صاحب ناسخ نے ماشیح مبارک کو خاتم الانبیاء پر محمول کیا ہے۔ اور عبری کمار میں ماشیح کے بعد لکھا ہے کہ اس کے بعد عالم یتیم بلا راعی رہ جائے گا۔ یعنی نبوت ختم ہوگی بہرحال دورِ حاضر میں عالمی فساد مادیت انتہائی کی شکل میں متشکل ہو گئی ہے اس کا ازالہ اپنی ضد یعنی روحانیت انتہائی کے بغیر ناممکن ہے جس کے لیے قدرت کی طرف سے حضرت مسیح علیہ السّلام مقدر ہے کہ وہ رُوح القدس کی پھونک سے پیدا ہوئے یہ پہلی رُوحانیت ہوئی۔ وَأَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ کے تحت زمینی زندگی میں بھی آپ کی تقویت رُوح القدس سے کی گئی۔ یہ دوسری رُوحانی قوت ہوئی۔ آسمان پر روح القدس کے ذریعہ اُٹھائے گئے یہ تیسری تقویت روحانیت کی ہوئی۔ آپ کا نزول از روئے حدیث ایسی حالت میں ہوگا۔ وَاضِعًا كَفَّيْهِ عَلٰى أَجْنِحَةِ مَلَكَيْنِ ۔ کہ آپ کی دونوں ہتھیلیاں دو فرشتوں کے بازوؤں پر رکھی ہوئی ہوں گی جیسے مسلم کی حدیث میں نواس بن سمعان

سے آیا۔ یہ پانچویں علمی اور رُوحانی قوت ہوئی۔ ان تمام قوتوں کا اثر یہ ہوگا کہ آپ کا ایک دعائیہ جملہ کہ اے خدا ان مادی مفسد یاجوجی ماجوجی قوتوں کو ہلاک کر دے ایسا کام انجام دے گا کہ تمام مادہ پرست یاجوجی ماجوجی ہستیاں اپنی اپنی جگہ پر ہلاک ہوں گی اور بحکم جہاں پاک کے تحت تخریبی سائنس کے علمبرداروں کا خاتمہ ہوجائے گا اور پوری زمین ان کی لاشوں سے پُر اور بدبُودار ہو جائے گی۔ مسلم کی حدیث نواس بن سمعان میں آیا ہے کہ یاجوج ماجوج حضرت عیسٰی علیہ السلام کا اور ان کے متبعین کا بھی محاصرہ کریں گے۔ فَيَرْغَبُ اللهُ عِيْسٰى وَاَصْحَابَهُ فَيُرْسِلُ اللهُ عَلَيْهِمْ۔ حضرت عیسٰی اور ان کے ساتھی دعا کریں گے تو اللہ اُن پر گردن پکڑنے والی بیماری مسلط کر دے گا۔ فَيُصْبِحُوْنَ كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ تو ہوجائیں گے سب کے سب مردہ لاشوں کا ڈھیر کہ گویا ان سب کا مرنا ایک آدمی کا مرنا ہوگا۔ بالشت بھر زمین خالی نہ ہوگی جو اُن کی لاشوں کی بدبُو سے پُر نہ ہوئی ہوگی تو اللہ بختی اُونٹوں جتنے بڑے بڑے پرندے بھیجے گا جو اُن کی لاشوں کو اُٹھا کر کہیں اور جگہ پھینک دیں گے۔ سائنس نے جو موجودہ ایٹمی دور کو جنم دیا ہے اُس کے ازالے کی تدبیر مادی قوت سے ممکن نہیں۔ اگر کوئی صالح حکومت ان کے توڑ کے لیے کارخانے بنائے تاکہ ان کا مقابلہ کیا جائے تو یہ مفسد قوتیں اس قدر آگے نکل چکی ہیں کہ ان کی برابری مشکل ہے اور پھر سائنسی آلات حرب سے مسلح سلطنتیں مشرقی بلاک کی یا مغربی بلاک کی، سب تخریب عالم اور فساد اور خدا دشمنی پر متفق ہیں۔ فساد اس قدر زوردار ہے جس کی نظیر تاریخ بشری میں ناپید ہے۔

اس لیے صحیح مسلم میں عمران حصین کی حدیث میں اس دجالی فتنہ کے متعلق مذکور ہے۔

مَا بَيْنَ خَلْقِ آدَمَ اِلٰى قِيَامِ السَّاعَةِ اَمْرٌ اَكْبَرُ مِنَ الدَّجَّالِ ۔ پیدائش آدم سے قیامت تک کوئی فتنہ دجالی فتنہ سے بڑا نہیں۔

پانچویں حکمت

پانچویں حکمت یہ ہے کہ موجودہ دور کے عالمی فتنوں اور ایٹمی تباہیوں کے بانی مبانی یہود نصاریٰ ہیں۔ اشتراکیت کا بانی کارل مارکس یہودی ہے۔ ایٹم بم کا موجد شوپن ہاور یہودی ہے تہذیب جدید کے خدا فراموشانہ، فاسقانہ معاشرہ اور انسان کش سامراجیت کی بنیاد مسیحی طاقتوں نے قائم کی ہے اور دیگر مذاہب والوں کو مثلاً مسلمانوں کو بگاڑنے والی بھی عیسائی قومیں ہیں۔ اس لیے ضروری ہوا کہ ایک اسرائیلی پیغمبر جو مسیحی اقوام کا پیشوا ہے۔ انہی کے ہاتھوں ان کی اُمت کے پیدا کردہ فساد کا خاتمہ ہو۔

الغرض اُمت مسیح علیہ السلام نے مادی اور سائنسی ایٹمی ذرائع سے جو عالمی فساد برپا کیا ہے اور زمینی قوتیں اس کے مقابلہ سے عاجز ہیں اور اب بجز مذکورہ آسمانی تدبیر کے زمین کی اصلاح قطعاً ناممکن ہے اس لیے عقلاً بھی نزول مسیح علیہ السلام کی ضرورت ہے۔ جو خدا کی تدبیر نے ہزاروں سال پیشتر طے کر دیا ہے ذکر دجالی قوتوں کا وہ وہ کاسہ لیس شخص جو مسیحیت کی دکان جما کر دجالی قوتوں کا دستِ بازو بن جائے اور اسلام کے چودہ سو سال میں کمائے ہوئے مسلمانوں کو کافر کہہ کر سابق محنت کو بھی ختم کر دے۔

فائدہ

سدِ ذوالقرنین کے متعلق دنیا میں اس وقت بہت سد ہیں۔ ایک دیوار چین جو طویل و عریض ہے جس کو منگولی زبان میں انکو وہ اور ترکی زبان میں بوقرقہ کہتے ہیں۔

دوم بخارا اور ترمذ کے درمیان جس کو دربند کہتے ہیں یہ تیمور کے وقت میں موجود تھا۔

سوم داغستان کا سد۔ اس کا نام باب الابواب ہے اور دربند بھی کہتے ہیں۔ بستانی نے دائرۃ المعارف میں اس کی تفصیل بیان کی ہے۔

چہارم وہ سد جو کاکیشیا میں قفقاز کے پاس درہ داریال میں ہے۔ یاقوت نے

معجم البلدان میں لکھا ہے کہ وہ پگھلے ہوئے تانبے کا ہے اور باقی تین سد پتھر کے ہیں لہذا قرآنی تشریح کے مطابق سد ذوالقرنین سے یہی سد چہارم مراد ہے۔ ناسخ التواریخ میں اس کی تصریح کی گئی ہے۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ خروار نے کتاب المسالک میں لکھا ہے کہ عباسی خلیفہ واثق باللہ نے سدِ ذوالقرنین کی تحقیق کے لیے ماہرین کا ایک کمیشن بھیجا تو اس نے بھی اِس سد کو مطابق قرآن قرار دیا۔ اسی سد ذوالقرنین کو فارس میں درۂ آہنی اور ترکی زبان میں وامرکپو اور چینی زبان میں پھاگ کورائی ہے یعنی کور کا درہ۔ کور سے مراد گورش ہے۔ گورش سائرس یکخسرو کا نام ہے۔

ذوالقرنین

ذوالقرنین کے تین سفر قرآن میں ذکر ہیں۔ مغربی، مشرقی اور تیسرا سفر غالباً شمالی ہے۔

ذوالقرنین کون تھا؟ امام رازیؒ نے تفسیر کبیر سورۂ کہف میں لکھا ہے کہ مقدونیہ کا سکندر بن فیلقوس تھا جو ارسطو کا شاگرد تھا۔ امام رازیؒ نے ارسطو کے کافر ہونے کی تصریح کی ہے۔ بعضوں نے کیقباد کہا ہے اور بعضوں نے مغفور چین بتلایا ہے، بعضوں نے یمن کا بادشاہ ذونواس حمیری بتلایا ہے اور بعضوں نے سامی بادشاہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاصر تھا، اس کو ذوالقرنین قرار دیا۔ بعض اس کو مصعب بن عبداللہ قرار دیتے ہیں جیسے ابن عبدالبر نے لکھا ہے۔ بعض نے عبداللہ بن ضحاک قرار دیا ہے اور بعض نے سائرس جس کو گورش بھی کہتے ہیں، ذوالقرنین قرار دیا۔ یہ آخیر قول صحیح ہے۔ باقی اقوال صحیح نہیں ہے یہاں اور اقوال بھی ہیں لیکن وہ بھی صحیح نہیں۔ مصعب بن عبداللہ و عبداللہ بن ضحاک کی سند صحیح نہیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے تردید کی ہے اور معاصر حضرت ابراہیم علیہ السلام خواہ مصعب ہو یا عبداللہ بن ضحاک ہو ان کی معاصرۃ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے تاریخاً ثابت نہیں اور نہ تعمیر سد کا انتساب ان کو ثابت ہے۔ باقی سلاطین مؤمن نہ تھے۔ حالانکہ قرآن اُن کو کم از کم رجل صالح بتاتا ہے اور اُنکی طرف اس معین سد کی تعمیر کی نسبت کی صحت بھی ضروری قرار دیتا ہے

لہٰذا سائرس ذوالقرنین جو مؤمن صالح تھا جو ۵۵۹ قبل از مسیح میں گذرے ہیں ان کے تین اسفار بھی تاریخاً ثابت ہیں۔ سکندر نے قفقاز کا سفر نہیں کیا۔ دیگر مذکورہ افراد نے سفر کیا ہے۔ ذوالقرنین کا مغربی سفر ایشیائے کوچک کا تھا اور سورج کا غروب عین حمئۃ میں سمرنا کے سمندر کے پانی میں تھا جو سیاہ ہے۔ سائرس نے بابل فتح کر کے بنی اسرائیل کو نجات دی اور بیت المقدس کی تعمیر کی اور یسعیاہ علیہ السلام نے ایک سو ساٹھ سال قبل اس تعمیر بیت المقدس کی پیشین گوئی کی تھی۔ یرمیاہ نبی نے پیشین گوئی کی تھی کہ بابل میں ستر سال یہودی قید رہیں گے۔ پھر بیت المقدس آباد ہوگا۔ امام رازیؒ نے بھی کبیر میں تصریح کی ہے کہ سدّ کی تعمیر سائرس نے کی۔ ذوالقرنین یقیناً سائرس ہے۔ سائرس دانیال علیہ السلام کے دین کا پیرو تھا۔ یہی تحقیق تاریخ کے علاوہ صحیفہ یسعیا علیہ السلام باب : ۴۵ آیۃ ۱ تا ۴ ومکاشفہ دانیال باب ۸ آیۃ ۱ تا ۸، ذکریا کی کتاب باب ۶ آیت ۱۱ وعزرا باب آیت ۱ تا ۴ سے ماخوذ ہے۔ جو قدیم تاریخ کے اہم ترین ماخذ ہیں۔ ابراہیم زردشت بھی دانیال علیہ السلام کا شاگرد تھا۔ وہ موحد تھا اس کا استاد اعوذ باللہ وبسم اللہ سے شروع ہوتا ہے۔ ابن کثیر کی بھی یہی تحقیق ہے۔ کتبات اصطخر میں دارا کو بھی مؤمن اور دشمنِ مجوسیت قرار دیا گیا ہے۔ سائرس ذوالقرنین دارا سے پہلے ہو گذرے ہیں۔ یاجوج ماجوج کے متعلق اُن کے درازی قامت کے واقعات غلط ہیں۔ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں اور حافظ ابنِ حجر نے بخاری کے باب یاجوج ماجوج میں اس کی تردید کی ہے اسی طرح ترمذی کی روایت۔ ابی ہریرۃؓ کی روایت کہ وہ سدّ کھودتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ کل باقی کھودیں گے لیکن ان شاء اللہ کہنا بھول جاتے ہیں تو سدّ اُس طرح ہو جاتا ہے۔ جب وقت آئے گا تو انشاء اللہ کہہ دیں گے تو کھود کر آئیں گے یہ بھی ضعیف روایت ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ سے ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر جلد : ۳ صـ ۱۰۵ میں نقل کیا کہ یہ خلاف القرآن ہے۔ فَمَا اسْطَاعُوْا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ کہ یاجوج ماجوج نہ سدّ پر چڑھ سکتے ہیں اور

مَا اسۡطَاعُوۡۤا اَنۡ یَّظۡهَرُوۡهُ وَ مَا اسۡتَطَاعُوۡا لَهٗ نَقۡبًا ۔۔۔ نہ اس میں شگاف کر سکتے ہیں۔

(الکہف: ۹۷)

ابن کثیرؒ کہتے ہیں کہ یہ روایت حضرت ابو ہریرہؓ نے کعب الاحبار سے لی ہے۔ لوگوں نے غلطی سے مرفوع سمجھ لیا ہے۔ یاجوج ماجوج کا خروج جیسے عقیدۃ الاسلام میں ہے کہ ان کا خروج سد سے نہ ہوگا بلکہ بحیرہ کیسپین سے منگولیا تک کسی جگہ سے ہوگا۔ قرآن نے جہاں سد کا استحکام بیان کیا ہے تو اس کے توڑنے کو قیامت کی علامت قرار دیا ہے لیکن جہاں خروجِ یاجوج ماجوج کا ذکر کیا وہاں سد کا ذکر نہیں کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خروج سد کے راستے سے نہ ہوگا۔ حدیث متفق علیہ ویل للعرب قد اقترب من فتح ردم یاجوج وماجوج مثل ھذہ کو عمدۃ القاری جلد ۱۱ میں کرمانی سے منقول ہے کہ یہ استعارہ ہے شیوع فتن ہے کہ بند فتنے انگلی کے حلقے کے انداز پر کھل گئے۔ خود سد کا کھل جانا مراد نہیں۔ دیکھو عقیدۃ الاسلام ذوالقرنین کی تشریح میں مختلف اقوال ہیں لیکن اصطخر کے آثار قدیمہ سے ذوالقرنین کا جو مجسمہ برآمد ہوا ہے اس میں ذوالقرنین کی آہنی ٹوپی کے دائیں بائیں لوہے کے ابھرے ہوئے سینگ کی طرح لوہے کے سینگ نما خول بنے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ تسمیہ زیادہ درست ہے۔

تمت

کفار کے عذاب کا خلود

امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں خَتَمَ اللّٰهُ کی آیت کے تحت کفار کے دائمی عذاب پر اشکالات پیش کئے ہیں احقر بحمد اللہ اس اہم مسئلہ پر شبہ نقل کر کے جواب عرض کرے گا۔

پہلا شبہ کفار کے دوام عذاب پر بڑا اشکال یہ پیش کیا جاتا ہے کہ یہ خدائی انصاف کے خلاف ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دوام عذاب انصاف ہے ظلم نہیں۔ ظلم کا

مفہوم یہ ہے کہ دوسرے کی ملکیت میں تصرف کیا جائے اور کفار ملک خدا ہے۔ ان میں خدا کا تصرف اپنے ملک میں تصرف ہے غیر کے ملک میں تصرف نہیں۔

دوسرا شُبہہ دوسرا شُبہہ یہ پیش کیا جاتا ہے کہ دوام عذاب رحمتِ خداوندی کے خلاف ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مجرم کی سزا عین رحمت ہے اور جس حکومت میں مجرم کی سزا نہ ہو اس کو بالاتفاق رحمت کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔

تیسرا شُبہہ تیسرا شُبہہ یہ ہے کہ کفار کا جرم محدود ہے کہ انہوں نے جرم کا ارتکاب محدود وقت یعنی بلوغ سے وقتِ موت تک کیا ہے اور سزا لا محدود دی جاتی ہے کیونکہ ان کو ابدی دوزخ میں رکھا جاتا ہے۔ اس شُبہہ کے جوابات حسب ذیل ہیں۔

پہلا جواب یہ ہے کہ جرم اور سزا کے وقت کا مساوی ہونا ضروری نہیں۔ کیا نہیں دیکھتے کہ ڈاکو ایک گھنٹہ میں ڈاکہ ڈالتا ہے لیکن اس کو کئی سال قید و بند کی سزا دی جاتی ہے۔ نہ یہ کہ ایک گھنٹہ قید کی سزا۔ بلکہ جرم میں اس کی سنگینی کو دیکھا جاتا ہے اور کفر تمام جرائم سے سنگین تر جرم ہے اس لیے سزا بھی سنگین تر ہونی چاہیئے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ درحقیقت کفار کا جرم بھی لا محدود ہے۔ اگر ان کو موت نہ آتی اور وہ ہمیشہ زندہ رہتے تو بھی کفر نہ چھوڑتے۔ موت کی وجہ سے انہوں نے کفر نہیں چھوڑا بلکہ چھڑوایا گیا۔ جو ایک جبری حالت ہے۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ کفار نے کفر کی وجہ سے اللہ کے انعامات اور کمالات غیر محدودہ کا انکار کیا اور ان سے بغاوت کی جس کی سزا لازمی طور لا محدود ہونا ضروری ہے۔

چوتھا جواب یہ ہے کہ کفار کو سزا بطور تاثیر طبعی کے ہے۔ مثلاً مرض سرطان کے جراثیم ایسے ہیں کہ ان کے آثار و نتائج لازوال ہوتے ہیں۔ اور جب تک آدمی زندہ رہتا ہے تو اُن کی تکلیفات سے چھٹکارا نہیں ہو سکتا۔ کفر کے جراثیم کو بھی مرض سرطان کے جراثیم کی طرح سمجھو کہ اس کے طبعی نتائج یعنی حرارات نار دائمی اور زندگی کے ساتھ لازم فرق اتنا ہے

دنیوی زندگی اور آخروی زندگی میں یہ فرق ہے کہ دنیوی زندگی فانی ہے اور ختم ہو جاتی ہے اور آخرت کی زندگی ابدی ہے کہ وہاں موت نہیں۔ اس وجہ سے سرطان کے جراثیم کے نتائج موت سے ختم ہو جاتے ہیں، کہ زندگی ختم ہو جاتی ہے لیکن آخرت میں موت نہ ہونے کی وجہ سے زندگی کو دوام ہے تو جراثیم کفر کے طبعی آلام اور تکلیفات کو بھی دوام ہے۔

پانچواں جواب یہ ہے کہ ہر تکلیف کے لیے ایک سبب ہوتا ہے جب وہ زائل ہو جاتا ہے تو تکلیف بھی دور ہو جاتی ہے۔ اور اگر سبب باقی ہو تو تکلیف بھی باقی رہتی ہے۔ مثلاً اگر گردے میں پتھری ہو جائے تو جب تک پتھری رہے گی تو اس کی تکلیف بھی رہے گی اور اگر پتھری دور ہو جائے تو تکلیف بھی دور ہو جائے گی لیکن کفر کا زہر روح کے ساتھ ایسا پیوست ہو گیا ہے جیسے ریل گاڑی کے شیشہ کے اندر نارتھ ویسٹرن ریلوے کے حروف اندر لکھے ہوئے ہوتے ہیں جو اس شیشے سے الگ نہیں ہو سکتے تا وقتیکہ شیشہ کا وجود ختم نہ ہو جائے اور کفار کا کفر جو اس سزا کا سبب ہے جب تک دور نہ ہو گا وہ مذکورہ شیشہ کے اندر حروف کی طرح پیوست ہو چکا ہے۔ قرآن میں کفر کے لزوم کو بیان کیا گیا ہے۔ وَلَوْ رُدُّوا لَعَادُوا لِمَا نُهُوا عَنْهُ[1] کہ کفار کو واپس دنیا میں لایا جائے تو بھی کفر ساتھ رہے گا اور اسی کی طرف لوٹیں گے۔ اس لیے کفار کا دوام عذاب سبب عذاب یعنی کفر کی وجہ سے ہے

---

[1] سورۃ انعام

باب ہفتم

دورِ حاضر کے افکار کی بنیادی غلطی

ہمیں اس پر غور کرنا چاہیئے کہ کیا دورِ حاضر کے نظریات میں غلطیاں موجود بھی ہیں یا نہیں؟ اس کے لیے ہمیں دورِ حاضر کے نظریات کو تقسیم کرنا پڑے گا۔

۱۔ خالص مادی نظریات

۲۔ انسان سے متعلق نظریات (خواہ تمدنیات ہوں یا معاشیات و عمرانیات)

۳۔ ماوراء المادیات۔

ان تینوں کے ذرائع علم و احکام و خصوصیات میں بڑا فرق ہے۔ دورِ حاضر کے عقلیت نے تینوں پر بحث کی ہے اور تینوں کے متعلق اس نے نظریات قائم کیے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ان تینوں کا ایک بہت بڑی حد تک انسانی زندگی سے تعلق ہے اور تینوں پر عقل نے اس بنا پر غور کیا کہ وہ ایسے حقائق کو پا سکے۔ جن کی وجہ سے انسانی زندگی اپنے حقیقی مقصد میں کامیاب ہو۔ کیوں کہ عقل کی فکری حرکت کا آغاز اس مقصد کے لیے ہوتا ہے۔

اب انیسویں صدی سے لے کر اب تک تقریباً ڈیڑھ سو سال سے زیادہ کی عقلی کاوشوں سے اگر انسان نے اپنے مقصدِ زندگی کو پا لیا ہے تو بے شک یہ فکری و فلسفی اور سائنسی کوششیں قابلِ تحسین ہیں اور اس کی عقل و فکر کی راہ میں سمت پر جانے اور منزلِ مقصود کو پانے کی صحیح راہ بھی اور اگر زندگی کا وہ مقصد حاصل نہیں ہوا تو یقیناً ہم کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ انسانی عقلیت کی راہ صحیح نہ تھی، بلکہ اس میں غلطی واقع ہوتی ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ہم اس مقصد کو متعین کریں جس کے لیے عقلی حرکات کا آغاز ہوا اور پھر عقلی قوتوں نے ان عقلی نظریات کی موافقت کی۔

عقلی و عملی کاوشوں کے مقصد کا تعین

انسانی فکر و عمل کی تمام حرکات کا جو مقصد ہے وہ چین اور اطمینان ہے نہ سونے اور چاندی کا ڈھیر (انبار) یا قیمتی موٹریں اور نہ بڑی بڑی بلڈنگیں اور سامان تعیش یا حکومت کا کوئی بڑا عہدہ جس کی تصدیق اس امر سے کی جا سکتی ہے۔

بے چینی

کہ اکثر اوقات یہ سب چیزیں حاصل ہوتی ہیں لیکن چین اور اطمینان کا نام نہیں ہوتا۔ اگر یقین نہ آئے تو صدر جانسن اور اندرا گاندھی سے پوچھ لو کہ کیا تم کو ایک معمولی غریب آدمی کے برابر بھی چین حاصل ہے؟ لیکن ان دونوں کی بے چینی عام غریب اور معمولی اشخاص سے بہت زیادہ ہے اسی طرح یورپ اور امریکہ کے ارب پتیوں سے پوچھو کہ تم کو چین حاصل ہے؟ تو جواب ہوگا کہ نہیں۔

آپ نے اخبارات میں پڑھا ہوگا کہ یورپ اور امریکہ کے بہت کروڑ پتی اور ارب پتی ایسے تھے جنہوں نے دماغ کی بے چینی کی تاب نہ لا کر خودکشی کر ڈالی اور یہ تحریر چھوڑ کر مر گئے:

"ہم اس بے چین دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں"

اب اگر دور جدید کے عقل مندوں کی عقلی و عملی تگ و دو کی راہ صحیح ہوتی تو چین حاصل ہوتا۔ لیکن اس کے برخلاف جو بے چینی انسان کو دورِ حاضر میں نصیب ہوئی۔ اس کی نظیر انسان کی پوری تاریخ میں نہیں مل سکتی اور اس میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ خاص کر اس ایٹمی دور ہائیڈروجنی خطرہ نے تو بے چینی کو عالمگیر شکل دے دی ہے تو کیا یہی وہ منزل مقصود تھی جن کے لیے ڈیڑھ دو صدی کی یہ کوششیں عمل میں لائی گئی تھیں۔

انقلاب

مقصد زندگی کی نایابی کی بڑی دلیل لفظِ "انقلاب" ہے جس کے معنی پلٹنے کے ہیں۔ اس دور میں جو نظام زندگی، جو نظام مملکت جو نظام معیشت فکری کوشش کے بعد قائم ہو جاتا ہے تو اس کے بعد نعرہ انقلاب بلند ہو جاتا ہے جس کا

واضح مقصد یہ ہے کہ عوام اور نعرۂ انقلاب لگانے والے موجودہ نظام سے مطمئن نہیں، وہ اس کو پلٹ دینا چاہتے ہیں گویا وہ اپنے نعرہ انقلاب کے ذریعہ اپنی بے چینی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اقبال مرحوم خدا سے مکالمہ کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے جواب میں کہ کیا یہ جہانِ جدید تم کو موافق بنے؟ کہتا ہے کہ۔

"میں نے خدا سے کہا کہ موافق نہیں۔ ارشاد ہوا کہ اس کو توڑ ڈالو"

گفت کہ جہانِ ما آیا بتو مے سازد

گفتم کہ نمے سازد، گفتند کہ برہم زن

بے چینی کی مثال

اس عالمی بے چینی سے یہ معلوم ہوا کہ دورِ حاضر کی فکری اور عملی کوششوں نے زندگی کو مقصود سے ہمکنار نہیں کیا اور تا ہنوز زندگی نے اپنے طبعی و فطری مرکز کو نہیں پایا۔

اضطراب، انقلاب اور بے چینی انسان کی باطنی حرکت کا نام ہے اور چین اور اطمینان اس کے اصلی سکون کا نام ہے اور وہی اصل مقصدِ حیات اور راحت کنندہ ہے۔ مثلاً پانی جب بلندی پر ہو تو وہ متحرک اور مضطرب رہتا ہے اور اگر اس کو اس بلندی سے کسی دوسری بلندی کی طرف منتقل کیا جائے تو بھی اس کا اضطراب اور تحرک ختم نہ ہوگا تاوقتیکہ وہ کسی نشیب جگہ میں پہنچ کر اپنے مرکز فطری وطبعی کو نہ پالے۔ یہی حاصل اس وقت ہماری زندگی کا ہے کہ عقل اس کو کبھی ایک جہاں اور کبھی دوسرے جہان کی طرف منتقل کرتی ہے۔ کبھی تیسری کی طرف۔ لیکن اس کے اضطراب میں فرق نہیں آتا، تاوقتیکہ زندگی اپنے فطری مرکز کو نہ پالے۔

اس بے چینی کا اصل سبب خالق کائنات سے انسان کے تعلق کا منقطع ہونا ہے اور مادہ اور مادیات ہی سے وابستہ ہونا ہے مادہ متغیر ہے اور روح کے لیے وہ غیر فطری مرکز ہے اور خالقِ کائنات روحِ انسانی کا فطری مرکز ہے۔ رُوح جب فطری مرکز سے ہٹادی گئی اور غیر فطری مرکز سے اس کو جوڑ دیا گیا تو اس کے حصے میں دوامی اضطراب اور بے چینی کا ہونا ایک

لازمی بات ہے اور مادی ترقی چاہے کس قدر بلند ہو، لیکن اضطراب دور نہ ہو گا۔

اسی حقیقت کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ — خوب سن لو کہ صرف اللہ کی یاد اور تعلق سے اسان کو چین اور اطمینان نصیب ہو سکتا ہے۔

بقول اکبر ؎

دو ہی چیزیں ہیں بس محافظ دل کی
عقبیٰ کا تصور اور اللہ کی یاد
دنیا دل کی ہوس جانے دو
گلبیں ہو اگر تو خار و خس جانے دو
مالک کے بغیر گھر کی رونق نہیں کچھ
اللہ کو اپنے دل میں بس جانے دو

لیکن تہذیبِ جدید کا یہ حال ہے کہ ؎

بھولتا جاتا ہے یورپ آسمانی باپ کو
بس خدا سمجھا ہے اس نے برق کو اور بھاپ کو
طریقِ مغربی کی کیا یہی روشن ضمیری ہے
خدا کو بھول جانا اور محو ماسوا ہونا

مادیات

مادیات کی بنیاد مادہ ہے۔ اس لیے جب تک مادہ معلوم نہ ہو تو مادیات کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ مادہ کے متعلق ہزاروں سال سے فلاسفہ کی ذہنی اور فکری کاوشیں جاری ہیں، لیکن ان سب میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔

مادہ قدیم فلاسفہ کی نظر میں

یونان کے فلاسفہ قدیم نے مادہ عالم کی حقیقت کے متعلق جو اسٹیڈی اور تحقیق کی ہے وہ شہرستانی کے ملل ونحل میں موجود ہے۔

۱۔ فطالیس کی رائے یہ ہے کہ کائنات کی تخلیق عدم سے نہیں ہو سکتی۔ اس لیے مادہ کا وجود ضروری ہے اور مادہ کائنات پانی ہے۔

۲۔ انکیسمانس کی رائے یہ ہے کہ کائنات مادہ ہوا ہے۔

۳۔ انکسمندر کی رائے یہ ہے کہ مادہ کائنات کی کوئی شکل نہیں جس کو متعین کیا جا سکے۔

۴۔ فیثاغورث کی رائے یہ ہے کہ مادہ کائنات خدا ہے جس سے کوئی چیز خالی نہیں جس طرح کل اعداد ایک ہی کے تکرار سے بنتے ہیں اسی طرح خدائے واحد اصل کائنات ہے۔

۵۔ اکزنوفس کی رائے یہ ہے کہ کائنات کا مادہ واحد ہے۔

۶۔ ارمینڈس کی رائے یہ ہے کہ عدد مادہ نہیں بلکہ پانی اور ہوا کا مجموعہ مادہ ہے۔

۷۔ ملیوسس کی رائے یہ ہے کہ مادہ ایسی ذات ہے جو زندہ اور عاقل اور ازلی ہے۔

۸۔ ہرقلیط کی رائے یہ ہے کہ مادہ آگ ہے جو پھر منقلب ہو کر ہوا بنی اور وہ بدل کر پانی بنا۔

۹۔ امبدوقلس کی رائے یہ ہے کہ مادۂ عالم چار عناصر ہیں۔

ا ــــــــــــــ باد

ب ــــــــــــــ خاک

ج ــــــــــــــ آب

د ــــــــــــــ آتش

ان میں محبت کی قوت باہم انضمام کے لیے اور نفرت کی قوت تفریق کے لیے موجود ہے

۱۰۔ دیموقراطیس کہتا ہے کہ مادہ عالم ذرات ہیں جو اندہی ضرورت کی وجہ سے حرکت کرتے ہیں۔

۱۱۔ انکسا غورس کہتا ہے کہ مادۂ عالم ذراتِ متحرکہ ہیں۔ جن کو خدائے علیم وحکیم حرکت دیتا ہے

۱۲۔ سوفسطائیہ جن میں سے بروتاغورس کی رائے یہ ہے کہ مادہ یا اور کسی چیز کا کسی کو بھی علم نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ عقل اور حس صحیح ذرائع علم نہیں کیونکہ لوگوں کی حالت ان دونوں چیزوں میں متفاوت ہے بلکہ غورجیاس فلسفی کی رائے یہ ہے کہ ہر چیز کی صحیح معرفت عقل اور حس کے ذریعہ محال ہے۔

۱۳۔ سقراط کی رائے یہ ہے کہ مادہ اور دیگر اشیاء کا علم عقل کے ذریعہ ممکن ہے حس کے ذریعہ ناممکن ہے۔

۱۴۔ افلاطون جو سقراط کا شاگرد ہے وہ کہتا ہے کہ مثالی اور تصوری حقائق مادہ عالم ہے لیکن افلاطون اور اس کے شاگرد ارسطو دونوں خدا کے قائل ہیں کہ مادہ خدا کے بغیر کسی موجود میں متشکل نہیں ہو سکتا۔

یہ چودہ اقوال قدیم فلاسفہ کے ہیں جو ہم کو معلوم ہیں۔ نہ معلوم کہ اور کتنے اقوال ہوں گے جو ہمیں معلوم نہیں۔

مادہ جدید فلاسفہ کی نظر میں

جدید فلاسفۂ یورپ اور امریکہ کی تحقیقات کو چونکہ استقرار نہیں بلکہ ان میں انقلاب اور تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے اور جدید تحقیق سابق تحقیق کو رد کرتی ہے اس لیے اب تک جدید فکر میں حسب ذیل تبدیلیاں ہوئیں۔

پہلا نظریہ یہ تھا کہ مادہ عناصر کا نام ہے۔

دوسرا یہ کہ مادہ سالمات یعنی ایمٹی اجزاء کا نام ہے۔

تیسرا یہ ہے کہ مادہ برق پاروں کا نام ہے۔

اب تک جدید فلسفہ اسی حد تک پہنچا ہے لیکن جدید فلاسفہ میں سے بعض کی تحقیق یہ ہے کہ:

"بالآخر برقیت بھی ختم ہو جاتی ہے اور آخر میں صرف ایک نور باقی رہ جاتا ہے۔"

یہ سب خرابی اس غلط جذبے اور تخیل سے پیدا ہوئی کہ عدم اور نیستی سے کوئی چیز وجود میں نہیں آسکتی۔ لیکن یہ خیال ہی سرے سے غلط ہے کہ نیست سے ہست نہیں ہو سکتی۔

نیست سے ہست ہونا

اسلامی زاویۂ نگاہ سے کائنات عالم تو ہست سے ہست ہوئی یعنی مادہ عالم سے وجود میں آئی لیکن خود مادہ عدم سے وجود میں آیا گویا عدم سے وجود اور نیستی سے ہستی کا واقعہ موجودہ عالم سے قبل صرف ایک بار ہوا۔ ازاں بعد جس قدر قدرت کی تخلیقات ہیں، وہ سب اشیاء ہست سے ہست ہوئی

اب جدید فلاسفہ یا قدیم فلاسفہ جو مادے کی ازلیت کے قائل ہیں۔ ان کے پاس اس کے سوا کوئی دلیل نہیں کہ مادہ اگر ازلی نہ ہو تو وہ بھی پیدا کیا گیا ہو گا اور ظاہر ہے کہ مادی اجسام تو مادہ سے پیدا ہیں لیکن مادہ عدم سے پیدا ہوا ہو گا۔ حالانکہ مشاہدہ میں کوئی ایسی چیز نہیں جو دستیاب ہو سکی جو نیست سے ہست ہوئی ہو۔ یہ صرف مغالطہ ہے جو واقعہ مشاہدہ کرنے والوں اور مشاہدات کے وجود سے بہت پیشتر صرف ایک ہی مرتبہ وجود میں آیا ہو۔ وہ اس زمانہ اور اس وقت کیونکر زیر مشاہدہ آسکتا ہے۔ جس واقعہ کو جس واقعہ سے اختصاص ہو، وہ ایک دوسرے وقت میں کیونکر وجود میں آسکتا ہے۔

ایک صاحب نے جو آریہ سماج کے بہت بڑے پنڈت تھے اور اس خیال کے قائل تھے کہ نیست سے کوئی چیز ہست نہیں ہو سکتی ورنہ ہمیں دکھا دو۔ میں نے کہا یہ سوال ایسا ہے کہ بغداد موجود نہیں ورنہ اسی ہندوستان میں بغداد مجھے دکھا دو، جب میں مان لوں گا تو اس کا جواب یہی ہو گا کہ آ جاؤ۔ ہمیں بغداد لے چلو وہیں دکھا دیں گے دہلی میں ہم آپ کو بغداد کیسے دکھا سکتے ہیں۔ ہم بغداد کا وجود مانتے ہیں لیکن اپنے اصلی مقام میں مانتے ہیں۔ دہلی میں ہم نے بغداد کے موجود ہونے کا دعوےٰ کیا ہے۔ اور نہ مشاہدہ کا۔ تو اسی طرح مشاہدہ جیسے مکان سے بدلتا ہے اور زمان سے بھی بدلتا ہے۔

اگر کوئی کہے کہ داما اور سکندر کی جنگ ناممکن ہے ورنہ ہمیں کوئی مشاہدہ اسی زمانہ میں کرائے

تو جواب یہی ہوگا کہ یہ واقعہ اپنے مخصوص زمانہ اور وقت میں ہوا، تم اپنے اس زمانے میں پہنچا

دو تو مشاہدہ کرادیں گے۔

اسی طرح جس وقت موجودہ نظام عالم سے قبل مادہ نیست سے ہست ہوا تو اس وقت

میں ہمیں پہنچا دو تو مشاہدہ بھی کرادیں گے۔ یہی ہے اس عظیم مسئلہ کی حقیقت، جس پر موجودہ فلسفہ

مبنی ہے۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان چونکہ کوئی چیز مادے کے بغیر پیدا نہیں کرسکتا تو اس سے

خیال قائم کیا گیا کہ خدا بھی نہیں کرسکتا۔ اس نظریہ میں خدا کی قدرت کو انسانی قدرت پر قیاس کیا گیا ہے

یہ بھی بالکل غلط ہے۔ ہمیں خدا سے تو کوئی نسبت نہیں۔ نہ کسی چیز میں شرکت کہ وہ خالق ہے

اور ہم مخلوق ہیں ایک مخلوق کی قدرت دوسری مخلوق پر قیاس نہیں کی جاسکتی چیونٹی اور ہاتھی دونوں

مخلوق ہیں اور دونوں حیوانات میں شریک ہیں لیکن ہاتھی کی قدرت پر قیاس نہیں کی جاسکتی کہ چونکہ

چیونٹی بیس من بوجھ نہیں اٹھاسکتی تو ہاتھی بھی نہیں اٹھاسکتا۔ اگر کوئی یہ قیاس کرے تو بڑی غلطی

کا مرتکب ہوگا۔ چیونٹی جو کام نہیں کرسکتی ہاتھی وہ کرسکتا ہے۔ بہذا ہم جو کام نہیں کرسکتے کہ نیست

سے ہست کریں تو خالق کائنات قادر مطلق وہ یقیناً یہ کام کرسکتا ہے۔

۳۔ سائنس کے قواعد کے مطابق مادہ کی ازلیت کا تخیل استقراء اور تجربہ سے قائم کیا گیا اور

استقراء اس وقت دلیل بن سکتا ہے کہ تام ہو۔ ورنہ بہت زمانہ تک سینما میں تصویر متحرک نظر آتی

لیکن بولتی نہ تھی۔ اس وقت کا استقراء یہ تھا کہ تصویر سینما نہیں بول سکتی۔ لیکن مابعد زمانہ میں جب

بولنے لگی تو وہ استقراء باطل ہوا کیونکہ یہ جدید واقعہ سابق استقراء تجربہ کرنے والوں کے تجربہ

سے خارج تھا تو ممکن ہے کہ کوئی ایسا صحیح واقعہ بھی ہو جو انسان کے تجربات سے خارج ہونے

کے باوجود اپنی جگہ دو دونی چار کی طرح صحیح اور درست ہو اور وہ واقعہ نیست سے ہست ہونے

کا ہے اسی طرح تمام عجائبات سائنس سابق تجربہ سے خارج تھے۔ لیکن اب یہ تسلیم شدہ ہیں۔

ہر مادی اجسام مادہ سے پیدا ہوئے اور خالق کائنات نے پیدا کیا، اب خود مادہ اگر کسی اور مادہ سے پیدا ہو تو تسلسل لازم آئے گا۔ لہٰذا مادے کا وجود کسی اور مادہ سے نہیں بنا، ورنہ پھر اس دوم مادے سے متعلق سوال چلے گا جو ختم نہ ہو گا، لہٰذا اس لحاظ سے کائنات مادی ہے۔ اس کے لیے مادہ ضروری ہے لیکن خود مادہ غیر مادی ہے جس کے لیے اور مادے کی ضرورت نہیں۔

باقی اگر اس میں شبہ ہو تو خود انسانی آنکھ کے ابصار اور مشاہدہ کو دیکھو کہ تمام کائنات کا ابصار و مشاہدہ آنکھ کے ابصار سے ہوتا ہے لیکن خود ابصار مبصرات سے نہیں یعنی کل چیزیں ہم نظر سے دیکھتے ہیں لیکن خود نظر، نظر نہیں آتی اور نظر کا وجود نظر آنے سے بے نیاز ہے۔ اسی طرح کل مادیات مادے سے بن گئے ہیں لیکن خود مادہ مادہ سے بے نیاز ہے کہ وہ کسی اور مادہ سے بن گیا ہو، بلکہ وہ بلا مادہ وجود میں البتہ وجود میں لانے والے خدا کی ہستی لازمی ہے یعنی مادے کے لیے دیگر مادہ کی ضرورت نہیں البتہ فاعل و خالق کی ضرورت ہے۔

پہلی قسم یعنی افکارِ جدیدہ جو مادیات سے متعلق ہوں۔ ان میں اکثر آرا صحیح ہو سکتی ہیں کہ وہ مشاہدہ اور تجربہ سے متعلق ہیں اور مادہ چونکہ بے جان اور بے اختیار چیز ہے اس لیے مادہ سے متعلق ایک بار بعد از تجربہ جو نظریہ قائم ہو جاتا ہے تو اس میں کوئی مداخلت نہیں ہوتی اور قائم رہتا ہے۔

مثلاً اگر دو سالمات (ایٹم) ہائیڈروجن اور آکسیجن کے ایک سالمہ کو ترتیب دی جائے تو ہر حال میں اس عمل سے پانی برآمد ہو گا۔ اس لیے اس قسم میں اختلاف کی گنجائش کم ہے اور ہم آسانی سے حکم لگا سکتے ہیں کہ فلاں مادی شے سے فلاں حالات و شرائط کے تحت فلاں خاصیت ظاہر ہو گی۔

عالم انسان سے متعلق علوم

لیکن دوسری قسم یعنی عالم انسان کے متعلق کسی نظریہ کے متعلق ہم قطعی حکم نہیں لگا سکتے، کیونکہ اس میں قطعی اسباب و نتائج کا حکم لگانا اس لیے دشوار ہے کہ انسان مادہ کی طرح مجبور و بے اختیار چیز نہیں کہ مجبور اُسکی

قانون کا محکوم ہو بلکہ اس کا آزاد ارادہ ہر قانون کو توڑ سکتا ہے اور اس کا اختیار علت و معلول کے سلسلے کو درہم برہم کر سکتا ہے اور قطعی علت کا تعین مشکل ہے مادہ سے متعلق نظریہ سے اگر کوئی انکار کر دے تو تجربہ اور مشاہدہ سے اس کو قائل کیا جا سکتا ہے لیکن انسان سے متعلق امور ایسے نہیں۔

مثلاً گزشتہ جنگ میں فرانس کی شکست کا سبب اشتراکیوں کے ہاں سرمایہ دارانہ نظام تھا آمریت پسند کہتے ہیں، شکست کا سبب فرانس کا جمہوری نظام تھا۔ پابند مذہب طبقے کے نزدیک شکست کا سبب فرانس کا اخلاقی انحطاط تھا لیکن ہمارے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں کہ ہم کسی ایک سبب کی صحت کو قطعی طور پر ثابت کر سکیں۔

نتائج امورِ انسانیہ کا بھی یہ حال ہے کہ اس میں قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، مثلاً انسانی علوم کے متعلق عام قاعدہ یہ ہے کہ جب ایک قوم شکست کھاتی ہے، تو اس میں مادی اور اخلاقی انحطاط شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن گزشتہ جنگ میں جرمنی نے شکست کھائی اور اس کی مادی قوت اور اخلاقی عزیمت اور ہمت میں ترقی ہوئی۔

اس سے معلوم ہوا کہ قسم اول یعنی مادہ کے برخلاف اس قسم دوم یعنی انسانی فطرت کے قوانین اتنے غیر متعین اور نامعلوم ہیں کہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں معاملہ انسانی سے فلاں وقت فلاں نتیجہ برآمد ہو گا۔ لیکن عصرِ جدید کی عقلیت نے انسانی امورات خواہ وہ تمدن ہو یا معاشیات یا عمرانیات کے متعلق جو نظریئے قائم کیئے اس پر مادیات کی طرح یقین کرنے لگی۔

حالانکہ یہ معلوم ہے کہ عالم طبیعی میں حق و صداقت کا پانا جس قدر آسان ہے، تمدنی اور معاشرتی امور میں جو انسان سے متعلق ہیں نہایت ہی مشکل ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ انسان مادیات اور طبیعات کا تجربہ کر کے جو رائے قائم کرتا ہے اس میں تجربہ کنندہ انسان خالی الذہن اور غیر جانبدار ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ انسانیت کے میدان میں قدم رکھتا ہے اور تمدنیات اور معاشیات کو سوچتا ہے تو اس کا ذہن ان چیزوں کے متعلق پہلے سے ایک خاص عقائد و تصورات رکھتا ہے اس کی قوم بھی ان چیزوں کے متعلق ایک خاص عندیہ رکھتی ہے اس لیے وہ شخص

وقومی خصوصیات سے الگ ہوکر کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا بلکہ وہ جملہ امورات کی چھان بین اپنے شخصی وقومی مزاج کے تحت کرتا ہے جس کی وجہ سے حقیقت تک رسائی عقلیت کی راہ سے مشکل ہوجاتی ہے اور تمدنی اور معاشرتی مسائل میں عقلیت کو غلطیاں واقع ہوجاتی ہیں۔

اگر ہم مان بھی لیں کہ مادی اور تمدنی مسائل کے اس واضح فرق کے باوجود ہم حقیقت کو پا بھی سکتے ہیں تو دیگر اقوام کو ہم کسی دلیل سے قائل نہیں کرسکتے اور تاوقتیکہ انسانوں کے پاس تمدن کی ایسی مضبوط اساس موجود نہ ہو جس پر سب اقوام کا اتفاق ہو تو تمدن کو پائیداری نہ ہوگی اور اس کی جڑیں ہر وقت ہلتی رہیں گی۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

یہ اعتراض کہ اس واضح فرق کو حکماء مغرب نے کیوں نہ دیکھا اور کیوں بے ہودہ طور پر انہوں نے اپنی عمریں اور محنت، تمدنی اور معاشرتی مسائل میں صرف کی اس کی وجہ اور جواب عقلیت کی نشاۃ جدیدہ کی تاریخ سے نمایاں ہیں کہ عقلیت جدیدہ کو مسیحیت سے جو اس وقت عقل کی راہ میں رکاوٹ تھی اور اس کے بنیادی مسائل مثلاً الوہیت مسیح یا تین ایک اور ایک تین اور مصلوبیت مسیح پر ایمان لانے سے گناہوں کا کفارہ ہونا چند نامعقول امور کا مجموعہ تھے، ان سے عقلیت کو ٹکر ہوئی اور جب عقلیت کو فتح ہوئی تو انہوں نے تمام ادیان کا خواہ محرف اور غلط ہو۔ جیسے مسیحیت یا حق اور فطری ہو۔ جیسے اسلام، سب کا انکار کیا اور سب سے پہلے انتقام لینا چاہا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ تمدنی اساسات کا الہامی دروازہ انہوں نے بند کیا اور عقل کی راہ سے تمدن کو بھی حل کرنا چاہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی تمدنی الہامی بنیاد کو اور خدائی اساسات اور بنیادوں سے ہٹ کر عقل کی بنیادوں پر قائم کیا گیا۔ جس کی حقیقت تک رسائی کا ذریعہ عقل کے پاس موجود نہ تھا۔ اور نہ عقل جذبات و میلانات نفس کی دخل اندازی سے خالی ہوسکتی ہے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ عقلیت جدیدہ نے ایک ایسا تمدن قائم کیا جس میں حرص وخواہشات نفس کی تکمیل

اور درندہ صفت خونریزی کے سوا کچھ نہ تھا اور انسانی تمدن جاہلانہ دور کے تمدن سے بھی زیادہ پستی میں جاگرا۔ کیونکہ جاہلانہ دورِ تمدن میں بھی کچھ نہ کچھ الہامی بنیادیں موجود تھیں اور تعجب یہ ہے کہ اس بر خود غلط اور غیر فطری تمدن کے استحکام میں روز بروز اضافہ کی کوشش کی جاتی رہی جس سے اس کے زخم اور بڑھتے ہیں۔ جیسے بقول مولانا روم۔

"جو کانٹا قدم میں چبھ گیا ہو اور صاحبِ قدم چھٹکارا پانے کے لیے اس کو زور سے زمین پر مارے تو قدم زیادہ زخمی ہو گا"

تمدنِ حاضر زندگی کے قدم کا کانٹا ہے، جتنا قدم زمین پر مارا جائے گا۔ اتنا کانٹا مضبوط ہو کر قدم مزید زخمی کرے گا۔ اصل علاج یہ ہے کہ ہوشیار آدمی آکر کانٹے کو نکال کر دور پھینکے اور اس کو مضبوط کر دے۔

ان انسانی اور تمدنی مسائل میں جدید عقلیت کی جذباتی لغزشوں اور غلطیوں کے لیے عورت کے مسئلے کے متعلق ان کی آراء ملاحظہ ہوں۔ جن سے ان کی لاعلمی نمایاں ہے۔

عورت اور مغرب

سب سے پہلے فکرِ جدید نے عورت کو انسانی حقوق سے محرومی کی بنیاد پر اپنے تمدن کی بنیاد قائم کی اور یہ قانون بنایا کہ :

۱۔ "عورت شادی کے بعد اپنے پدری اقارب سے کٹ کر شوہر کے خاندان کا ایک فرد ہے اس کی تمام ملکیت شوہر کی ہے اور وہ خود کسی چیز کی مالک نہیں بن سکتی اور نکاح ہونے کے باوجود جب تک رخصتی نہ ہو تو خاوند کی ملکیت سے اس کا تعلق نہیں اور خاوند کے مرنے پر وارث نہیں ہو سکتی۔"

۲۔ شادی شدہ عورت کو جب شوہر کے گھر میں نہ ہو اپنی اولاد سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر ماں مر گئی یا اس کی اولاد تو ان کے درمیان وراثت نہ ہو گی بلکہ کنبہ کا رئیس اور سرپرست سب چیز کا حقدار ہے۔" (قانون روما المقارنات التشریعیۃ بین القوانین الوضعیۃ المدنیۃ والتشریع

الاسلامی، سید عبداللہ صہ۱۸۱)

۳۔ "عورت کو خرید و فروخت اور کسی معاملہ کا اپنی ملکیت میں بھی شوہر کی اجازت کے بغیر کسی قسم کا اختیار حاصل نہیں۔

۴۔ "عورت کے املاک پر شوہر کا تسلط حاصل ہے۔ وہ خرید و فروخت اور شرکت کا اختیار نہیں رکھتی۔" (حوالہ مذکورہ، قانونِ فرانس صہ۱۹۲)

۵۔ "عورت کسی معاملہ میں مدعیہ یا مدعی علیہا نہیں بن سکتی اور نہ عدالت میں حاضر ہو سکتی ہے جب تک شوہر کی اجازت نہ ہو۔" حوالہ بالا صہ۱۸۱)

عقلیتِ جدیدہ نے ان قوانین کے تحت عورت کو بے بس جانوروں کی طرح بے اختیار اور شوہر کی ملکیت قرار دیا۔ لیکن بعد ازاں عقلیت جدیدہ کا یہ تفریطی جذبہ جب افراطی جذبہ میں تبدیل ہو گیا تو تمدن کی بنیاد عورت کی حریت اور کلی آزادی پر قائم کی گئی اور اس کو مردوں کے ساتھ تمام امور میں مساوی قرار دیا۔

اب عورت کو بلا اجازت شوہر ہر مرد سے خلوت و جلوت میں ملنے کی آزادی حاصل ہوئی اور جس قدر شوہر کماتا تھا عورت بھی اسی طرح کمانے لگی اور ازدواجی رشتہ اس قدر کمزور ہوا کہ عورت جب چاہے کسی خوب صورت اور مال دار شخص سے تعلق قائم کر کے شوہر سے علیحدہ ہو سکتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عائلی زندگی کا تمدنی نظام درہم برہم ہوا۔ بعض شوہر عورتوں کی اس بغاوت سے تنگ آکر خودکشی کرنے لگے، اور مشہور لڈوسی نے وومین (WOMAN) نام کتاب عورت پر لکھی جس میں یہ فیصلہ کیا کہ۔

اور یورپ کی عائلی تباہی کا علاج اب صرف یہی ہے کہ عورت کو دانایانِ مشرق کے قواعد کے تحت دوبارہ کنٹرول کیا جائے۔"

لواطت

لواطت کو تمدن کے لیے تباہ کن سمجھ کر عقلیت قدیمہ کا پہلا تمدنی قانون یہ تھا کہ اس فعلِ خبیث کو جرم قرار دیا جائے اور قرار دیا گیا لیکن عقلیت

جدیدہ کی عطا کردہ بے لگامی نے یورپ کو اس فعلِ بد کی وجہ سے سدوم اور عمورہ بنایا تو خود برطانوی پارلیمنٹ کے مادر پدر آزاد ممبران نے لواطت کو جائز قرار دیا اور "ملکہ الزبتھ" کے دستخط سے اس کو ملک کا قانون بنا دیا گیا۔

کیا ان واقعات سے اس امر کی تصدیق نہیں ہوتی کہ تمدنی مسائل کی پیچیدگی عقل حل نہیں کر سکتی۔ اس میں الہامِ ربانی کی ضرورت ہے۔

بقول اقبال ؎

فساد کا ہے فرنگی معاشرے میں ظہور
کہ مرد سادہ ہے بیچارہ زن شناس نہیں

عقلیت جدیدہ اور ماوراء الطبیعات

ماوراء الطبیعات سے وہ حقائق مراد ہیں جو مادی تجربات سے خارج ہوں اور انسانی عقل اور حواس یا وجدان کے ذریعہ ان کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ نہ کر سکتا ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ انسانی تجربہ کے لیے دو امر ضروری ہیں۔

۱۔ اتحادِ زمانی اول یہ کہ ان امور کو انسان سے اتحادِ زمانی ہو یعنی تجربہ کنندہ انسان اور وہ زیرِ تجربہ امور ایک وقت میں موجود ہوں۔

(الف) مبداءِ عالم اس اصول کے تحت قبل الانسان یا مبداء انسان سے متعلق امور سائنسی دائرہ سے خارج ہیں یعنی یہ فیصلہ کہ انسان سے پہلے کیا تھا یا انسان کا آغاز کب اور کس طرح ہوا۔ یہ دونوں ایسی چیزیں ہیں کہ انسان کے ذرائع معلومات سے خارج ہونے کی وجہ سے انسان کے لیے غیبیات ہیں۔ نہ وہ اپنے آغاز کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ کر سکتا ہے اور نہ آسمان و زمین، آفتاب و ماہتاب اور ستارگان کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم کر سکتا ہے۔ اگر

کوئی رائے قائم بھی کرے تو وہ اٹکل پچو اور تخمینی اور خیالی رائے ہوگی نہ حقیقی۔

قرآن نے اسی حقیقت کو اس انداز میں بیان کیا ہے :۔

مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا

میں نے ان منکرین کو نہ آسمان و زمین کی پیدائش کے وقت حاضر کیا تھا اور نہ انسان کی پیدائش کے وقت اور نہ میں نے ایسے گمراہ افراد کو تخلیق میں اپنا دست و بازو بنایا تھا۔

(ب) منتہی انسان

اسی اصول کے تحت بعد الانسان اور موت انسان کے بعد کے واقعات جس کو منتہائے انسان کہنا چاہیئے انسان کے ہم زماں نہیں، یعنی انسان ان کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم نہیں کر سکتا، عالم قبر و برزخ ہو یا عالم آخرت، دونوں انسانی تجربات اور سائنس کی دنیا سے خارج ہیں۔ اس لیے انسان کی رائے ان امور کے بارے میں کوئی وقعت نہیں رکھتی۔

۲۔ روحانیات

دوسرا امر یہ کہ کثیف اشیاء ہوں، یا لطیف اشیاء، ہیں جن تک انسانی تجربات اور تحلیل و تجزیہ کی رسائی نہیں۔ وہ تجزیہ و تحلیل سائنس کے دائرے سے خارج ہیں، ایسی چیزیں خالق کائنات کی ذات، ملائکہ، ارواح انسان، عقائد و اخلاق و اعمال انسانی کا حسن و قبح اور انسان کی پوری زندگی کے تمام دائروں میں (دنیا قبر و آخرت میں) ان کے نفع و ضرر کی تعیین اور ان کے حدود کی تشکیل، انسانی یا سائنسی تجربات سے خارج ہیں۔ اس لیے انسان ان تک رسائی پانے سے قاصر ہے بلکہ ان تینوں چیزوں مبدء انسان، منتہائے انسان، روحانیت لطیفہ بنا بریں کا ذریعہ صرف وحی الٰہی اور الہام ربانی ہے جو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ انسان کو حاصل کر سکتا ہے اور حاصل ہونے کے بعد وہ انسانی ذرائع سے متصادم نہیں بلکہ انسانی ذرائع علم کے موافق ہیں۔

مثلاً کان سے آوازوں اور تقریروں کا علم ہوتا ہے اور آنکھوں سے رنگوں اور اشیاء کے

چھوٹے بڑے ہونے کا علم اب کان آنکھ کی معلومات سے عاجز ہے اور آنکھ کان کی معلومات سے لیکن ان دونوں اگرچہ الگ الگ ہیں

کی معلومات میں تضاد تخالف وتصادم نہیں۔ اسی طرح حس عقل کی معلومات سے قاصر ہے اور عقل حس

کی معلومات سے لیکن دونوں میں ٹکر نہیں۔

یہی حال حس وعقل کو وحی الہی کے ساتھ ہے کہ یہ دونوں قوتیں وحی کے ذریعہ حاصل کردہ معلومات

تک رسائی نہیں پا سکتیں لیکن ان دونوں علوم کو وحی کی معلومات سے کوئی تصادم نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حس صحیح اور عقل سلیم اور وحی کی معلومات میں تصادم ناممکن ہے۔

کیونکہ دو صحیح چیزیں ایک دوسرے کی ضد نہیں ہوتیں۔ اس لیے مذہب اور سائنس میں تصادم

کا امکان ہی نہیں۔ دونوں کے دائرے الگ الگ ہیں۔ سائنس دائرہ مذہب تک پرواز ہی نہیں

کر سکتی۔

اگر سائنس مذہب دشمنی کے انتقامی جذبہ کے تحت مذہبیات میں مداخلت کرنے لگے تو خود

سائنس انسانیت کے لیے باطنی زہر بن کر انسانیت کی تباہی پر منتج ہوگی۔ جیسے دور حاضر کی سائنسی

کج دماغی اور بے راہ روی سے ایسا ہو رہا ہے۔

لامارک کا نظریۂ ارتقاء اور چھ دلائل سے اس کی تردید

سب سے پہلے لامارک (LAMARCK) نے ثابت کیا کہ عملِ ارتقاء خارجی قوتوں

کا اثر نہیں۔ بلکہ جب کسی نوع میں پرزور خواہش پیدا ہو جاتی ہے تو اس کے اندرونی مہیجات

سے ارتقاء شروع ہو کر نشو و نما پاتی ہے۔

اس نے بچے کی مثال دی کہ پیدائش سے کچھ عرصہ بعد بچہ میں یہ خواہش جوش مارتی

ہے کہ وہ بھی اپنے بڑوں کی طرح اپنے پیروں پر چلنے لگے۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اس میں یہ صلاحیت

پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مختلف انواع نے درجہ بدرجہ نیچے سے اوپر تک بلند نوع کی شکل اختیار

کی۔ اسی طرح اونٹ کی گردن پہلے دیگر حیوانات کی طرح چھوٹی تھی۔ لیکن جب درختوں کے نیچے پتے دیگر حیوانات نے کھا لیے تو غذا کی ضرورت سے ان میں لمبی گردن ہونے کی خواہش پیدا ہوئی۔ چنانچہ رفتہ رفتہ اس کی گردن لمبی ہو گئی۔

دلیل اوّل انسان کو ارتقائی مخلوق ماننے کی یہ توجیہ جو لامارک نے کی۔ مجنوں کی بڑ سے زیادہ نہیں۔ ادنیٰ درجے کی مخلوق جماد ہے۔ پھر نبات پھر حیوان، پھر انسان ہے۔ جمادمیں تو سرے سے خواہش ہی موجود نہیں کہ وہ ارتقاء کا سبب بنے۔ نبات اور حیوان میں اگر کسی قسم کی خواہش موجود بھی ہے تو وہ اس قدر باشعور کہاں ہے کہ وہ کسی نوع کی بلندی اور برتری کو معلوم کر کے اس کی پُرجوش خواہش کرے۔

دلیل دوم خواہش کے لیے تصور کامل کی ضرورت ہے۔ ہم آم کھانے کی خواہش یا گورنر بننے کی خواہش اس وقت کر سکتے ہیں کہ ہمیں آم اور گورنری کے متعلق پورا علم ہو، تصور ہو

دلیل سوم یہ کہ خواہش کے لیے اسباب ممکنہ کی ضرورت ہے جو پست درجہ کی نوع میں موجود نہیں تو وہ ایک بلند نوع کی طرف ارتقاء کی خواہش کیونکر کر سکتا ہے۔ جب کہ تکمیل خواہش کا سامان موجود نہ ہو۔ کیا ایک بے تعلیم آدمی یہ خواہش کر سکتا ہے کہ وہ چیف انجینئر یا سول سرجن بن جائے؟

اونٹ کی مثال میں اونٹ کے پاس گردن کی لمبائی کے لیے کیا اسباب تھے جو اس نے گردن لمبی ہونے کی خواہش کی؟ باقی بچے کی مثال میں ضعف سے قوت کی طرف انتقال خود بچے کی فطرت کا لازمی نتیجہ ہے کہ وہ فطرۃً بتدریج نشوونما پاتا ہے۔ اس میں خواہش کا دخل نہیں۔ اگر خواہش نہ کرے جب بھی مقررہ وقت پر اپنے پاؤں سے چلے گا۔

دلیل چہارم چوتھی بات یہ ہے کہ ادنیٰ نوع مثلاً حیوانِ مطلق سے انسان بن جانا۔ اگر حیوان کی کسی نوع کی خواہش کا نتیجہ ہو تو اس کو انسانی صورت، انسانی

ڈھانچہ اور انسانی صفات وخصوصیات کا علم ہونا ضروری ہے۔ لیکن اس وقت تو انسان وجود میں نہیں آیا تھا۔ تو اس نے انسانی حقیقت کو کیسے جانا کہ اس کی طرف ارتقاء کرنے کی خواہش اس میں پیدا ہوئی۔

دلیل پنجم پانچویں بات یہ ہے کہ انسانی کمالات اس پست نوع میں موجود نہیں تھی تو منفی سے مثبت کیسے وجود میں آیا۔ جب کہ صرف طبعی ارتقاء سے ایسا ہوا اور فاعل حکیم یعنی خالق کائنات کا عمل اس میں مؤثر نہیں تھا۔

دلیل ششم چھٹی بات یہ ہے کہ انسان بن جانے کے بعد ارتقاء کیوں رک گیا؟ اور اس سے آگے چل کر کسی اور اکمل نوع کی طرف ارتقاء کیوں نہیں ہوا؟ بلکہ یہ عمل ارتقائی مسلسل جاری رہنا چاہیئے خواہ نمونہ موجود ہو یا نہ ہو۔

جماد کے وقت نبات نہ تھا۔ نبات کے وقت حیوان نہ تھا۔ حیوان مطلق کے وقت انسان نہ تھا اور درمیان میں کسی خالق حکیم کا دخل وعمل بھی نہ تھا۔ تاکہ کچھ وقت تک ارتقائی عمل کرتا اور پھر اپنے ارادے سے اس کو بند کرتا۔ بلکہ یہ سب کچھ صرف طبعی رفتار سے ہوا تو انسان پر پہنچ کر کیوں ارتقائی عمل ختم ہوا؟

ڈارون کا نظریۂ ارتقاء اور اس کی تردید

ڈارون نے بھی عالم فطرت کی تخلیق کی توجیہ لامارک کی پیروی میں ارتقاء کے نظریہ کے تحت کی۔ لیکن اس کا ارتقاء۔ لامارک کے ارتقاء سے مختلف ہے۔ ڈارون نے اپنا ارتقاء ۔تنازع للبقاء۔ انتخاب طبعی اور بقاء اصلح کے اصول پر قائم کیا۔ اس کا دعوٰے ہے کہ فطرت صرف اسی نوع کو باقی رکھتی ہے۔ جس میں بقاء کی صلاحیت ہو۔ باقی تمام انواع رفتہ رفتہ فنا ہو جاتی ہیں اور فطرت انتخاب طبعی کے اصول کے

تحت صرف انہیں انواع کا انتخاب کرتی ہے۔ جو اس معیار پر صحیح اتریں، باقی کو فنا کرتی ہے اور اسی نتیجہ کا نام بقائے اصلح ہے اور انواع کی باہمی کش مکش کا نام تنازع للبقاء ہے۔

اونٹ کی مثال کی اس نے یہ توجیہ کی ہے کہ لمبی گردن اونٹ کی خواہش کا نتیجہ نہیں بلکہ ابتدا میں دونوں قسم کے اونٹ موجود تھے۔ چھوٹی گردن والے بھی اور لمبی گردن والے بھی دونوں میں تحصیل غذا کے لیے کشمکش رہی۔ جب نیچے کے پتے اونٹوں نے کھا کر صاف کر دیئے اور صرف بلند پتے رہ گئے۔ جن کو چھوٹی گردن والے اونٹ نہیں پہنچ سکتے تھے تو وہ سب بھوک سے فنا ہوئے اور اصلح یعنی لمبی گردن والے اونٹ رہ گئے۔ پھر ان میں توالد و تناسل کا سلسلہ جاری رہا جس سے فنا شدہ اونٹوں کی کمی پوری ہو گئی۔

یہ ہے نظریۂ ڈاردن۔ جس کی بنا یہ ہے کہ بے رحم فطرت صرف قوی کو باقی رکھتا ہے اور کمزور کو مٹا دیتی ہے۔ ارتقاء کا اصلی بانی لامارک ہے لیکن یورپ میں اس کا نظریہ مقبول نہ ہو سکا اور ڈاردن کا نظریہ مقبول ہوا۔ اگرچہ انکار خدا اور مادی ارتقاء پر دونوں متفق تھے۔ وجہ یہ تھی کہ یورپ کے دور جدید میں کسی نظریہ کی مقبولیت معقولیت کی وجہ سے نہیں ہوتی ان کے جذبات کی موافقت کی وجہ سے ہوتی ہے چاہے وہ نظریہ کتنا ہی نامعقول ہو۔

چونکہ ڈاردن کا نظریہ یورپ کے جنگجویانہ مزاج اور استعمار پرستانہ مذاق کے موافق تھا کہ کمزور کو مٹ جانا چاہئے اور صرف قوی کو تنازع للبقاء کے میدان میں رہنے کا حق ہے اس لیے تمام اسکولوں اور کالجوں میں اس نظریہ نے قبول تام حاصل کر لیا۔

اس سے پہلے یہ بھی معلوم ہوا کہ یورپ کی فکر عقلی کم اور جذباتی زیادہ ہے یورپ کی عقل کی روشنی اکثر جذبات اور مفادات کی تاریکیوں میں گم ہو جاتی ہے اور اصل حقیقت کی طرف رسائی نہیں ہوتی۔

اب ہم ڈاردن کے نظریہ پر تنقید کریں گے۔ جن چھ دلائل سے ہم نے لامارک کے ارتقاء کی تردید کی ہے۔ ان چھ دلائل سے ڈاردنی ارتقاء کی بھی تردید ہو سکتی ہے لیکن ہم ان چھ دلائل

کے علاوہ اور دلائل پیش کرتے ہیں تاکہ ڈارون کے ارتقاء کی حقیقت معلوم ہو سکے۔

نظریۂ ڈارون کی تردید

مارکس کا معاشی نظریہ بھی ڈارون کے نظریہ ارتقاء پر مبنی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ڈارون کا نظریہ ہے کہ انسان کی تمام تبدیلیاں اور تمدن کے تمام انقلابات انسان کے خارجی ماحول کے تابع ہیں اور مارکس کے نزدیک یہ ساری تبدیلیاں معاشی حالات کی تبدیلیوں کے تابع ہیں۔ دونوں کے نزدیک انسان اپنے ماحول سے مجبور ہے اور اس کا غلام اور تابع ہے اس کے اپنے ارادے کو اس میں دخل نہیں۔

ڈارون کا نظریۂ جبر ہے

۱۔ مارکس خود کہتا ہے کہ انسان کے ارادے کی تشکیل خارجی معاشی حالات سے ہوتی ہے۔" ان دونوں کا مذہب پر یہ اعتراض ہے کہ وہ تقدیر کا قائل ہے اور وہ انسان کو عمل سے معطل کرتا ہے کہ اس نے انسانی تبدیلیوں کو انسانی میلانات اور سعی و عمل کا نتیجہ تسلیم کیا تھا، لیکن ڈارون نے اسے ماحول سے مجبور قرار دیا

۲۔ ڈارون کے نظریۂ بقاء اصلح میں ظالمانہ قوتوں کی حوصلہ افزائی ہے اور مظلوم انسان کو بے سہارا اور بے یار و مددگار چھوڑنے کی ترغیب ہے جس سے انسان کی فطری اخلاقی رحم و شفقت علی الانسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور یہ دنیا میں بدامنی کی ایک تحریک ہے۔

۳۔ ڈارونی نظریۂ ارتقاء اور مارکسی نظریۂ معاشی کے مطابق انسان بیرونی عوامل اور معاشی حالات کا ایک مجبور کھلونا بن جاتا ہے اور انسان کے ارادہ اور عمل کے لیے کوئی میدان باقی نہیں رہتا۔ وہ اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود ماحول کا محکوم بن جاتا ہے اور سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ کے تحت اس کو عالمی واقعات پر حاکمیت اور تسخیری قوت حاصل ہے۔ وہ فنا ہو کر اس کی ترقی اور تخلیقی سرگرمیاں ختم ہو جاتی ہیں۔

۴۔ گزشتہ ۲ جنگوں نے ڈارونی اور مارکسی دونوں کے نظریات کو غلط ثابت کر دیا۔ ڈارون کا ارتقاء تو اس لیے غلط ثابت ہوا کہ گزشتہ صدی کی انسانی تعمیرات کو ان دونوں جنگوں نے بھسم کر دیا اور انسانی ارادے اور خواہشات نے ماحول کی ہر تعمیر کو خاکستر بنا کر فنا کر دیا اور ارتقاء کو انحطاط

میں تبدیل کر دیا اور مارکسی معاشی نظریہ کو اس لیے غلط ثابت کر دیا کہ ان دونوں جنگوں میں زیادہ نقصان مزدوروں کو پہنچا جو شہر کے کارخانوں میں کام کر رہے تھے اور بمباری زیادہ تر شہروں پر پر ہوئی۔ اور ان جنگوں سے غریبوں کی غربت اور افلاس میں اضافہ ہوا۔

اقوامِ متحدہ کی سماجی و معاشی رپورٹ مندرجہ انجام کراچی ۱۰ مئی ۱۹۵۳ء میں درج ذیل ہے کہ :۔

"دنیا کی نصف آبادی فاقہ کشی اور بیماری میں مبتلا ہے۔"

۵۔ ارتقاء کے متعلق جارج برنارڈ شا لکھتا ہے۔

"کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ جس شخص نے انسانیت کے سامنے یاس و نا امیدی کی ایسی ہیبت ناک خلیج کھول دی وہ ڈاروِن کا نظریۂ ارتقاء ہے جس میں بھوک، موت، حماقت، اعلیٰ اتفاقات اور اسی نوع کی دیگر کورانہ قوتیں کام کر رہی ہیں۔

حیرت ہے کہ نہ تو اسے سنگسار کیا گیا، نہ انسانی نسل سے اس کی دشمنی پر اسے پھانسی دی گئی بلکہ الٹا اس کو دنیا کا نجات دہندہ اور ایک نئے عہد کا پیغمبر مانا گیا۔"

دوسری جگہ لکھتا ہے کہ :۔

"ڈاروِن کا نظریہ اس لیے مقبول ہوا کہ ہر جماعت ایک قسم کی اغراض رکھتی تھی۔ یہ نظریہ ان اغراض کا موید تھا۔ جنگ کے حامیوں سے لے کر اشتراکیت پسندوں اور سرمایہ داروں تک نے اس کو پسند کیا۔ جنگ پسند اور سرمایہ داروں نے اس لیے پسند کیا کہ اس میں تنازع للبقاء اور بقائے اصلح کا تصور پیش کیا گیا اور اس نظریہ کی رو سے کمزوروں کو شکست اور بربادی اور طاقتور کی فتح مندی کو فطرت کا ایک ازلی قانون بتایا گیا اور "بنی آدم اعضائے یک دیگرند" کا توڑ اس میں موجود تھا۔ اشتراکیوں نے اپنے نظام کو لبقاء اصلح سمجھا۔"

ان باتوں سے معلوم ہوا کہ فکرِ جدید والوں کی لغزشیں تمدنی مسائل کے حل میں کس قدر خطرناک ہیں۔

تمدنی مسائل کے حل میں انسانی فکر کی حماقت

پروفیسر لاسکی لکھتے ہیں:۔

"ہم اپنے شخصی تجربات کی چار دیواری میں اس طرح محصور ہیں، کہ غیر شعوری طور سے اپنی ذاتی بصیرت کو معیارِ حق قرار دیتے ہیں۔ سماجی انقلابات کی آدھی مصیبتیں ختم ہو جائیں گی اگر ہم اس یقین سے دست بردار ہونے کے لیے تیار ہو جائیں کہ ہماری ذاتی رائے ہمیشہ صحیح ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسانی معلومات میں علت و معلول کی بابت سائنٹیفک زاویہ نگاہ حاصل کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا عام طبیعی میں اس کا حصول آسان ہے کیونکہ اول الذکر کے متعلق ہماری رائے اور فیصلے میں وہ سارے جذبات و تعصبات دخیل ہو جاتے ہیں جن سے نجات حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ یہ جذبات و تعصبات ان مفروضات اور اصولِ موضوعہ کے انتخاب میں ہماری نظر کو متاثر کرتے ہیں۔ جن پر ہم اپنے نتائج کی بنیاد رکھتے ہیں۔ طبیعیات اور کیمیاء میں تو ہماری عقل ناطرف دار اور انصاف پسند رہتی ہے۔ لیکن انسانی امور اور معاملات میں اس ناطرف داری اور انصاف کا دسواں حصہ بھی باقی نہیں رہتا۔" (اشتراکیت اور اسلام، صدیقی صفحہ ۲۹ تا صفحہ ۳۰)

ماوراء الطبیعیات اور نہایت لطیف حقائق کے متعلق فکرِ جدید کی نارسائی

گزشتہ تحریرات سے یہ ثابت ہوا کہ انسان محسوس اور غیر لطیف ہونے کے باوجود فکرِ جدید کو ان کے معاملات میں حقیقت تک رسائی نہ ہو سکی اور غلط افکار کی وجہ سے انسانیت کو مبتلائے مصائب کر دیا۔ جو ہدایات ربانی سے انحراف کا نتیجہ ہے۔

اب ما وراء الطبیعیات مثلاً خدا ملائکہ، رسالت، آخرت، روح انسانی کے مسائل کے متعلق اس کی بے چارگی تو انسانیت کے مسائل کی نسبت زیادہ واضح اور نمایاں ہیں اور انسان اس سلسلے میں صرف ہدایاتِ ربانی اور الہامات خداوندی کا محتاج ہے۔

جن فلاسفۂ مغرب نے خدا اور مذکورہ دینی حقائق سے انکار کیا جیسے رابرٹ ڈنگرسال اس انکار کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ ہم ان اشیاء کو نہیں جانتے، گویا لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں، نہ یہ کہ ان دینی حقائق کا نہ ہونا ان کو معلوم ہے۔

۱۔ الکلام میں فیل فلاریاں فرانسیسی کا یہ قول منقول ہے کہ:

"تمام فلاسفۂ مغرب اس بات کے سمجھنے سے عاجز ہیں کہ وجود کیونکر متحقق ہوا اور اس نے کیونکر ترقی کی، لہٰذا ہم اس پر مجبور ہیں کہ ایک ازلی ابدی خالق کا اقرار کریں۔"

۲۔ فرنتل انسائیکلوپیڈیا میں لکھتے ہیں کہ:

"مقصد الطبیعیات جم خالق ہے اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اللہ او رخالقِ کائنات کا وجود بدیہی ہے۔"

۳۔ پلوٹارک ایزک نیوٹن کہتا ہے کہ:

"عالم کی موجودہ ترتیب ایک خدا ئے علیم و تدبیر کے بغیر ناممکن ہے۔"

۴۔ ہربرٹ سپنسر کہتا ہے کہ:

"یہ ضروری ہے کہ انسان کے اوپر ایک ازلی ابدی قوت خداوندی موجود ہے۔"

باقی امور کا علم بھی فکر جدید کے دائرے سے اس لیے خارج ہے کہ انسان کے محسوس کیفیات اور معاملات سے جب فکر جدید قاصر ہے اس لیے کہ وہ مادی تجربے کے دائرے سے خارج ہیں تو ملائکہ، نبوت، روح انسانی آخرت، حسن، قبح، اعمالِ انسانی تک ان کی رسائی کیونکر ممکن ہو سکتی ہے۔

انسانی اعمال کے متعلق پارلیمنٹوں میں مفکرین جدید کے فیصلے روز بدلتے ہیں کبھی

آزادیٔ تجارت کا قانون پاس ہوتا ہے۔ جب اس میں خامی نظر آتی ہے تو پابندی لگا دیتے ہیں۔ کبھی شراب نوشی کی آزادی کا قانون بنتا ہے۔ لیکن جب شراب کی مضرتیں نمایاں ہوئیں تو ۱۹۲۳ء میں امریکہ نے بندش شراب کے قانون کو نافذ کرنا چاہا۔ لیکن شراب کے عادی عوام کے آگے ان کی بات نہ چل سکی۔ کبھی طلاق کی بندش کا قانون پاس کیا گیا اور اسلام پر قانونِ جوازِ طلاق کی وجہ سے انکار کرتے رہتے رہے۔ لیکن جب ازدواجی حالات نے ان کو مجبور کیا تو جواز طلاق کا قانون پاس کیا گیا۔

اسی طرح انسانی معاملات کے متعلق روز قوانین بنتے ہیں اور تجربہ کے بعد توڑے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے علم الحیات کے مشہور ماہر ڈاکٹر لائیڈ مارگن نے لکھا ہے کہ:۔ "انسانی ارتقاء کی توجیہ ممکن نہیں تاوقتیکہ اصل تخلیق یعنی خالق کائنات کا اقرار نہ کیا جائے۔" اگر ارتقاء طبعی بھی ہو تو سوال یہ ہوگا کہ ارتقاء کا تقاضا کہاں سے آیا؟ پھر ارتقاء ایک سیڑھی ہے اور ہر سیڑھی پر چڑھنے کے لیے ایک منزلِ مقصود کا ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ ارتقاء سیڑھی کی طرح بالذات مقصود نہیں۔ منزل تک پہنچنے کے لیے مقصود ہے جو ذات رب العالمین ہے۔

علم الطبیعیات کی مشکلات کا حل علم الحیات میں ہوتا ہے اور علم الحیات کے غوامض کا حل علم النفسیات میں اور علم النفسیات کے دقائق کا حل علم التعلیل والتحلیل المنطق میں اور پھر علم التعلیل کے غوامض کا حل مقام روحانیات اور الہامات الٰہیہ میں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ گزشتہ دو سو سال میں فکر جدید نے مادہ کے متعلق جو طے کیا تھا۔ اس کو جدید دریافت نے توڑ دیا کہ مادہ سالمات اور ایٹم نہیں بلکہ برق پارے ہیں۔ اس کے بعد یہ دریافت ہوا کہ مادہ برق پارے نہیں بلکہ صرف قوت کا نام ہے جس کی صحیح تعبیر نور ہے تو معاملہ خارجیت اور جزئیت سے ذہنیت اور کلیت تک پہنچا۔" (غبار خاطر صفحہ ۱۴۹)

عقل کی راہنمائی کے لیے وحی کی ضرورت

حقیقت یہ ہے کہ علم الطبیعیات اور محسوسات

ہے۔

کے لیے جس طرح دو قسم کی روشنیوں کی ضرورت ہے ایک داخلی روشنی جو آنکھ میں ہے اور ایک خارجی روشنی جو انسانی وجود سے باہر ہے۔ جو عالم بالا سے تعلق رکھتی ہے۔

اگر آدمی اندھا ہو تو بھی محسوسات مادیات اور طبیعیاتی تجربات سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا تاوقتیکہ اس کی آنکھ میں روشنی موجود نہ ہو۔ لیکن اس روشنی کے باوجود اگر سماوی روشنی مثلاً سورج یا اس کا قائم مقام بجلی وغیرہ جس کا وجود بھی دراصل سماوی اور قدرتی ہے موجود نہ ہو، تب بھی مادی نظریات کی دریافت ممکن نہیں۔

اسی طرح انسانیات ماوراء الطبیعیات امور مثلاً خدا، نبوت، ملائکہ، آخرت مجازاۃ اعمال انسانی اعمال کے حسن وقبح اور اس کے دنیوی اور اخروی نتائج و آثار کے علم کے لیے بھی دو نور اور روشنیاں ضروری ہیں۔ داخلی جو عقلِ خداداد ہے اور دوم خارجی روشنی جو وحی و الہام ربانی ہے تاکہ عقل وحی کی روشنی میں لطیف اور غیر مادی حقائق کو دریافت کر سکے۔

مادیات کم درجے کی چیزیں ہیں۔ ان کے لیے جب دو روشنیوں کا انتظام فطرت کی طرف سے کر دیا گیا ہے تو یہ ممکن نہیں کہ ماوراء الطبیعیات کے لیے جو مادیات سے زیادہ پوشیدہ غامض اور مشکل حقائق ہیں۔ ان کے لیے عقل کے علاوہ خارجی روشنی یعنی وحی کی روشنی کے ذریعہ انتظام نہ کیا گیا ہو۔

یہ انتظام سلسلۂ وحی و انبیاء سے کیا گیا اور آخری جامع اور اکمل روشنی وحی قرآنی کی شکل میں ابد تک کے لیے محفوظ کر دی گئی۔ بقول اقبال مرحوم ؎

آں کتاب زندہ قرآنِ حکیم — حکمتِ اولایزال است و قدیم
صد جہاں تازہ در آیاتِ اوست — عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست

باب ہشتم

حصہ (۱)

لوہے اور قوت کی اہمیت اسلام کی نظر میں

مذاہب عالم میں صرف اسلام کو جو دین فطرت ہے یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ دین و دنیا کا جامع اور قوت و قانون دونوں کا حامل ہے۔ شنٹو مت جو جاپان کی اکثریت کا مذہب ہے۔ نہ اس میں دنیوی زندگی کے لیے کوئی جامع قانون موجود ہے اور نہ قوت اور نہ لوہے سے تیار کردہ آلات حرب کی طرف کوئی ترغیب پائی جاتی ہے اس کا سارا زور نفس کشی چلہ کشی اور دنیا بیزاری پر صرف ہوا ہے بلکہ اس میں حیات کو دکھ اور موت کو سکھ ثابت کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ یہی حال کنفیوشس ازم کا ہے۔ جو چین کی اکثریت کا مذہب ہے۔ نہ اس میں کوئی ضابطہ حیات ہے اور نہ جامع قانون زندگی ترک دنیا اور تجرد کی درویشانہ زندگی اس مذہب کی روح ہے۔ اسی طرح بدھ مذہب جس میں دھیان گیان کے سوا اور دنیا بیزاری کے سوا کچھ نہیں مسیحیت کی اصلی بنیاد عجز و خاکساری تجرد ترک دنیا اور ظلم سے چشم پوشی اور ترک مقابلہ پر مبنی ہے۔ انجیل میں ایک گال پر تھپڑ لگانے والے کے آگے دوسرے گال کو پیش کرنے کی تعلیم موجود ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ ان چار بڑے عالمی مذاہب میں نہ جامع قانون حیات موجود ہے نہ قوت کی تحصیل کی ترغیب پائی جاتی ہے۔ بلکہ یہ مذاہب ضعف کی حوصلہ افزائی کے حامل ہیں۔ اسلام چونکہ دین فطرت ہے اور جامع قانون حیات کا علمبردار ہے۔ اس لیے اسلام نے قوت کے اصل سرچشمے (لوہے) کی طرف بھی مسلمانوں کو توجہ دلائی اور فراہمی اسباب قوت کی فرضیت سے بھی ان کو آگاہ کیا۔ سرچشمہ قوت یعنی لوہے کی اہمیت کے متعلق قرآن میں لوہے کے نام سے ایک خاص سورت موجود ہے۔ کیونکہ قرآن میں یہ قاعدہ ہے کہ جس سورت میں متعدد مضامین ہوتے ہیں تو ان سب میں جو مضمون زیادہ اہم ہو۔ اس کے نام پر سورت کو

معنون کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید کے ستائیسویں پارہ میں ایک سورۃ کا نام حدید ہے۔ حدید لوہے کا نام ہے۔ یعنی لوہے کے ذکر پر مشتمل سورت ہے۔ پوری آیت یہ ہے۔ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ: ارشاد ہے کہ ہم نے واضح دلائل کے ساتھ رسولوں کو بھیجا اور ان کے ساتھ آسمانی کتاب اتاری اور انصاف کا ترازو (شریعت) بھی نازل کیا تاکہ تمام اقوام انصاف پر قائم رہیں اور ہم نے لوہے کو اتارا۔ جس میں ہولناک جنگ کا پورا سامان موجود ہے اور تمام اقوام کے لیے دیگر فائدہ مند سامان بھی موجود ہے اور یہ سب سامان اس لیے کیا کہ اللہ دیکھ لیں کہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عادلانہ قانون کی امداد بن دیکھے کون کرتا ہے۔ بے شک تمہارا خداوند تعالیٰ قوی اور غالب ہے۔ اس آیت میں پہلے تمام رسولوں اور پیغمبروں کی رسالت الٰہی کا مقصد بیان کیا ہے کہ وہ کتاب الٰہی اور شریعت، شریعت ربانی کا نزول ہے جس سے کرۂ ارض اور اقوام عالم کے لیے عالمی انصاف کا ایسا ایک معنوی ترازو پیش کیا گیا ہے کہ جو فعل وعمل اس ترازو پر درست ہو وہ عالمی انصاف کے مطابق ہے اور جس میں ذاتی یا قومی یا نسلی تفاوت اور کمی بیشی موجود ہو وہ ظالم ہے اور عالمی انصاف کے خلاف ہے۔ کیونکہ اس ترازو کا اتارنے والا رب العالمین ہے صرف رب المسلمین یا رب الاورپین یا رب الایشائین یا رب الامریکین نہیں۔ یہ ترازو یا شریعت آسمانی عالمی انصاف کا ربانی قانون ہے اور قانون انصاف پر جب تک عمل نہ ہو اور عالم میں وہ جاری نہ ہو، اس وقت تک انصاف ناممکن ہے۔ اس لیے ایسے عالمی انصاف کے لیے قانون عدل وامن کے ساتھ قوت کی بھی ضرورت ہے۔ اس لیے قرآن نے اعلان کیا کہ قانون انصاف کے لیے کہ تمام انسانوں اور اقوام عالم کو اسی عالمی انصاف کے قانون پر قائم کیا جائے اور اس کے آگے گردن نہاد ہونے کے لیے ان کو مجبور کیا جائے۔ اس قانون عدل کے لیے ضروری ہے کہ خداوند القدوس کے پیدا کردہ سرچشمہ قوت سے یعنی لوہے سے استفادہ کیا جائے۔ اس لیے قرآن نے اعلان کیا

کو ہم نے لوہے کو پیدا کیا کہ اس میں فوجی اور سول دونوں قسم کے فوائد موجود ہیں، تمام آلاتِ حرب رائفل سے لے کر ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم جنگ بنانے میں لوہے کی ضرورت ہے اور تمام بری بحری اور ہوائی آلات جنگ کی تخلیق لوہے سے وابستہ ہے۔ جس سے فوجی قوت اور اقامت عدل میں مدد ملتی ہے اسی طرح سامان جنگ کے دیگر مواد بارود وغیرہ خدا نے زمین میں پیدا کئے ہیں فوجی قوت کے ساتھ سول ضروریات کی فراہمی بھی ضروری ہے۔ وہ بھی لوہے سے وابستہ ہیں ہسپتالوں میں اوپریشن وغیرہ کے اوزار کاٹنے کے لیے چھری، چاقو مصنوعات کے جوڑنے کے لیے میخ وغیرہ قفل زنجیر گھڑیاں چھری کانٹے برتن ظروف اوزار تعمیر مکان اور ریلوے لائن کے گاڈر اور ریل گاڑی موٹر ٹرک کے اجزا بجلی کے تار وغیرہ لوہے کے وجود سے وابستہ ہیں جس کی طرف منافع للناس کہہ کر ترغیب دلائی گئی اور سامان جنگ کے بنانے کے لیے قید باس شدید کہہ کر بتایا کہ لوہے سے جنگ کا خطرناک سامان بنایا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو بالخصوص لوہے کی فوجی اور سول ضروریات کی فراہمی کی اہمیت کی طرف متوجہ کر دیا گیا۔ اس سے آگے چل کر مذکورہ آیت میں لوہے کے اسلحہ وساز وسامان کے استعمال کا صحیح محل بھی متعین کیا، تاکہ یہ سامان ظلم میں استعمال نہ ہو۔ عدل اور انصاف عالمی اور انسانی حقوق اور خدائی حقوق کے تحفظ کے لیے استعمال ہو۔ کیونکہ سرکاری سامان سرکاری کام میں استعمال ہونا چاہیے۔ ذاتی مقاصد میں استعمال نہ ہونا چاہیے۔ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ تاکہ اللہ تعالےٰ دیکھ لیں ان آلات کو بن دیکھے اللہ اور رسولوں کے قانون عدل میں کون استعمال کرتا ہے اور ان لوہے کے آلات سے کون خدا اور رسول کے منشاء عدل کی امداد کرتا ہے اور کون اللہ کے منشاء انصاف کے خلاف ان کو استعمال کرتا ہے۔ یعنی ان آلاتِ سرکاری کا استعمال بڑے سرکار خدا کے کام کے لیے ہونا چاہیے، نہ اس کے خلاف یعنی ان کے استعمال سے عدل قائم نہ ہو۔ ظلم ہو تحفظ حقوق انسانی ہو۔ نہ اتلاف و بربادی حقوق انسانی ایسی ایک نکتہ ہے جنگ عمومی اور جنگ مقدس یعنی جہاد کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ جنگ عمومی فساد و تخریب ہے

اور جہاد میں عالمی اصلاح اور تعمیر ہے بقول اقبال مرحوم سع

جنگ شاہانِ جہاں غارت گری است　　　　جنگ مومن سنت پیغمبری است

اس کی مثال ایسی ہے کہ ڈاکو بھی ہاتھ کاٹتا ہے اور ہسپتال میں ڈاکٹر بھی آپریشن کے ذریعہ ہاتھ کاٹتا ہے پہلا جنگ عمومی کی طرح تخریبی عمل ہے اور دوسرے جہاد کی طرح اصلاحی عمل ہے، پہلا عمل دُکھ پہنچانے کے لیے ہے اور دوسرا عمل دکھ ہٹانے کے لیے ہے اسی طرح جب کچھ عالمی عناصر ڈاکو کی طرح راہ عدل و انصاف میں حائل ہو کر روڑے اٹکاتے ہیں تو اسلام لوہے کے اوزار استعمال کرنے اور جہاد کا حکم دیتا ہے یہ عمل صورۃً ایک جیسا ہے۔ نتائج و آثار اور مقصد کے اعتبار سے دونوں میں فرق ہے آیت کے اخیر میں ان اللہ قوی عزیز کہہ کر اقوام عالم کو تنبیہ کی گئی کہ اگر لوہے و دیگر ذخائر ا ہلی سے تم نے آلات جنگ تیار کرکے اس کو خالق کائنات کے منشاء کے خلاف استعمال کیا، تو تم آزاد نہیں ہو، خالق عالم کے ید قدرت کے نیچے ہو اور وہ خالق سب سے قوی اور سب پر غالب ہے تم کو اس ظالمانہ استعمال کی سزا دے گا۔ کہ تم نے خداوند کریم کے سرکاری سامان کو اس کے منشاء کے خلاف کیوں استعمال کیا ہم نے گذشتہ دو جنگوں میں دیکھ لیا کہ ان آلات کے بے جا استعمال سے خود موجدین آلات کی جان و اموال و عمارات کو تباہ کر دیا گیا۔ اور باقی لوگ بحیثیت مجموعی امن میں رہے۔ اب تیسری جنگ کا انتظار ہے، جس سے ان ظالموں اور ان کی مددگاروں اور ان کی خدا بیزاروں اور مادہ پرستوں کی بڑی تعداد تباہ ہو کر راکھ ہو جائے گی اور باقی ماندہ انسانوں کا مستقبل بھی صدیوں تک تاریک گڑھے میں پڑ جائے گا۔

لوہا پگھلانے کی صنعت

لوہا اس وقت کارآمد ہو سکتا ہے کہ اس کو پگھلا دیا جائے حضرت داؤد علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے اپنے انعام و احسان کا ذکر ان الفاظ میں کیا والنالہ الحدید کہ ہم نے دست قدرت سے اس کے لیے لوہے کو نرم کر دیا تاکہ آگ میں تپانے اور کوٹنے کی تکلیف سے نجات پا جائے۔ اس آیت میں اگرچہ حضرت

داؤد علیہ السلام کے لیے لوہے کو نرم کرنا بطور خرق عادت تھا۔ لیکن قرآن شریف نے اس کو بشکل انعام الہٰی اور احسان خداوندی پیش کیا۔ جس سے یہ معلوم ہوا کہ ایسی صنعت اور تدبیر جس سے طبعی قوانین کے تحت لوہے کو پگھلا دیا جائے۔ یا نرم کیا، اللہ کا عظیم فضل و احسان ہے اور جو قوم اس فضل و انعام سے محروم ہو وہ بد قسمت ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ مسیحی اور دیگر غیر مسلم اقوام لوہے کو پگھلاتے اور اس سے آلات جنگ تیار کرنے کی وجہ سے آسمان عروج پر پہنچ گئیں ہیں۔ لیکن مسلمان اس سے محروم ہیں قرآن نے صرف لوہا پگھلانے پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ لوہے سے متعلق صنعت کی طرف بالخصوص جنگی آلات کی صنعت کی طرف مسلمانوں کو خصوصی توجہ دلائی۔ ارشاد ہوا۔

آیت دوم

وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِیْدَ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِی السَّرْدِ ہم نے داؤد علیہ السلام کے لیے لوہا نرم کیا اور کہہ دیا کہ بناؤ اس سے زرہیں سارے بدن پر پر پورے اور اس کے کڑیوں کو خاص اندازے پر رکھو، نہ اتنے باریک کہ جنگ کی ضرب سے ٹوٹ جائے نہ اتنے موٹے کہ بدن اس کے بوجھ سے دبا رہے۔ اسی طرح نہ اس قدر کشادہ کہ نیزہ وغیرہ کا اندر گھسنے سے روک ہی نہ سکے اور نہ اس قدر تنگ ہو کہ ہوا کی آمد و رفت بند کر دے۔ لوہے کی نرمی اور لوہے کی صنعت کو قرآن الکریم نے فضل الہٰی سے تعبیر کیا۔ وَلَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ہم نے داؤد علیہ السلام کو فضل سے نوازا۔ اس کے بعد وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِیْدَ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ کا تذکرہ کرکے لوہے کو نرم کرنا اور اس سے اوزار اور آلات حرب بنانے کو فضل الہٰی کی تشریح کے طور پر بیان کیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس قرآنی ہدایت کے باوجود سب اقوام سے زیادہ قرآن پر ایمان رکھنے والی قوم لوہے کی صنعت سے محروم ہے جس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کا زوال ترک قرآن کا نتیجہ ہے۔ لیکن بعض کج دماغ حضرات کو یورپ نے یہ باور کرایا ہے کہ تمہاری ذلت قرآن ہی کی وجہ سے ہے۔

لوہے سے آلات حرب و دیگر مصنوعات کی تیاری کا قرآنی حکم سورۂ انفال پارہ نمبر ۱۰ میں

۳۔ آیت سوم؛

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ

عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ

مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ

وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

اس آیت میں ارشاد ہے کہ دشمن کے مقابلہ کے لیے تمام اسباب قوت جس قدر تمہارے بس میں ہیں مہیا کرو اور خاص کر پلے ہوئے گھوڑے جو اس وقت ٹینک کا کام دیتے تھے تمہاری قوت اس قدر ہو کہ تمہارے موجودہ دشمن اور دوسرے دشمن جو تم کو اس وقت معلوم نہیں اور اللہ تعالےٰ کو معلوم ہیں اور جو کچھ تم اسلام کی سربلندی کے لیے مال خرچ کرو گے۔ تم کو اس کا پورا بدلہ ملے گا اور اس میں کوئی کمی نہ کی جائے گی اور اگر دشمن دب کر صلح کی طرف جھک جائے تو تم بھی صلح کی طرف جھک جاؤ اور کامیابی میں اعتماد اللہ پر رکھو۔ اللہ تعالےٰ تمہاری اور تمہارے دشمنوں کی تمام باتیں سنتا ہے اور تمام اعمال سے باخبر ہے۔ اس آیت میں مندرجہ ذیل امور کی طرف توجہ دلائی گئی۔

۱۔ مسلمانوں کے لیے اسباب قوت وغلبہ کی فراہمی کی فرضیت کا اعلان

۲۔ ان اسباب کی فراہمی کی عمومیت کا اعلان کہ جس زمانہ میں جن اسباب سے دشمن پر غلبہ حاصل ہو سکے، خواہ وہ ایٹم بم ہو۔ ہائیڈروجن بم ہو۔ یا جدید آلات حرب کی کوئی قسم ہو۔ اسی طرح مواصلات اور راشن فوجی لباس، خیمے وغیرہ زخمیوں کے لیے ہسپتال اور غذا کے لیے زرعی پیداوار کو ترقی دینا یا مالی حالت کو درست کرنے کے لیے تجارت وصنعت کو ترقی دینا ایمانی اور اخلاقی قوت کے اضافہ سے قبل بہادروں میں اضافہ کرنا۔ جدید جنگی فنون میں مہارت بحری، بری، ہوائی بیڑے کو ترقی دینا یہ سب امور لفظ قوت میں داخل ہیں۔ کیونکہ ان امور کی فراہمی سے قوت حاصل ہوتی ہے اور ان سے غفلت کرنے میں ضعف اور تباہی مضمر ہے۔ یہ سب امور لفظ قوت کی تشریح میں داخل ہیں۔ تو قوت حاصل کرنا اسلام میں فرض ہوا جس کے پیش نظر تمام شعبہائے ترقی قرآن

مجیدہ کی نظر میں فرض قرار پائے اور فرض بھی اس حد تک جہاں تک مسلمانوں کی بدنی اور مالی وسائل کی رسائی ہے۔

۳۔ اسلامی قوت اس قدر مضبوط ہو کہ اس وقت جو دشمن ہو اور آئندہ جو قوم دشمنی پر آمادہ ہو کر میدان مقابلہ میں آئے وہ سب اسلامی قوت سے مرعوب و مرہوب ہو جائے اور مقابلہ کی تاب نہ لا سکے۔

۴۔ ملتِ اسلامیہ کی سربلندی کے لیے مالی قربانی کی ضرورت ہے اور جو مال اس راہ میں صرف ہو اس کا پورا بدلہ اس دنیا میں اور آخرت میں بھی ملے گا۔ اور اس بدلہ میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی

۵۔ اگر دشمن صلح اور امن پر آمادہ ہو، تو اُن سے صلح کر لو۔ اور تم بھی صلح کی طرف جھک جاؤ کیونکہ اسلام کا مقصد جنگ نہیں بلکہ عدل کا غلبہ مقصود ہے۔ جو صلح سے بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ مغلوبانہ صلح نہ ہو۔ اور اس میں انصاف اور عدل اجتماعی ملحوظ ہو۔

آیت نمبر ۴

وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ يٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰی قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ سورہ ھود پارہ نمبر ۱۲۔ ہم نے قوم عاد کو ان کا بھائی حضرت ہود علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر بھیجا۔ آپ نے یہ پیغام دیا کہ اے میری قوم اللہ تعالٰی کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو۔ تم غیر اللہ کی پرستش میں اس کے سوا کچھ نہیں کرتے مگر اللہ پر جھوٹ باندھتے ہو۔ اے میری قوم اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو۔ اور اللہ کی طرف توبہ کر کے رجوع کرو جس کے نتیجہ میں اللہ تم کو دو نعمتیں عطا کر دے گا۔

۱۔ ایک یہ کہ خوب مینہ برسا کر تمہاری روزی فراخ کر دے گا۔

۲۔ دوم یہ کہ تمہاری موجودہ قوت میں اضافہ کر کے تم کو زیادہ قوی اور طاقت ور بنا دے گا اور تم حق سے مجرمانہ روگردانی نہ کرو۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایمان کا نتیجہ فراخی رزق اور معاشی خوشحالی ہے اور طاقت ور اور قوی اور غالب ہونا ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں اللہ تعالٰی کی

دو بڑی نعمتیں ہیں، آج مسلمان ان دونوں نعمتوں سے محروم ہیں نہ ان کو معاشی خوشحالی حاصل ہے نہ قوت اور غلبہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ایمانی قوت میں کمزوری واقع ہے اور یہ کمزوری یہ ہے نمبر۱ کہ ان کے پاس نہ دین کا علم و عمل ہے نہ دنیا کا اور قرآن نے کہا ہے۔ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ کیا علم سے بہرہ ور قوم اور جاہل قوم برابر ہو سکتی ہے قطعاً نہیں ہو سکتی نمبر۲ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا تم دین کی رسی کو مضبوط پکڑ کر ایک ہو جاؤ اور ایک دوسرے سے جدا نہ ہو اور فرقہ واریت مسلمانی اختیار کرو۔ خواہ نسل کے ذریعہ ہو یا جغرافیائی حد بندی کی وجہ سے ہو یا لسانی اور سیاسی نظریات کی وجہ سے ہو نمبر۳ وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ تم اپنی کوشش اور جدوجہد کی آخری حد تک ہر قسم کا سامان قوت تیار کرو۔ یہ تین اصول جو اسلام کے ہیں، ان پر دور حاضر کی غالب اقوام بالخصوص روس امریکہ چین کا عمل ہے۔ دنیوی اور سائنسی علوم میں جو در اصل مسلمانوں کے علوم تھے۔ دیگر اقوام سے فائق اور برتر ہیں۔ اتحاد و اتفاق میں بھی ان کو برتری حاصل ہے۔ جنگی اور ہر قسم کے سامان قوت میں اور میدان جدوجہد میں سب سے آگے ہیں لیکن مسلمانوں کے پاس نہ سائنس کا علم ہے نہ وہ کسی چیز کے موجد ہیں نہ ان میں اتفاق و اتحاد ہے اور نہ سامان قوت کی فراہمی کے لیے ان میں جدوجہد کی تڑپ ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس دُنیا میں بھی غلبہ اور قوت کے لیے جو ضابطہ ہے وہ اسلامی تعلیم کے تین یہ اصول ہیں جو قوم ان کو پائے گی وہ غالب اور قوی رہے گی۔ خواہ اس قوم کی تہذیب و زبان، انگریزی ہو یا روسی و چینی اور جو قوم اُن کو چھوڑ دے گی ضعیف اور کمزور ہو گی۔ خواہ اس کا کوئی مذہب کوئی زبان اور کوئی تہذیب ہو۔ لہذا قوت اور غلبہ حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں کو اپنی تہذیب و زبان بدلنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ترمیم مذہب کی ضرورت ہے بلکہ ان کو اپنے مقدس اور فطری دین کے ان تین اصول کو اپنانے کی ضرورت ہے۔ جس کی وجہ سے غیر مسلم اقوام ترقی کے آسمان پر چڑھ گئی ہیں۔

آیت نمبر ۵ سورۂ ہود پارہ نمبر ۱۲ میں ارشاد ہے إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيزُ

اسلام اور قرآن نے مسلمانوں کو یہ تصور بخشا ہے کہ خداوند تعالیٰ کی صفات و کمالات کے متعلق جس نے تصور قائم کیا۔ وہ سب کمالات کا ایک بہترین نمونہ اور ان کمالات کا نمونہ مسلمان کو اپنے اندر پیدا کرنا چاہیئے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے المقصد الاسنیٰ فی شرح اسماء الحسنیٰ میں تخلقوا باخلاق اللہ کے تحت کہ الٰہی اخلاق اور اوصاف کا نمونہ اپنے اندر کسی نہ کسی درجہ میں پیدا کر کے اللہ تعالیٰ سے مناسبت اور قرب پیدا کرنے کا مضمون تفصیل سے بیان کیا ہے جو قوم ان کمالات کا نمونہ اپنے اندر رکھتی ہے وہ کامیاب ہے۔ اگر ایمان بھی ہو تو مکمل کامیابی ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی کہ مومن اللہ کا وصف ہے السّلام المؤمن قرآن میں سورہ حشر میں موجود ہے اور اگر ایمان نہ ہو تو صرف دنیوی کامیابی اس کو نصیب ہوگی۔ اُخروی نہیں ان اوصاف و کمالات الٰہیہ میں سے دو کمال آیت مندرجہ بالا مذکور ہیں یعنی نمبر ا قوی یعنی اللہ قوت والا ہے دوم عزیز یعنی اللہ غالب ہے کمزور نہیں دو دیگر کمالات دیگر آیات میں مذکور ہیں نمبر ۳ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ یعنی اللہ کو ہر چیز کا علم حاصل ہے اللہ نمبر ۴ صانع ہے۔ صنع اللہ الذی کل شیء - کائنات اللہ کی تخلیق و صنعت جس سے پوری حکمت کے ساتھ ہر چیز کو درست کیا ہے۔ آج ان چاروں کمالات کے نمونے سے مسلمان قوم خالی ہے نہ قوت ہے۔ نہ غلبہ، نہ علم، نہ صنعت لیکن دیگر اقوام میں کسی نہ کسی درجہ میں یہ امور موجود ہیں۔ جامع صغیر میں شیخ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث نقل کی ہے۔ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُؤْمِنَ الْقَوِيَّ خدا پسند کرتا ہے قوی ایماندار فرد و جماعت کو جس سے معلوم ہوا کہ جو فرد یا جماعت ایمان سے موصوف ہو اور قوی ہو وہ اللہ کی محبوب ہے۔ اللہ کا محبوب ہونا کتنی بڑی نعمت ہے۔

جنگ کے فلسفہ کے تحت لوہے اور قوت کی ضرورت

تین اسباب ایسے ہیں جن سے جنگ فطرتاً ناگزیر معلوم ہوتی ہے۔ اولاً معاشی ضروریات کی جاذبیت۔ انسان شخصی طور پر تین چیزوں کا محتاج ہے نمبر ا خوراک جس میں ہر قسم کی خوردنی چیزیں بھی داخل ہیں نمبر ۲ پوشاک جس میں ہر قسم کے پہننے کی

چیزیں داخل ہیں مسکن بمبر ۳ جس میں رہائش کے لیے ہر قسم کی عمارات داخل ہیں۔ ہر شخص کی ذاتی زندگی ان امور کے بغیر نامکمل ہے اور یہ تینوں چیزیں زمین سے وابستہ ہیں۔ خوراک پانی، اونی ریشمی کپڑا، عمارات کی لکڑی گارڈر، چونہ، سیمنٹ سب زمین سے پیدا ہوتے ہیں۔ چونکہ انسان پر موت مسلط ہے۔ اس لیے نوع انسانی کی بقاء کے لیے یہ ضروری ہے کہ فوت شدہ انسانوں سے عالم بشری میں جو کمی واقع ہو۔ اس کو توالد تناسل کے ذریعہ پورا کیا جائے تاکہ نسل انسانی منقطع نہ ہو۔ اس لیے انسان کے لیے ان تین شخصی ضروریات کے علاوہ ایک چوتھی نوعی ضرورت کا سامان بھی ضروری یعنی منکوحہ بیوی تاکہ اس کے ذریعے اولاد پیدا ہو کر نسل قائم رہے۔ ان چاروں چیزوں کی طرف انسان میں طبعی میلان موجود ہے اور انسان کا ہر فرد و جماعت جد وجہد میں مصروف ہے کہ اپنی خداداد طبعی میلان اور قوت نزوعیہ کے ذریعہ ان مذکورہ فوائد کو حاصل کرے۔ اور ان کو اپنے لیے مختص کر دے۔ یہی فوائد چونکہ سب انسانوں کو مشترک مطلوب ہیں۔ اس لیے ہر کوئی اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس لیے ان میں مذکورہ فوائد کی تحصیل کے لیے کش مکش منازعت مخاصمت پیدا ہو گی۔ جس سے ہر فرد دوسرے کو ہٹانے اور خود قابض ہونے کی سعی کرے گا۔ اس سعی کے لیے قدرت نے انسان میں ایک اندرونی قوت مدافعت یعنی قوت غضبیہ رکھی ہے۔ جس کے استعمال سے افراد و اقوام میں جنگ ناگزیر ہو گی۔ جنگ کی کامیابی کے لیے لوہے کے اوزار کے ذریعہ قوت حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس لیے لوہے کے استعمال کے لیے اقوام عالم میں تقابلی دوڑ شروع ہو گی۔ جو قوم لوہے کی قوت سے زیادہ استفادہ کرے گی۔ وہی سب سے زیادہ کامیاب ہو گی۔

(حصہ ب)

روزے کا فلسفہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ۔

اے ایمان والو تم پر روزے فرض کئے گئے، جس طرح پچھلی اُمتوں پر فرض کئے گئے تھے تاکہ تم پرہیز گار (خدا سے ڈرنے والے) بن جاؤ۔

برادرانِ اسلام! آج میں ایک شاہی فرمان یا حکم یعنی فرضیت روزہ کا فلسفہ بیان کرتا ہوں شہنشاہی حکم ہے چاہے دنیا روزہ رکھے یا نہ رکھے حکم کو ذرہ بھر نقصان پہنچتا ہے نہ حاکم کو اور نہ روزہ رکھنے میں حاکم کا فائدہ ہے۔ اگر فائدہ ہے تو بھی روزہ رکھنے والے کا ہے، اور اگر نقصان ہے تو بھی اپنا ہے۔ اللہ تعالیٰ حکیم ہے، یہ کارخانۂ کائنات اس کی حکمت کا گواہ ہے سائنس کیا چیز ہے۔ قدرت کے قوانین کا جاننا ہر کام میں اس کی حکمت یقینی ہے۔ اور بعض جگہ قرآن نے اسے بیان بھی کیا ہے۔ لیکن بنیادی طور پر بندہ کے لیے اپنا عمل اس کے حکمت اور فائدہ جاننے پر موقوف نہیں کرنا چاہیئے مثلاً آج اگر ایک افسر نوکر کو کہے کہ فلاں فائل لاؤ اور جواب میں نوکر کہے کہ اس فائل کے لانے میں فلسفہ اور حکمت کیا ہے تو وہ افسر اس وقت اس نوکر کو برخاست کر دے گا۔

اگر ایک معمولی افسر جو اللہ کے مقابلہ میں ایک ذرہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتا، اس سے حکمت نہیں پوچھی جا سکتی تو اللہ کے احکام میں کیونکر حکمتیں تلاش کرتے پھریں۔ دوئم یہ اگر انسانی عقل کسی حکم کی حکمت بتلا بھی دے، تو حکمت سے حکم کی عظمت ختم ہو جاتی ہے اور جب حکم اپنی شان پر قائم رہتا ہے تو اسکی عظمت بھی باقی رہتی ہے۔ اور پھر اللہ کی حکمتیں بھی کروڑوں ہیں۔ انسانی علم میں تو صرف ایک آدھ آئے گی، تو پھر بھی حکم کی عظمت کو نقصان پہنچا جس

طرح اسباب زندگی کا ایک اہم سبب آفتاب ہے، اسی طرح روحانی زندگی کے لیے سبب قرآن ہے۔ نہ سورج میں ترمیم ہوسکتی ہے نہ قرآن میں ترمیم ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں وقتی بنائی ہیں وہ ختم ہوجاتی ہیں۔ اور جو دوامی بنائی ہیں وہ اپنے دوام پر قائم و دائم رہتی ہیں۔ جس طرح آفتاب و ماہتاب کو قدامت کی وجہ سے چھوڑا نہیں جاسکتا۔ اس طرح قرآن اور اس کے احکام ہر دم تازہ اور ابدی ہیں۔

ارکانِ اسلام

اسلام کے پانچ رکن ہیں یعنی اسلام کی ہیئت ترکیبی پانچ اجزا سے مرکب ہے، جن میں سے ایک روزہ ہے، انسان بھی پانچ اجزا سے مرکب ہے جگر، دل، معدہ، دماغ اور روح جو شخصی زندگی میں ایک بنیادی چیز ہے، اور اسی طرح ملی زندگی یعنی اسلام میں بھی بنیادی چیز کلمۂ شہادت یعنی لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے، اگر یہ جزو مکمل نہیں تو کچھ بھی باقی نہیں۔

روزے کا معنیٰ

اسلام سے پہلے صوم کا معنیٰ صرف بندش اور رو کنے کا تھا۔ مثلاً جو گھوڑا گھاس نہیں کھاتا تھا اسے صائم کہتے تھے۔ پھر اسلام نے ایک خاص ہیئت کے ساتھ خاص زمانے میں نیت کے ساتھ چند خواہشات کی بندش کا نام روزہ رکھا روزہ ایک عمل ہے، ہمارے اندر ایمانی مشینری تب گرم ہوگی کہ روزہ کے ذریعہ روحانی قوتوں کو غالب کیا جاسکے اور حیوانی قوت مغلوب ہو۔ روزے کا ایک محرک ہے اور دوسرا اس کا ثمرہ یعنی نتیجہ، اس آیت کریمہ سے دونوں معلوم ہوتے ہیں۔ روزے کا سب سے بڑا محرک ایمان ہے اس لیے آغاز اس سے ہوا کہ۔ یاایھا الذین اٰمنوا (اے ایمان والو) اور ہر عمل کے لیے حقیقت میں ایمان ہی محرک ہوتا ہے

کسان ہل جوتتا ہے، بیج ڈالتا ہے۔ یہ مسلسل عمل اس ایمان اور یقین کی وجہ سے کرتا ہے کہ فائدہ حاصل ہوگا۔ غرض کائنات کی ہر قربانی اور محنت کا سبب وہ ایمان اور یقین ہوتا ہے جو اس عمل کے نتائج کے بارہ میں ہو۔ اسی طرح کسی کام کا محرک کبھی کبھی حکم حاکم بھی ہوتا ہے۔

رعایا حاکم اعلیٰ کے حکم پر چلتی ہے، تو حکم حاکم بھی ایک چیز ہے، ورنہ حکم نہ ماننے پر آدمی باغی بنتا ہے۔

حکومتوں کے احکام دو طریقوں پر صادر ہوتے ہیں، کبھی تحریری اور کبھی تقریری تو روزے کا دوسرا محرک قرآن نے حکم حاکم بتایا، فرمایا کہ کُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (تم پر روزوں کی فرضیت لکھی گئی ہے گویا سرکاری گزٹ میں اس کا اندراج ہوا ہے۔ تحریری آرڈر ہے، اور عموماً تحریری آرڈر زبانی آرڈر سے سخت ہوتا ہے۔ پھر حکم کی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک خصوصی اور ایک عمومی خصوصی حکم وہ ہوتا ہے جو کسی ایک ضلع یا صوبہ کے لیے ہو اور عمومی حکم وہ ہوتا ہے جو بین الاقوامی یا انٹرنیشنل ہو، تو روزے کے متعلق فرمایا کہ یہ ایک بین الاقوامی فریضہ ہے، اور تمام اقوام پر فرض کیا گیا ہے۔ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ (جیسے تم سے پہلے اُمتوں پر فرض کیا گیا ہے)، اس سے آگے ثمرہ اور نتیجہ کا بیان ہے کہ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (تاکہ تم پرہیز گار ہو جاؤ)

ایک ہے تعمیرِ فرد اور ایک ہے تعمیرِ ملت۔ مثلاً ایک مشین تب صحیح کام کرے گی کہ اس کا ہر ایک پرزہ ٹھیک ہو، دوم یہ کہ پوری مشین کا ہر ایک پرزہ ٹھیک جگہ پر فٹ بھی ہو۔ اسلام ایک اجتماعی نظام ہے اور ہر مسلمان اس کا ایک پرزہ ہے۔ ملت کی اصلاح کے لیے پہلے فرد کی تعمیر ضروری ہے، تاکہ وہ ملی نظام کے لیے درست پرزہ بن سکے۔ اس کے بعد ملی نظام ہے کہ ایک شخص کو ٹھیک جگہ پر ملت میں فٹ کیا جائے اور اگر تنظیم نہ ہو تو کام بگڑ جائے گا۔ مشرق و مغرب کے تمام ماہرینِ نفسیات متفق ہیں کہ فرد کے صالح اور کامل ہونے کے لیے بنیادی چیز یہ ہے کہ خواہشات پر حاکم ہو۔ لذتوں کا غلام اور محکوم نہ ہو۔ لذت بذاتِ خود مقصود نہیں۔ روزانہ آپ دیکھتے ہیں کہ لذت سے مغلوب ہونا نقصان دہ اور اس پر قابو پانا فائدہ مند ہوتا ہے۔ آج دنیا میں کتنے لوگ مریض ہوں گے جنہیں ڈاکٹروں نے کتنی چیزوں سے منع کیا ہوگا؟ اب اگر مریض لذت کا محکوم ہو تو یہ مریض بگڑ جائے گا، (بلکہ مر جائے گا) آج تم دیکھتے ہو کہ بڑی بڑی

عدالتیں مجرموں کے لیے بنی ہیں۔ چور کہتا ہے مجھے چوری میں، ڈاکو کہتا ہے مجھے ڈاکہ زنی میں زانی کہتا ہے مجھے زنا میں لذت ہے تو اگر اپنی اپنی لذت کے مطابق چلنے کی آزادی ہو تو یہ تمام عدالتیں وغیرہ ختم ہو جائیں غرض یہ کہ تعمیر فرد کے لیے بنیادی چیز خواہشات اور لذتوں کو قبضہ میں لانا ہے۔ مگر لذت پر حکومت کے لیے اس سے اعلیٰ لذت کا تصور ضروری ہوتا ہے مریض جو لذیذ چیزوں سے پرہیز کرتا ہے اور ایم۔اے تک جو طلبہ مشکلات برداشت کرتے ہیں، تو یہ صرف اعلیٰ لذت صحت اور عہدہ و ملازمت وغیرہ کی خاطر چھوٹی لذتیں قربان کر دیتے ہیں ادنیٰ لذت اعلیٰ لذت پر قربان کی جائے۔ تب کامیابی ہوتی ہے: لذت کی کئی اقسام ہیں۔ ۱۔لذت مادی ۲۔لذت حسی یعنی وجدانی ۳۔لذت اُخروی ۴۔لذت الٰہی۔

لذت مادی وہ ہے جو آج کل انگریز اور یورپین اقوام کے تمام تعلیم و ترقی کا آخری نقطہ نگاہ ہے۔ اور اس کی کئی قسمیں ہیں۔ زبان کی لذت کھانا پینا۔ کان کی لذت اچھی آواز سننا۔ ناک کی لذت اچھی چیزیں سونگھنا وغیرہ مگر بقول حجۃ الاسلام امام غزالیؒ لذت کی ان اقسام میں انسان کے ساتھ تمام حیوانات بھی شریک ہیں، کیا کیڑا نہیں کھاتا، مکھی نہیں کھاتی، وہ جماع نہیں کرتے؟ یقیناً کرتے ہیں۔ اگر مقصد صرف اچھی لذتوں کا حاصل کرنا ہوتا تو عجیب بات ہے کہ ایک کیڑا اور امریکی یا روسی صدر اس میں برابر ہیں۔ انسان کی ایک خواہش غلبہ پانے کی ہوتی ہے۔ اور بقول امام غزالیؒ اگرچہ اکثر حیوان انسان کے ساتھ اس خواہش میں شریک نہیں۔ مگر بعض حیوانات پھر بھی شریک ہیں، جیسے انسان بادشاہ ہوتا ہے۔ اسی طرح شیر بھی بادشاہِ جنگل ہے جنگل کا بادشاہ جو حکم کرتا ہے، مانا جاتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ انسانی بادشاہ ووٹوں کے ذریعہ بادشاہ بنتا ہے اور شیر کے لیے ووٹوں کی بھی ضرورت نہیں۔ بغیر ووٹ اور انتخابات کے بادشاہ ہے۔

تو امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ یہ بھی انسان کا امتیازی مقام نہ ہوا۔ حیوان بھی اس میں شریک ہیں۔ دوسری لذت ہے لذت اُخروی، اس میں چند چیزیں ہیں، ایک دوام یعنی پائیداری دنیاوی لذتوں میں دوام نہیں۔ آخرت باقی چیز ہے تو اس کی تمام چیزوں میں بھی بقاء کی شان

ہے اور دنیا فانی ہے۔ تو ہر چیز میں نشانِ فنا ہے۔ جب دنیا میں ایک آدمی بھوکا ہوتا ہے
تو سیر ہو جانے کے بعد اگر اسے بہتر سے بہتر کھانا بھی پیش کیا جائے تو وہ نہیں کھا سکتا۔ نیز یہاں
کسی اعلیٰ چیز کے کھانے کی لذت صرف ایک دو سیکنڈ تک رہتی ہے۔ جب تک وہ چیز زبان
پر رہے۔ نگلنے کے بعد اور نگلنے سے پہلے کوئی لذت نہیں ہوتی بخلافِ جنت کے کھانوں کے
کہ اگر لاکھوں چیزیں کھائیں تو طبیعت سیر نہ ہوگی اور اس کا مزہ بھی باقی رہے گا۔
اکلہا دائم جنت میں تو عطا غیر مجذوذ نہ ختم ہونے والی بخشش ہے۔ آخری
مزہ جس کا نام میں نے وجدانی لذت رکھا ہے، امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ آدمی جب شطرنج
کھیلتا ہے۔ لبا اوقات دن گذر جاتا ہے اور کھانا یاد ہی نہیں رہتا۔ کھانے کی لذت حقیقی لذت
پر قربان ہو جاتی ہے۔ یعنی ایک وجدانی لذت دوسری وجدانی پر قربان ہوتی ہے اور روزہ
سے یہ دونوں لذتیں لذتِ آخرت پر قربان ہو جاتی ہیں۔

بھائیو! لذتِ حسیہ کو قربان کرو۔ صحابہ کرام سے لیکر آج تک کتنے مسلمانوں نے
جہاد کیا ہوگا۔ جہاد میں مال و جان قربان کرنا ہوتا ہے اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ
اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (اللہ تعالےٰ مومنین کی جان و مال جنت کے
بدلے خریدتا ہے) ہمارے جہاد کی تاریخ اس کی گواہ ہے کہ کتنے مسلمانوں نے لذتِ اخروی
کے لیے کتنی حسی لذتوں کو ٹھکرا دیا۔ اکبر الٰہ آبادی نے کیا خوب کہا ہے۔ ؏

جسے مرنا نہیں آتا اسے جینا نہیں آتا

حضورؐ کے زمانہ میں صحابہؓ موت کی تمنا بہت کرتے۔ کیونکہ وہ لذتِ اُخروی کے عاشق
تھے۔ حتیٰ کہ حضورؐ نے فرمایا کہ موت کی تمنا مت کرو۔ یہ دُعا کرو کہ اے اللہ اگر ہمارے لیے زندگی
بہتر ہو تو زندہ رکھ اور اگر مرنا بہتر ہو تو بھی آپ کی مرضی

حصہ ج

حج بیت اللہ پر ایک نفسیاتی، عمرانی اور سیاسی نظر

اسلامی عبادات میں حج بیت اللہ ایک ایسی عبادت ہے کہ مستشرقین یورپ نے سب سے زیادہ اعتراض کا مورد اسی کو بنایا ہے۔ درحقیقت مستشرقین کی استشراقی سرگرمیوں کا محوری نکتہ اور مقصد علمی تحقیق کم اور اعتراضی پہلو زیادہ ہوتا ہے، جس سے ان کا مقصود مسلمانوں کے قلوب سے اسلامی عبادات کی عظمت کو ختم کرنا ہے۔ اس لحاظ سے یہ تحریک علمی کم اور سیاسی زیادہ ہے۔ اسی لیے انہوں نے زبان وقلم دونوں سے اس پروپیگنڈہ کو زور شور سے پھیلایا کہ اسلامی عبادات میں حج ایک نامعقول فعل وعمل ہے۔ اسلام کے متعلق مسیحیوں کی یہ دریدہ دہنی صلیبی جنگوں سے بہت پہلے شروع ہو چکی تھی، لیکن دورِ حاضر میں مخصوص مصلحت اندیشیوں کے تحت اس فتنہ نے استشراق کا علمی لبادہ پہن لیا، تاکہ زیادہ جاذب توجہ ہو سکے۔ صلیبی جنگوں سے بہت پہلے شام کے ایک نابینا شاعر اسی فتنہ سے متاثر ہو کر طنزاً کہہ چکا ہے۔

وَقوم اَتَوا مِن اَقاصی البلاد — لرمی الجمار ولثم الحجر

فوا عجبًا من مقالاتهم — ایعمی عن الحق کل البشر

"مسلمان قوم دور دراز ممالک سے سنگریزوں کے پھینکنے اور حجر اسود کو بوسہ دینے کے لیے آتی ہے، اور اس وقت جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ قابلِ تعجب ہے۔ کیا حق سے ساری دُنیا اندھی ہو چکی ہے۔"

یہ شاعر ابو العلاء المعری ہے، جس کی ولادت ۳۶۳ھ اور وفات ۴۴۹ھ کو ہوئی ہے۔ اس سے اس فتنہ کی قدامت ثابت ہوتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی عبادات میں

حج چونکہ سب سے زیادہ بین الاقوامی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کو مسیحیوں کا سیاسی مزاج برداشت نہیں کر سکتا تھا اس لیے سارا زورِ قلم انہوں نے اسی کے خلاف صرف کیا۔ جس طرح جہاد کو انہوں نے ہدفِ طعن بنایا تھا۔ جس کا ان کے مقلد مسلمانوں پر یہ اثر پڑا کہ وہ اس کے نام لینے سے بھی شرمانے لگے، اور اسلام کی اس عظیم طاقت کو انہوں نے تاویلات کے شکنجے میں جکڑ کر اس کی اصل روح کو ختم کر دیا۔

حج اور جہاد اسلام کی وہ زبردست دو طاقتیں ہیں، جو مسیحی اقوام کے سیاسی مزاج کے لیے خطرہ ہیں، وہ مسلمانوں کی رگِ حیات کو خوب جانتے ہیں، اس لیے وہ اسی مقام پر اپنا نشترِ اعتراض چبھو دیتے ہیں، جس سے وہ ہماری حیاتِ ملی کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔ اس لیے میں نے ضروری سمجھا کہ فلسفۂ حج کے متعلق کچھ ضروری امور بیان کر دوں تاکہ اس قسم کی غلط اندیشیوں کا خاتمہ ہو اور اصلی حقیقت کسی حد تک سامنے آ جائے۔

مقامِ حج

حج کی اہمیت کے پیشِ نظر کتاب و سنت نے اس کو اسلامی زندگی کا اہم جزو قرار دیا ہے۔ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ۔ (القرآن) ترجمہ: "اللہ کی طرف سے لوگوں پر ایک خاص گھر کا حج فرض ہے جس کو وہاں پہنچ جانے کی طاقت ہو، اور جو کفر اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ سارے جہانوں سے بے نیاز ہے۔"

اس آیت میں فرضیتِ حج کے ساتھ ساتھ ترکِ حج کے لیے ایسی شدید تعبیر اختیار کی گئی جس نے اسلامی زندگی کے لیے حج کو بہت ضروری قرار دیا۔ یعنی ترکِ حج کے لیے وَمَنْ لَمْ يَحُجَّ یعنی جو کوئی حج نہ کرے یہ تعبیر اختیار نہیں کی گئی بلکہ اس کی بجائے یوں فرمایا۔ وَمَنْ كَفَرَ یعنی جو کفر اختیار کرے جس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ استطاعت کے باوجود ترکِ حج ایک کافرانہ فعل ہے، مومنانہ نہیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ حج اور ایمان میں کس قدر شدید تعلق ہے۔

ابوامامہ سے مسند امام احمد میں روایت ہے کہ جو مسلمان مر جائے اور بلا عذر حج ترک کر دے تو

وہ یہودی اور نصرانی کی موت مرتا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یہ دو گروہ حج کے خلاف ہیں، کیونکہ مشرکین عرب قبل از اسلام بھی حج کرتے تھے۔

روح المعانی میں صحیح سند کے ساتھ فاروق اعظم کا ایک فرمان منقول ہے کہ میرا ارادہ ہے کہ مسلمانوں کے شہروں میں اپنے عامل اور کارندے بھیج دوں تاکہ جو مسلمان استطاعت کے باوجود حج نہ کرتا ہو ان پر جزیہ لگائے، کیونکہ وہ مسلمان نہیں۔

اس سے حج کا مقام بخوبی سمجھ میں آگیا ہوگا، اب حج کا تعلق چونکہ بیت اللہ اور خانہ کعبہ سے ہے، اس لیے حقیقت کعبہ کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں تاکہ بیت اللہ اور خانہ کعبہ کے متعلق صحیح اسلامی تصور ذہن میں جم جائے۔

حقیقت کعبہ

آگے چل کر ہم بیان کریں گے کہ محبت الٰہی جو فطرت انسانی میں داخل ہے اس کی تکمیل اور تشنگی بجھانے کے لیے ایک مرکز کا ہونا ضروری ہے تاکہ وہ تصور محبت کے لیے ایک ٹھکانہ ہو۔ اس مرکزیت کے انتخاب کے لیے اسلام نے ضروری سمجھا کہ وہ مرکز مظہر تجلی الٰہی تو ضرور رہو، لیکن بت یا بت کا مشابہ اور مماثل نہ ہو، تاکہ خدا پرستی بت پرستی کی شکل اختیار نہ کرنے پائے اور اسلامی توحید صنمیت (بت پرستی) سے آلودہ نہ ہو اور ذات حق کی شان تنزیہی قائم رہے۔

علم الاصنام سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ تاریخ بشریت کے آغاز سے اللہ کے سوا جن اشیاء کو اب تک معبود بنایا گیا ہے وہ ایسی چیزیں تھیں، جن میں مندرجہ ذیل خصوصیات موجود تھیں۔

۱۔ مبصریت یعنی نظر آنے والی چیز۔ ۲۔ لونیت یعنی رنگدار ہونا۔ ۳۔ کثافت یعنی ایسا جسم ہونا جو لطیف اور غیر مرئی نہ ہو۔

زمینی بت اور آسمانی سیارے سب اسی دائرے کی چیزیں ہیں کہ نظر بھی آتی ہیں۔ رنگدار بھی ہیں اور غیر مرئی بھی ہیں

اسلام نے مرکز محبت کے لیے ایسی چیز کا انتخاب کیا ہے، جو بتوں سے ان تین خصوصیات میں بالکل جدا اور مباین ہے۔ اور وہی چیز حقیقت کعبہ ہے۔ یعنی خانہ کعبہ کی چار دیواری کے درمیان جو فضا ہے اور جو اُوپر کو غیر محدود مقام تک چلی گئی ہے۔ وہی حقیقت کعبہ ہے۔ باقی چھت اور چار دیواری اس فضا کی تعیین کے لیے کھینچی گئی ہے تاکہ تجلی گاہ الہٰی کی یہ فضا دوسری فضا سے مخلوط نہ ہونے پائے یہی وجہ ہے کہ خود اسلامی دور میں عبد اللہ بن زبیرؓ نے تعمیر کعبہ کے سلسلہ میں پرانی دیواریں اور چھت گرائی اور از سرِ نو خانہ کعبہ کو تعمیر کیا۔ اسی طرح اس کے بعد حجاج ابن یوسف الثقفی نے خلیفہ عبد الملک کے حکم سے ابن زبیر کے بنا کردہ خانہ کعبہ کو گرایا اور نئے سرے سے خانہ کعبہ کی تعمیر کی۔ ان دو واقعوں کے دوران چھت اور چار دیواری باقی نہ رہی، لیکن مسلمانوں نے قبلہ رخ ادائیگی نماز کو اسی طرح جاری رکھا۔ اور نماز کو ملتوی کرنے کا کوئی اعلان نہیں کیا گیا، جو اس امر کی دلیل ہے کہ عمارت گرا دینے کے باوجود حقیقی کعبہ باقی تھا جو فضائے کعبہ ہے اس کے علاوہ ہم ابو قبیس یا قیقعان پہاڑ پر نماز پڑھ سکتے ہیں۔ جو خانہ کعبہ کی چھت سے بہت بلند ہے۔ اس لیے ان پہاڑوں کی چوٹی پر جو نمازی ہو تو اس کے بالمقابل عمارت کعبہ سامنے نہیں آتی۔ بلکہ کعبہ کی چار دیواری اور چھت نیچے رہ جاتی ہے اس کے علاوہ زمین گول ہے۔ لہٰذا دور علاقے کا اگر کوئی آدمی ہموار زمین پر بھی نماز پڑھے تو کعبہ کی عمارت سامنے نہ ہوگی لیکن کعبہ کی دیواروں کے درمیان گھری ہوئی فضا جو آسمانوں تک گئی ہے وہ ہر حال میں سامنے رہے گی اور یہی فضا حقیقی کعبہ ہے چھت کا ڈالنا بالائی تحدید کے لیے نہیں بلکہ اس لیے ہے تاکہ دیواروں کی حفاظت ہو۔ اس پر ہوائی جہاز کی نماز کو قیاس کرو، کہ اس میں سمت قبلہ کو اگرچہ عمارت موجود نہیں لیکن فضا ضرور موجود ہے جو حقیقی کعبہ ہے۔ ان وجوہات سے حقیقی کعبہ کا اسلامی تصور واضح ہو گیا۔

مرکزیت محبت کے لیے فضا کا انتخاب

جب یہ معلوم ہوا کہ حقیقی کعبہ بیت اللہ کی متعین فضا ہے اور فضا بھی ایک ایسی چیز

ہے جو بت پرستانہ خصوصیات سے پاک ہے فضا میں نہ صورت ہے کیونکہ فضا نظر نہیں آتی، نہ کثافت ہے بلکہ لطافت ہے

اور نہ تزئین یعنی رنگ ہے یہی وجہ ہے اگر آج تک کسی قوم نے فضا یا ہوا کی عبادت نہیں

کی۔ اس انتخاب میں ایک طرف فطرتِ انسانی کا لحاظ ہے کہ اس کے تصورِ محبت کے لیے ایک

معین ٹھکانہ ہو، اور دوسری طرف ذاتِ حق اور محبوبِ حقیقی سے بھی ایک درجہ میں

مناسبت ہے کہ رنگدار اور کثیف نہ ہونے کی وجہ سے لاتدرکہ الابصار (کہ اسے آنکھیں

نہیں دیکھتیں) کا مصداق ہے۔

مناسکِ حج اور افعالِ حج کو چونکہ اسی حقیقی کعبہ سے تعلق ہے۔ لہذا ہم اسلام کے

اس عظیم رکن حج کا فلسفہ اور اس کے اسرار و حکم اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں تاکہ ذہن

میں حج کی معقولیت کا تصور جم جائے۔

پہلی حکمت

انسان کائناتِ عالم کی ایک شریف ترین ہستی ہے۔ اور اس کی فطرت میں مخصوص محبت داخل ہے، جس کا نام محبتِ لطیفہ ہے۔ محبت اگر مادی

ہے ہو تو وہ محبت کثیفہ ہے۔ اس میں حیوان اور انسان مشترک ہیں کیونکہ انسان بھی حیوانات کی طرح

ایک جسم مادی رکھتا ہے تو حیوانات کے ساتھ اس وصف میں اس کا اشتراک لازمی ہے حیوان کو کھانے

کی چیزوں سے محبت ہے، پینے سے محبت ہے، نر و مادہ میں باہمی محبت ہے، اولاد سے محبت ہے،

ان ساری محبتوں میں انسان ان کا شریک ہے اور اسی کا نام محبتِ کثیفہ ہے۔

محبت کی دوسری قسم محبتِ لطیفہ ہے جو صرف انسانی خصوصیت ہے۔ اور روحِ انسانی

کی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ لطیف اور نامحسوس اشیاء سے محبت کرتی ہے۔ مثلاً انسان کو خود اپنی

روح سے محبت ہے علم سے محبت ہے، اپنی بصارت یعنی قوتِ بینائی سے محبت ہے۔ اور یہ سب

چیزیں لطیف اور ماوراء الحس ہیں۔

محبت لطیفہ کی اعلیٰ قسم

محبتِ لطیفہ کی اعلیٰ قسم خداوند تعالیٰ کی محبت ہے کیونکہ محبوب سب سے اعلیٰ ہے اور یہ محبت بھی فطرت

انسانی میں داخل ہے انسان نے تاریخ کے ہر دور میں اللہ تعالیٰ سے محبت کا اظہار کیا ہے اور اسی محبت کے فطری جذبہ کی تکمیل کے لیے اس نے عبادت گاہیں، کسی نے مسجد، کسی نے مندر کسی نے گرجا کی تعمیر کی ہے۔ اس میں صرف اہل اسلام نے محبت الٰہی کے صحیح مقام کو پایا اور باقی اقوام نے اصل مقام سے بھٹک کر محبت الٰہی کا غلط تصور اختیار کیا، لیکن محبت الٰہی صحیح ہو یا غلط دونوں صورتوں میں محبت الٰہی کے فطری ہونے کا ثبوت بہم پہنچاتی ہے۔ محبت کھری ہو یا کھوٹی پھر بھی اصل محبت کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا، بلکہ محبت الٰہی کی غلط قسم خود محبت کی صحیح قسم کے موجود ہونے کی دلیل ہے۔ اگر کسی جگہ کھوٹا روپیہ یا جعلی نوٹ استعمال ہو تو یہ اس امر کی دلیل ہے کہ اصلی نوٹ یا کھرا روپیہ بھی اپنی جگہ موجود ہے اور یہ جعلی اور کھوٹا سکہ اس کے خلاف ہے۔ باطل کی موجودگی حق کی موجودگی کا ثبوت ہے۔ ورنہ حق و باطل کی تقسیم ہی بیکار ہو جائے گی۔

جب یہ ثابت ہوا کہ جس طرح محبت کثیفہ جسمانی اعتبار سے فطری ہے اور ہر کوئی کھانے پینے اور جنسی میلان سے محبت رکھتا ہے تو اسی طرح روحانی حیثیت سے انسان کے لیے محبت الٰہی بھی فطری ہے اور جس طرح قدرت نے محبت کثیفہ مادیہ کے لیے سروسامان کا انتظام کیا ہے اور زمین پر کھانے پینے اور دیگر ضروریات کا دستر خوان قدرت نے انسان کے لیے بچھا دیا ہے اسی طرح محبتِ لطیفہ کے فطری تقاضا کی تکمیل کے لیے بھی قدرت نے انتظام کیا ہے کیونکہ یہ روحانی تقاضا جسمانی تقاضا سے اہم اور قیمتی ہے

محبت روحانیہ لطیفہ کی تکمیل

خداوند تعالیٰ کے ساتھ ہر انسان کو محبت ہے اگرچہ چند ایسے لادین اور دہریہ افراد بھی موجود ہوں کہ ان کو خدا سے محبت نہ ہو بلکہ سرے سے خدا سے انکار ہو، تو اس سے محبت الٰہی کے فطری ہونے پر اثر نہیں پڑتا، بلکہ ان کو روحانی مریض اور قلب و دماغ کا بگڑا ہوا شخص تصور کیا جائے گا۔ جیسے کہ بعض مریضوں کو بوجہ مرض کھانے کا شوق باقی نہیں رہتا، اور نہ طبیعت میں غذا کھانے کی طرف میلان ہوتا ہے تو اس سے یہ نہیں سمجھا جاتا کہ غذا فطری کی ضرورت

نہیں، بلکہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ مزاج بدنی اعتدال پر نہیں اور وہ مریض ہے۔ یہی حال روحانی مزاج کا ہے۔ جب وہ اپنے فطری تقاضا محبت الٰہی سے بیزار ہو جاتا ہے تو یہی سمجھا جائے گا کہ اس کا روحانی مزاج اعتدال سے ہٹا ہوا ہے اور اس کی روح اور قلب و دماغ مریض ہے۔

مرکزیت کعبہ کی ضرورت

محبت الٰہی میں چونکہ محب مکانی اور زمانی ہے اور محبوب حقیقی غیر زمانی و غیر مکانی ہے۔ اس کے علاوہ ماوراء تصور ہے لہٰذا دونوں میں کامل بُعد اور عدم تناسب ہے۔ اس لیے ضرورت ہوئی کہ شان تنزیہہ[1] اور کبریائی کو قائم رکھتے ہوئے مخلوقات باری میں کعبہ حقیقی (فضاء بیت اللہ) کو وہ اپنے انوار و تجلیات خاصہ کا مظہر بنائے، تاکہ مکان و زمان کی نقاب میں آ کر وہ انوار و تجلیات انسان کے تصور محبت کے لیے تسکین کا سامان ہوں اور ارتباط محبت کے استحکام کا ذریعہ بنیں۔ وہ مظہر تجلی تمام صنمی خصوصیات[2] سے مبرا ہو۔ اس مظہر تجلی الٰہی کے ساتھ جو محبانہ اور عاشقانہ عمل بطور عبادت وابستہ کیا جائے۔ مثلاً حج اس کے تمام اعمال و مناسک بھی ایسے ہوں کہ وہ واحد لاشریک ذات یعنی صاحب تجلی کے لیے ہوں، کعبہ اور تجلی گاہ کے لیے نہ ہوں، کیونکہ تجلی گاہ یعنی کعبہ خود مخلوق اور عبد ہے نہ کہ معبود۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے حجراسود کو جو کعبہ کا مقدس ترین حصہ ہے مخاطب کر کے مجمع عام میں فرمایا:۔ وَاللّٰہ انّکَ لحجَرٌ لاتَنفَعُ ولاتضرّ لولا رأیت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قبّلک ماقبلتک (بخدا میں جانتا ہوں کہ تو پتھر ہے۔ نہ فائدہ دے سکتا ہے، اور نہ نقصان اگر حضورؐ تجھ کو بوسہ دیتے تو میں تجھ کو ہرگز بوسہ دیتا) یعنی میرا عمل حضورؐ کے عمل کی پیروی ہے۔ اور حضور کا عمل اس لیے نہ تھا کہ خود حجرِ اسود محبوب ہے۔ بلکہ محبوبِ حقیقی کی محبت کی علامت ہے۔ یہی راز ہے کہ حج کے تمام

---

[1] اللہ کی پاکیزگی اور بڑھائی [2] بت پرستانہ صفات۔

اعمال میں جو مسلسل عمل ہے وہ تلبیہ ہے یعنی لبیک اللھم لبیک لبیک لاشریک لک لبیک ان الحمد و النعمتہ لک و الملک لاشریک لک[1] یہی وہ الفاظ ہیں جن کو بار بار حاجی دہراتا ہے۔ اور جن میں اللہ کی کبریائی کا اعلان ہے۔ تمام حجاج تلبیہ کہہ کر بار بار یہ اعلان کرتے ہیں کہ ساری طاعت، نعمت، حمد و اختیار صرف ذات رب العالمین کے لیے ہے۔ اور اس کا کوئی شریک نہیں۔

حج کے تمام اذکار میں الہٰی عظمت و توحید کا یہ ورد و تکرار جاری رہتا ہے۔ اور ان میں ایک لفظ بھی خانہ کعبہ یا حجر اسود یا حج سے متعلقہ مقامات کی مدح و تعریف کے لیے موجود نہیں تاکہ غیر اللہ کی پرستش کا ادنیٰ توہم بھی پیدا نہ ہو سکے۔

انسان کے ہر فطری جذبہ کے جداگانہ مقتضیات ہیں اور ان تقاضوں کی تکمیل کا تعلق ایک خاص دائرہ عمل سے وابستہ ہے۔ ایک ریاضی داں کے جذبہ حساب دانی کی تکمیل مشکل سوالات کے حل کر دینے سے ہوگی، موسیقی کے نغموں سے نہ ہوگی۔ لیکن جذبۂ موسیقیت کی تکمیل سوالات حساب کے حل سے نہ ہوگی، نغمہ سنجی اور ساز نوازی سے ہوگی۔ اسی طرح عشق الہٰی کے جذبہ کی تکمیل کے تقاضے خستہ حالی بے سروسامانی، ترک عیش و طرب، خود رفتگی اور محبوب حقیقی میں محویت کے عاشقانہ حرکات اور والہانہ اداؤں سے پورے ہوں گے۔ جس کو ناآشنایانِ کوچہ عشق و محبت جنون سے تعبیر کرتے ہیں۔

> ز رمز زندگی بیگانہ تر باد کسے کو عشق را گوید جنوں است

حج بیت اللہ کی دوسری حکمت، مرکزیت

ملتِ اسلامیہ کی حیاۃ دینی و دنیوی کے لیے افراد ملت کے ارتباط باہمی اور نظم و اتحاد کی اشد ضرورت ہے۔ عقائد و افکار و اعمال کی معنوی ربط اس وقت تک منضبط نہیں ہو سکتی، تاوقتیکہ اس

---

[1] حاضر ہوں اے اللہ حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں حاضر ہوں سب تعریف سارا احسان تیرا ہی ہے سلطنت تیری ہی ہے تیرا کوئی شریک نہیں۔

نامحسوس ربط و یگانگت کو محسوس قالب میں نہ ڈھالا جائے اور ان سب کو ایک جیسے اعمال و حرکات و طرز لباس کے ساتھ ساتھ ایک مرکزیت محسوسہ کے ساتھ وابستہ نہ کیا جائے تنظیم ملت ایک مرکز محسوس کا تقاضا کرتی ہے کہ افراد ملت کے لیے اس کے ساتھ خصوصی عقیدت اور شیفتگی ہو، اور اس کے ساتھ وابستگی کا ایک سالانہ بین الاقوامی مظاہرہ ہو تاکہ مرکز سے انضباط کا جذبہ کمزور نہ ہونے پائے اور مرکزی و حکومت کا جوش قلوب و اذہان میں تازہ اور زندہ رہے۔ جس کے لیے فریضۂ حج کے سالانہ اجتماع کی شکل میں انتظام کیا گیا، تاکہ مرکزیت ملی کی عظمت و عقیدت تازہ رہے۔ اس کے علاوہ اس جذبہ کی بقا و حیات کے لیے روزمرہ کے اسلامی معمولات میں بھی حکیمانہ قوانین نافذ کیے گئے، تاکہ تصور مرکزیت میں ضعف نہ آنے پائے۔

فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کے الٰہی قانون کے تحت حکم دیا گیا کہ پنجگانہ نمازوں بلکہ ہر نماز میں تمہارا رخ ملی مرکز کی طرف ہو، اور لَا تَسْتَقْبِلُوا الْقِبْلَةَ وَلَا تَسْتَدْبِرُوهَا میں مرکز ملی کے ادب و عظمت کے پیش نظر یہ حکم دیا گیا کہ قضائے حاجت کے وقت مرکز ملی کی طرف رخ اور پیٹھ نہ ہو تاکہ اس وقت بھی تم کو اس کا احترام و ادب ملحوظ رہے۔ یہاں تک کہ قبلہ کی طرف پاؤں پھیلانے اور تھوکنے تک کی بھی بندش کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے دین کا ہر عمل اور خشک سے خشک عبادت بھی سراپا سیاست ہے۔ جس کو مغربی قومیں خوب سمجھتی ہیں۔ اس لیے مستشرقین ایسی ہی چیزوں کو مورد اعتراض بناتے ہیں، تاکہ تنظیم ملت پارہ پارہ ہو۔

حج کی تیسری حکمت، مساوات

اسلام کا مقبول ترین اصول مساوات اسلامی ہے کہ کسی دین میں اس کی نظیر نہیں۔ مساوات ہی وحدت ملی کی سب سے بڑی قوت ہے، جس سے افراد ملت محبت باہمی کی کشش سے ایک دوسرے سے مربوط ہو سکتے ہیں اس کے برخلاف اگر افراد ملت کے امراء کو غرباء اور غرباء کو امراء سے نفرت ہو تو انضباط ملت کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔

اسلام نے نماز باجماعت، روزۂ رمضان، نماز عیدین، زکوٰۃ میں مساوات اسلامی کے

پہلوؤں کو مختلف شکلوں میں پیشِ نظر رکھا، لیکن فریضۂ حج میں مساوات اسلامی کو ایک مکمل شکل دیدی گئی ہے۔ تاکہ اس عمل سے ایک ایک فردِ ملت کے قلب و دماغ پر اسلامی برادری کی مساوات کا تصور پوری طرح جم جائے۔ ہر حج کرنے والا خواہ شاہ ہو یا گدا، امیر ہو یا غریب ایک جیسے لباس احرام میں ملبوس ہوا، اور سب کے سب جملہ تعیشاتِ زندگی سے یکسو ہو کر سادہ لباس میں ایک ہی جگہ بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہوں، تاکہ ایک خاص وقت تک اس مساویانہ طرزِ زندگی سے مساوات اسلامی کا نقش دل پر جم جائے اور امیر و غریب کے مصنوعی تفاوت کا حجاب اسلامی برادری کی راہ اتحاد میں حائل نہ ہونے پائے۔ معاشی تفاوت خالقِ کائنات کی تکوینی حکمت کے تحت اگرچہ ضروری ہے۔ کیونکہ معاشیات جن علمی و عملی قوتوں سے وابستہ ہیں خود فطرتاً وہ قوتیں تمام انسانوں میں یکساں نہیں تفاوت ہی اسی معاشی تفاوت نے ایک کو دوسرے کا محتاج بنادیا ہے۔ اور یہ احتیاج بھی فی الحقیقت یکطرفہ نہیں بلکہ دوطرفہ ہے۔ تاکہ حاجت مندی میں بھی مساوات رہے مثلاً ہم اگر درزی سے کپڑے سلواتے ہیں یا دھوبی سے دھلواتے ہیں تو درزی اور دھوبی رقم اجرت کے محتاج ہیں۔ لیکن ہم خود ان کے عمل کے محتاج ہیں اسی دوطرفہ احتیاج نے متفاوت افراد کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُم بَعْضًا سُخْرِيًّا جس سے معلوم ہوا کہ معاشی تفاوت بھی تنظیم کا سبب ہے۔ لیکن اس تفاوت سے دولت مند افراد میں جو خودسری، تکبر اور غرور پیدا ہوتا ہے، وہ تنظیم ملت کے لیے زہر قاتل ہے اس لیے اسلام کے عباداتی نظام میں بھی اس خرابی کو دور کرنے کا انتظام کیا گیا جس کی ایک شکل حج کا ایک مساویانہ طرزِ زندگی ہے۔

حج کی چوتھی حکمت۔ سفرِ آخرت کا نقشہ

انسان کے قلب و دماغ پر جس قدر آخرت کا تصور غالب ہو اسی قدر وہ نیکوکار پاکیزہ اطوار اور خدا ترس ہوتا۔ اور جس قدر تصورِ آخرت سے غفلت ہو، اسی قدر وہ فسق و فجور ظلم و ستم فتنہ و فساد سیاہکاریوں اور بدکاریوں میں ملوث ہوتا ہے۔ اس لیے فکر و عمل کی پاکیزگی کے لیے

آخرت اور یوم الحساب کا نقشہ ذہن میں جمانا ضروری ہو جاتا ہے۔ تاکہ اصلاح عمل و درستی کردار کا سامان ہو، اعمال حج میں سفر آخرت کی پوری تصویر ہے، سفر آخرت موت سے شروع ہوتا ہے جس میں آدمی وطن و اولاد اور اقارب سے جدا ہوتا ہے۔ حاجی جب گھر سے نکلتا ہے اور اولاد، وطن، احباب کو چھوڑتا ہے تو یہ موت کا نمونہ ہے۔ لباس احرام یعنی دو چادریں جن میں ملبوس ہو کر اعمالِ حج ادا کئے جاتے ہیں۔ یہ نمونۂ کفن ہے جس کو ہر وقت حاجی دیکھ کر کفن کی یاد تازہ کر سکتا ہے۔ حاجی کی سواری جس پر بیٹھ کر وہ سفرِ حج کرتا ہے اس کو اپنا مآل و انجام یاد دلاتی ہے، کہ کسی دن دوسرے کے کندھوں پر اس طرح تمہارا جنازہ سوار ہو کر اسی طرح عازمِ سفرِ آخرت ہوگا۔ عرفات اور مزدلفہ کے میدان میں حاجیوں کا اجتماع میدانِ حشر کے اجتماع کی یاد دلاتا ہے، اسی طرح قدم قدم پر حاجی کے لیے سفرِ آخرت کا کوئی نہ کوئی نمونہ موجود ہے۔ جس کو دیکھ کر دل و دماغ کو فکرِ آخرت سے معمور کیا جاتا ہے اور یہی فکرِ آخرت تمام نیک اعمال کی کنجی ہے۔

پانچویں حکمت ماحول کی تبدیلی

انسان اپنے ماحول کی پیداوار ہے وہ جس طرح کے ماحول میں پرورش پاتا ہے، اسی طرح بن جاتا ہے۔ علم النفسیات کا یہ ایک مسلم مسئلہ ہے کہ انسان میں نقالی اور محاکات کا جذبہ موجود ہے وہ اپنی زندگی کے طور و طریقے اور فعل و عمل کا ہر گوشہ اپنے ماحول کے مطابق بناتا رہتا ہے اور جو کچھ وہ اپنے گرد و پیش دیکھتا ہے اسی کے موافق اپنی زندگی کا نقشہ بناتا ہے، اس لیے اصلاحِ زندگی کے لیے ایک وقت ایسا چاہیئے کہ انسان کو فاسد اور بگڑے ہوئے ماحول سے اٹھا کر نیک اور صالح ماحول میں ڈال دیا جائے تاکہ اس صالح ماحول کے نقوش اس کے لوحِ حیات پر کندہ ہو کر اس کی زندگی کو بدل دیں۔ آغازِ حج سے واپسی حج تک ایک ایسا ماحول ہے جو انسانی زندگی کا نقشہ بدل دیتا ہے۔ اور اس تبدیلی احوال کا نام حج مبرور ہے۔ یعنی مقبول حج کی علامت یہ ہے، کہ حاجی کی بعد از حج زندگی قبل از حج زندگی سے بہتر ہو، معلوم

ہوا کہ حج کو تبدیل ماحول کی وجہ سے اصلاح معاشرہ میں بڑا دخل ہے۔

چھٹی حکمت جذبۂ سیاحت کی اصلاح

انسان کی فطرت میں سیاحت کا جذبہ موجود ہے جس کو روکنا خلاف فطرت ہے اس لیے اسلام نے اس کو روکا نہیں بلکہ ابھارنے کی ترغیب دی ہے اور قرآن نے فسیحوا فی الارض کا اعلان فرما کر اس جذبہ کی حوصلہ افزائی کی سیاحت کے ذریعہ مختلف ممالک کی گشت لگا کر جس طرح نیک اثار و اطوار اپنی ذات اور واپسی پر اپنے ملک کے افراد میں منتقل کئے جا سکتے ہیں، اسی طرح بد آثار بھی اسلام نے اس فطری جذبہ کے اصلاحی پہلو کو اختیار کیا، کہ علم و جہاد کے علاوہ سیاحت کو حج کی صورت میں متشکل کیا تاکہ حاجی مقبول اور برگزیدہ انسانوں کی جماعت میں شامل ہو کر مقبولان بارگاہ الہی کے ان آثار قدیمہ اور شعائر اللہ کے مشاہدے سے بہرہ اندوز ہو جس کی وجہ سے ان کے فکر و عمل کو صلاح و تقویٰ کی طرف موڑ دیا جا سکے اور ان کے نمونہ زندگی سے ملک میں صالح معاشرہ کی تشکیل ہو سکے۔

ساتویں حکمت۔ جذبۂ جہاد کی نشوونما

دنیا کارزار عمل اور میدان کش مکش حیات ہے جو قوم اس جہان وزم و پیکار میں جس قدر زیادہ روح جہاد رکھتی ہو اور زیادہ سے زیادہ سامان جہاد سے آراستہ ہو وہ سربلند کامیاب اور باعزت قوم ہوگی، اور اس سروسامان سے اگر محروم ہو تو وہ حیوانات کی طرح محکوم و غلام بن کر غیر اقوام کے منشاء کی تکمیل اور ان کی خوش عیشوں کے لیے آلہ کار ہو کر زندگی گذارتی ہے گی اور شرف انسانی کی بلندی سے گر کر قعر غلامی میں گرے گی، یہی وجہ ہے کہ اسلام نے زیادہ زور جہاد پر دیا، اور وہ "ذروۃ سنام الجہاد" کہہ کر اس کو ملت اسلامیہ کی عزت اور سربلندی کا واحد ذریعہ قرار دیا ہے۔ قرآن نے شہید کی موت کو موت کہہ دینے سے منع کیا ہے بلکہ اس کی ظاہری موت کو ایک عظیم الشان حیات کا ذریعہ قرار دیا ایسی حیات جس کی خوشحالیوں کا تصور انسانی شعور کے دائرہ سے خارج ہے، حدیث نبوی نے اعلان کیا کہ

شہید کو نہ موت کی تکلیف ہو گی اور نہ قبر کا عذاب۔ جہاد کے لیے چونکہ ظاہری سامان حرب و ضرب بھی ضروری ہے۔ جس کی فراہمی کو اس لیے قرآن نے مسلمانوں پر سامانِ جنگ اور آلات حرب کی تیاری کو فرض قرار دیا ہے۔ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ" یعنی جس قدر تمہارا بس چلے تو اسی قدر سامانِ جنگ مہیا کرو اتنا سامان کہ اگر غیر مسلم اقوام تمہارے خلاف متعدد محاذ بھی بنالیں تو وہ تمہارے سامان جنگ کی تیاری کو دیکھ کر مرعوب ہوں اور مقابلہ کا حوصلہ نہ کر سکیں۔
تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ لیکن ظاہری سامان کے علاوہ جہاد کے لیے باطنی روحانی اور اخلاقی سازو سامان کی بھی ضرورت ہے۔ آلات جنگ کا استعمال انسانی جسم کرتا ہے اور جسم و بدن کی جنگی اعمال کا اصل محرک روح ہے۔ روح اگر طاقتور ہو تو کم سامان سے بھی بہت کام لیا جا سکتا ہے۔ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ "یعنی چھوٹا گروہ بڑے گروہ پر غالب آ سکتا ہے۔ اور اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں نے روح کی بلندی اور ایمانی طاقت سے اپنے دس گنا بلکہ سو گنا طاقت کو شکست دی ہے۔ یہی روحانی و ایمانی طاقت ہے جس کی نشوونما مسلمانوں کے لیے فتح و کامیابی کی کنجی ہے۔ اور صرف اسی قوت کے ذریعہ مسلمانوں کو اپنے دشمن پر غلبہ حاصل ہو سکتا ہے۔ اس لیے اس متاع عزیز کی حفاظت بیحد ضروری ہے۔ حج بیت اللہ میں اسی ایمانی اور اخلاقی قوت کی نشوونما اور بالیدگی کا پورا سامان موجود ہے بشرطیکہ حاجی ان تصورات کے تحت اعمالِ حج کو انجام دے۔

حج اور جہاد

جہاد میں اکثر بری و بحری تکلیفوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے راحت و آرام و سامان عیش کو قربان کرنا پڑتا ہے محبوب حقیقی کی رضا جوئی کے واحد مقصد کیطرف متوجہ ہونا پڑتا ہے۔ ان تمام چیزوں کی مشق کا سامان حج میں موجود ہے۔ رمی جمار یعنی سنگریزوں کے مارنے میں دشمن ملت سے

نفرت و عداوت کا مظاہرہ ہے جس سے دشمن کے ساتھ مقابلہ کرنے کی قوت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور آخری بات جو دم تمتع و قرآن کی شکل میں قربانی ہے۔ اس میں خلیل علیہ السلام کا نمونہ موجود ہے، جس کے ساتھ ملت اسلامیہ کی وابستگی ہے مِلَّةَ اَبِيكُمْ اِبْرَاهِيمَ جس سے حاجی کے دل و دماغ میں یہ تصور جم جاتا ہے کہ جب اللہ کا ایک عظیم پیغمبر خدا کے حکم کی تعمیل میں جو اس کو خواب میں دیا گیا تھا، نہ بیداری میں اپنے عظیم فرزند کی قربانی کے لیے تیار ہوا تھا۔ جو تکمیل امتحان کے بعد حیوانی قربانی میں تبدیل ہوا لیکن قربانی خلیل علیہ السلام کا یہ عمل خدا کو ایسا پسند آیا کہ تاقیامت اس کو ملتِ اسلامیہ کے لیے باقی رکھا۔ کہ وہ اس سے درس قربانی حاصل کرے اور اگر جہاد میں خالقِ کائنات انسانی قربانی کا حکم دے تو بے دریغ جان قربان کر دینے کے لیے آمادہ ہو سکے۔

بملک، جم ندہم مصرعہ نظیری را
کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلہ ما نیست

در حقیقت اس موت میں حیات جاودانی کا سامان مضمر ہے۔

جو دیکھی ہسٹری اس بات پر کامل یقین آیا
جسے مرنا نہیں آیا اسے جینا نہیں آیا

ان سطور بالا سے مستشرقین کی ہرزہ گوئی کی حقیقت واضح ہو گئی جو وہ حج کے خلاف کرتے ہیں۔ اس مقام پر پہنچ کر یہ حقیقت بے نقاب ہوئی کہ علم و مذہب کی جتنی نزاع ہے۔ فی الحقیقت علم اور مذہب کی نہیں مدعیان علم کی خام کاریوں اور مدعیان مذہب کی ظاہر پرستیوں کی ہے۔ حقیقی علم اور حقیقی مذہب اگرچہ الگ الگ راستوں سے چلتے ہیں مگر بالآخر ایک ہی منزل پر پہنچ جاتے ہیں علم محسوسات

سے سروکار رکھتا ہے۔ مذہب ماوراء محسوسات کی خبر دیتا ہے۔ دونوں میں دائروں کا تعدد ہوا مگر تعارض نہ ہوا، جو کچھ محسوسات سے ماورار ہیں ہم اسے محسوسات سے معارض سمجھ لیتے ہیں اور یہاں سے ہماری فکر کج اندیش کی ساری درماندگیاں شروع ہو جاتی ہیں ورنہ حقیقی مذہب اور صحیح علم میں کبھی تعارض نہیں ہوتا۔

(حصہ د)

"خلائی کارنامے اور اسلام"

سوال:۔

جناب عالی! ماہنامہ الحق مئی ۱۹۶۶ء میں جناب والا کا مختصر مگر جامع مضمون "روس اور امریکہ کے خلائی کارنامے اور اسلامی تعلیمات" کے عنوان سے دیکھ کر بے انتہا خوشی حاصل ہوئی۔ جدید تعلیم یافتہ اور سائنس سے متاثرہ اذہان کے لیے اکسیر اور اس طبقہ کے لیے جو خلائی کارناموں کی وجہ سے اسلامی تعلیمات کے متعلق شکوک و شبہات رکھتا ہو تسلی بخش جواب ہے۔

محترمی! جناب والا نے ستاروں کا معلق بین السماء والارض والی روایت بحوالہ علامہ آلوسیؒ ابن عباسؓ کی طرف منسوب کی ہے۔ لیکن علامہ نسفیؒ مدارک التنزیل ج ۳ ص۶۵ میں آیت كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ کے ماتحت لکھتے ہیں۔ عن ابن عباسؓ الفلک السماء والجمهور على ان الفلک موج مكفوف تحت السماء تجري فيه الشمس والقمر والنجوم۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ موج مکفوف والی تفسیر ابن عباسؓ کی نہیں ہے۔ نیز صاحب تفسیر مظہری ج ۶ ص۱۷۶ میں آیت بالا کے تحت مختلف اقوال نقل کرتے ہوئے آخر میں فرماتے ہیں۔ وقال الآخرون الفلک موج مكفوف دون السماء تجري فيه الشمس والقمر والنجوم قلت والصحيح ان المراد بالفلک السماء گویا بیہقی العصر حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب پانی پتی بھی موج مکفوف والی توجیہ کو صحیح نہیں مانتے۔ اس کے علاوہ شیخ عبدالرحمن اپنی تالیف کتاب قرۃ عیون الموحدین فی تحقیق دعوت الانبیاء والمرسلین میں فرماتے ہیں۔

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ الآية وفيه اشارة الى ان النجوم فى السماء الدنيا كما روى ابن مردويه عن ابن مسعودؓ قال قال رسول الله صلى الله وسلم۔ اما السماء الدنيا فان الله خلقها من دخان

وجعل فیہا سراجا و قمرا منیرا و زینہا بمصابیح وجعلنا رجوما للشیاطین و حفظا من کل شیطان الرجیم۔ نیز اگر سماء الدنیا سے بھی موج مکفوف مراد لیا جائے تو معراج والی حدیث جس کو متعدد صحابہؓ نے روایت کیا ہے۔ اور جس کو امام بخاری نے اپنی صحیح جلد نمبر ا صفحہ ۵۴۸ میں بروایت مالک بن صعصعہ ان الفاظ سے نقل کیا ہے۔ فانطلقت مع جبریل حتی اتینا السماء الدنیا الخ اور پھر اسی سماء الدنیا میں حضرت آدم کے ساتھ ملاقات ہونے سے کیا مراد لیا جائے گا۔ جناب والا کی مصروفیات حد سے بڑھی ہوئی ہیں۔ مگر یقین ہے کہ اس بارہ میں تشفی فرمادیں گے۔"

الجواب مختصراً

حامداً و مصلیاً

ابن عباسؓ کی روایت موج مکفوف جو روح المعانی میں ہے۔ وہ مفسرے اور مدارک نسفی کی روایت مجمل ہے۔ کیونکہ کل ما علاک فہو سماؔ اور فلیمدد بسبب الی السماء ای السقف باتفاق المفسرین آسمان اور موج دونوں کو شامل ہے اس کے علاوہ نسفی نے اس روایت کی سند بھی نہیں لکھی۔ اسی طرح ابن مردویہ کی روایت ابن مسعودؓ بھی ضعیف ہے۔ ابن مردویہ کی سند کتب ضعیفہ میں سے ہے۔ جس میں رطب و یابس دونوں ہیں۔ دیکھو حجۃ اللہ البالغہ بحث طبقات کتب الحدیث۔ اس کے علاوہ زینا السماء الدنیا بمصابیح - کی طرح اس کی تاویل ہو سکتی ہے۔ جیسے آلوسیؒ نے روح المعانی میں کی ہے۔ مظہری نے بتبع العلم الہیئۃ لکھا ہے۔ کتاب و سنت کی دلیل پیش نہیں کی ایسی روایات کو آلوسی نے ج ۱ صفحہ ۱۵ میں لایعول علیہا لکھا ہے تعارض عقل و نقل کے قواعد مسلمہ کی رو سے مشاہدہ قطعیہ کے مقابلہ میں ضعیف روایت تو کیا صحیح روایت کی تاویل بھی لازمی ہے ہے۔ إنّ العقل الصحیح والنقل الصحیح لا یتعارضان اذ لا تعارض بین الصادقین

معراج والی بات عجائبات میں سے ہے۔ حضورؐ کا معراج میں حضرت آدمؑ سے سماء الدنیا میں ملاقات کرنے سے یہ امر کس طرح ثابت ہوتا ہے کہ ستارے آسمانوں میں ہیں۔ بلکہ آسمانوں میں ستاروں کے متعلق آلوسی نے دمن الارض مثلھن کے تحت لکھا ہے۔ ولم لیقم علیہا دلیل - بلکہ جملہ احادیث معراج ستاروں کا آسمانوں میں نہ ہونے پر دال ہیں۔ وہ اس سفر میں کم از کم ستاروں پر مرور کا تذکرہ ہوتا جیسے دیگر اشیاء کا ہوا ہے۔ مثلاً جنت سدرۃ المنتہیٰ اور انبیاء علیہم السلام

فقط والسلام

شمس الحق افغانی بہاول پور

۱۷ ارشی ۱۹۶۶ء

سلسلہ مکتوبات شریفہ اکابرین ملت

احباب کرام اور خصوصی متعلقین بزرگان دین سے مودبانہ التماس

۱. مکتوبات حضرت شیخ التفسیرؒ: قطب العالم شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری قدس سرہ کی مفصل زیر ترتیب سوانح حیات کی پہلی جلد ان کے عجیب و غریب مکتوبات مبارکہ پر مشتمل ہے جسے ان کے جانشین حضرت مولانا عبید اللہ انور دامت برکاتہم نے دسمبر ۱۹۸۲ء کے دورہ نوشہرہ میں چند گھنٹے میں کر بہت پسند فرمایا اور گرانقدر حواشی و تفصیلات قلمبند کروائیں۔ یہ روحانی و علمی شاہکار کتابت کے مراحل میں ہے۔

۲. مکتوبات حضرت علامہ افغانیؒ: محقق دوراں حضرت علامہ شمس الحق افغانیؒ کے تحقیقی علمی روحانی مکتوبات گرامی کافی تعداد میں جمع و مرتب ہو چکے ہیں۔ جو ان کے صاحبزادہ محترم جناب محمد داؤد جان صاحب کے مشورہ سے قریب التکمیل ہیں۔

۳. مکتوبات حضرت ہزارویؒ: مجاہد ملت ولی کامل حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ کے عجیب مجاہدانہ مبارک خطوط و اہم مضامین ان کے خدام خاص حضرت مولانا عزیز الرحمن ہزاروی اور حضرت حکیم مسعود الرحمن صاحب کے مشورہ سے مرتب کئے جا رہے ہیں۔

۴. مکتوبات حضرت پسروریؒ: حضرت لاہوریؒ کے خلیفہ اجل مجسمۂ علم و عمل حضرت مولانا مفتی بشیر احمد پسروریؒ کے علمی و روحانی مکتوبات گرامی ان کے جانشین حضرت مولانا رشید احمد صاحب کے مشورہ سے جمع کئے جا رہے ہیں بندہ کے نام بہت سے خطوط تو مرتب ہو چکے ہیں۔

خصوصی درخواست والتماس

ان بزرگوں کے عقیدتمند، خلفائے کرام اور منتسبین و شاگردوں سے مودبانہ درخواست ہے کہ جن حضرات کے پاس ان میں سے کسی بزرگ کا کوئی تحریر، خط یا عطا فرمودہ کوئی وظیفہ، دعا وغیرہ موجود ہو وہ مہربانی فرماتے ہوئے اسے ایک امانت سمجھ کر آئندہ نسلوں تک محفوظ کرنے کیلئے دست تعاون بڑھائیں اور فوری طور پر ان مبارک کاغذات و مکتوبات کے فوٹو سٹیٹ کاپی بندہ کے نام رجسٹری سے روانہ فرما دیں کیونکہ یہ کتب ترتیب کے آخری مراحل میں ہیں اور ان شاء اللہ بہت جلد شائع ہو سکیں گی۔ اس سلسلہ میں تمام حضرات سے خصوصی دعاؤں کی بھی درخواست ہے

پتہ: مرتب مکتوبات اکابرین، احمد عبد الرحمن الصدیقی، امام و مہتمم مکتبہ حکمت اسلامیہ ۳/۱۶۶ نزد عیدگاہ نوشہرہ صدر ضلع پشاور